یوم آزادی

وزیر اعظم نے 79 ویں یوم آزادی کے موقع پر سبھی کو مبارکباد دی

وزیر اعظم جناب نریندر مودی نے آج 79 ویں یوم آزادی کے موقع پر لوگوں کو مبارکباد دی۔

آپ سب کو یوم آزادی کی دل کی گہرائیوں سے مبارکباد۔ میری خواہش ہے کہ یہ مبارک موقع تمام ہم وطنوں کی زندگیوں میں نیا جوش اور نیا ولولہ لائے تاکہ ترقی یافتہ ہندوستان کی تشکیل کو نئی رفتار ملے۔ جے ہند!"

سب کو یوم آزادی کی بہت بہت مبارکباد۔ دعا ہے کہ یہ دن ہمیں اپنے مجاہدین آزادی کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنے اور وکست بھارت کی تعمیر کے لیے مزید محنت کرتے رہنے کی ترغیب دے۔ جے ہند!"

ش ح - ظا

UR No.4742

سبق اردو

جلد: ۱۰، شمارہ :8 | website: sabaqeurdu.com | اگست ۲۰۲۵

E-mail: sabaqeurdu@gmail.com

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: محمد سلیم

سرنامۂ سرورق : عادل منصوری

Net Banking:SABAQ -E-URDU(MONTHLY)

موبائل: 9696486386,9919142411

سرورق : دانش الہ آبادی

IFSC BARB 0 GOPI BS

A/C28240200000214

فی شمارہ:۲۰۰(دوسو روپئے)

زرتعاون:۱۰۰۰ (ایک ہزار روپئے)

Bank of Baroda, Branch: Gopiganj

مطبع: عظیم انڈیا پرنٹنگ پریس، سنت روی داس نگر، بھدوہی زرسالانہ:۲۴۰۰ (چوبیس سو روپئے

Gopiganj-221303,Dist.Bhadohi,UP,INDIA

کسی بھی تحریر سے ادارہ کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔ کسی بھی معاملے کی سنوائی صرف ضلع س۔ ر۔ ن۔ (بھدوہی) ہی کی عدالت میں ہوگی۔ ادارہ

دانش الہ آبادی

چیف ایڈیٹر

وزیر اعظم	یوم آزادی	1
شہناز صبیح۔ (مجیب قدوائی)	ایک دلچسپ سفر (اکبرالہ آبادی کے نام)	4
ڈاکٹر نیلوفر حفیظ	شیخ اعظم حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی کی حیات وخدمات	7
سونور جک	21ویں صدی کی تعلیمی ترقی میں پسماندہ طبقات کی موجودہ صورتحال: ایک جائزہ	12
ڈاکٹر نسیم احمد	نشانیات: معنی ومفہوم	17
حفصہ بیگ	حالی کی نظم "''مناجات بیوہ'' کا تنقیدی وفکری جائزہ	22
ڈاکٹر اسمٰی کوثر	قرۃ العین حیدر (اردو ادب کی ورجینا وولف)	27
معراج بیگم، نگراں: ڈاکٹر ثمینہ بسو	اردو میڈیم طلبہ اور ڈیجیٹل تعلیم: درپیش مشکلات اور ممکنہ حل	31
ڈاکٹر عابدہ تبسم	عبدالقادر سروری کا ناقدانہ شعور	36

3

فرح ناز	مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی نظریات	38
محمد مظہر سراج، نگراں: ڈاکٹر محمد بدرالدین انصاری	اردو ڈرامے کا فنی جائزہ	41
شازیہ بینش	غالب کی شاعری اور موجودہ صورتحال	43
تحسین زاہد	علقمہ شبلی کی نظمیہ شاعری	45
ڈاکٹر شفیع الرحمٰن	ابونصر غزالی کی شخصیت میری نظر میں	48
ڈاکٹر عاشق حسین میر	شیخ العالمؒ اور ماحولیاتی تحفُظ	51
ڈاکٹر غزالہ فردوسی	محمود الٰہی کی شخصیت وخدمات: ایک جائزہ	53
مظہر علی، مظہرؔ رام پوری	روہیل کھنڈ میں اردو غزل کا ارتقاء	55
ڈاکٹر ترانہ یزدانی	نوم چامسکی کا فطری نظریہ(Nativist Theory)اور اردو زبان کی تدریس	59
شگفتہ خانم	کشور ناہید کی ترجمہ نگاری: عورت ایک نفسیاتی مطالعہ کے حوالے سے	62
تیمور احمد خان	شاعری میں زبان کے تخلیقی استعمال کی ضرورت	67
ڈاکٹر عرشی خاتون	تحقیق کا معلّم اوّل حافظ محمود خاں شیرانی	70
یونس نداف	کرناٹک میں اردو انشائیہ نگاری	74
شاہین بی	اردو فقط اردو نہیں تہذیب ہے میری	76
تمنا نسیم	سالک لکھنوی کی طنز ومزاح نگاری	78
1۔ڈاکٹر ترانہ یزدانی 2۔احمد حسین	قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تحت تعلیم: محب وطن اور بااخلاق شہریوں کی تیاری	80
مطہر احمد لوہار	مصر میں بچوں کے ادب میں کامل کیلانی کی خدمات	85
فرمان حسین سیف خاں	توضیح فنون ادب اور ڈاکٹر صابر سنبھلی	87
ہلال احمد کمہار	ڈپٹی نذیر احمد اور تانیثیت	92
محمد نفیس خاں	اودھ کا درخشندہ ستارہ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد	95

4

ایک دلچسپ سفر

(اکبرالہٰ آبادی کے نام)

شہناز صبیح۔(مجیب قدوائی)

سابق ایسوسیٹ پروفیسر

الہٰ آباد ڈگری کالج، الہٰ آباد

ہندوستان سے امریکہ کا سفر (ہوائی) تقریباً بائیس گھنٹے کا ہوتا ہے۔گھبراہٹ ہوتی ہے کہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے کیسے گزرے گا۔وقفہ بھی ہوتا ہے لیکن وہ ایک بورڈنگ گیٹ سے دوسرے تک جانے اور ذرا سانس لینے کی مدت معلوم ہوتی ہے۔کبھی کبھی خوش قسمتی سے کوئی اچھا ہم سفر مل جائے تو دوسری بات ہے۔اس مرتبہ بھی دعائیں کر رہی تھی کہ کوئی ہم ذوق ساتھی مل جائے اور کسی دلچسپ موضوع پر گفتگو شروع ہو کر طویل صورت اختیار کر لے۔اتفاق سے ایک خوبصورت دوشیزہ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی تو میں نے سکون کا سانس لیا کہ کوئی چنگم چباتا ہوا نوجوان نہیں بیٹھا۔ابتدائی ضروری ہدایات پر عمل کرنے کے بعد جب پرواز اونچی ہو کر نارمل ہو گئی۔سیٹ بیلٹ کھول کر سکون ملا۔عموماً میں ہی ہم سفر سے تعارف کی ابتدا کرتی ہوں کیونکہ آج کل کسی کو کسی سے بات کرنے کی عادت کہاں؟ کسی نے کوئی فلم دیکھنا شروع کر دیا تو کوئی کسی ضخیم ناول میں کھو گیا۔مجھے نئے لوگوں سے ان کے ملک۔معاشرت اور ہابیز

جاننے میں لطف آتا ہے۔اس نے اپنا نام صوؔفیہ بتایا کہ کراچی سے ہے اور واشنگٹن یونیورسٹی میں میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔اپنی شادی میں شرکت کرنے کے لئے وطن آئی تھی اب واپس جا رہی ہے۔اس کا شوہر کناڈا میں آرتھوپیڈ سرجن ہے۔میں نے مبارکباد دے کر خوشی کا اظہار کیا اور بتایا کہ میں یو۔پی۔کے شہر الہ باد سے ہوں۔تدریسی مشاغل سے فارغ ہو کر اپنی بیٹیوں کے پاس واشنگٹن جا رہی ہوں۔اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا میرے ابو کے دادا جان بھی انڈیا میں الہ باد سے تھے۔آزادی کی طویل تحریکوں میں ملوث رہے۔اس زمانے کی بہت سی دلچسپ باتیں ابو ان کی زبانی سن کر ہمیں دلچسپ انداز میں سنایا کرتے تھے۔اس وقت ہر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے شاعر ہوں یا استاد یا کسی آفس میں کام کرنے والے سب کو ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کا جنون تھا۔وہ ہر قربانی دینے کو تیار تھے۔میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ' بیٹی کیا نتیجہ نکلا ان سب جدو جہد اور قربانیوں کا؟ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

' آنٹی پہلے عوام و خواص کو معلوم کہاں تھا کہ یہ خون خرابہ ہوگا اور آزادی کے متوالوں کا قیمتی گرم خون اس طرح رائگاں جائے گا۔۔۔' ہاں بیٹی! کرسی کی ہوس میں عوام پس جائے گا، اُجڑ جائے گا، پچھڑ جائیگا یہ کس نے سوچا تھا۔آئی گئی تو ہمیشہ عوام پر ہوتی ہے نا؟ طاقت بھی وہی ہوتے ہیں، مٹھی بر حاکم بھلا عوام کی طاقت کے بغیر کچھ کر سکے ہیں؟ نہیں آنٹی۔عوام بھی تو بس جوش میں ہوش کھو بیٹھتے ہیں۔برباد ہو جاتے ہیں۔دیکھئے نا دونوں ممالک بس ایک دوسرے کے نشانے پر رہتے ہیں' ہاں جی! رہی سہی کسر کشمیر کا فلیتہ جو لگا کر گئے، آج تک سلگ رہا ہے۔۔۔' مجھے لگتا ہے یہ سلجھنے والا نہیں، کوئی سلجھانا چاہے جب نا، جو مزہ لڑنے میں ہے وہ ملنے میں کہاں، اور صفت یہ دیکھیں کہ عوام سب مل جل کر ہنسی، خوشی رہنا چاہتے ہیں لیکن عہدوں کے شیدائی ہڈی ڈال کر کتوں کی لڑائی کا مزہ لیتے ہیں اور وہ جو بارود میں چنگاری ڈال گئے مزے سے یہاں کی خبریں چائے، کافی اور سگار کے دھنوئیں میں مرغولے بنا بنا کر اڑا دیتے ہیں۔غلطی عوام کی ہے نا۔جب مل کر جنگ لڑی، آزاد کرایا تو کاہے کو الگ الگ ملک بنا کر رہیں؟ سوچنے کی بات ہے۔ارے بٹیا اتنی سمجھ ہوتی تو یہ دن کیوں ہوتے۔۔۔' ہوں ایک لمبی ہنکاری بھرتے ہی چائے کافی کی خوشبو نے بدمزگی ختم کر دی۔وہ منھ بنا کر بولی : پہلے پلین میں کتنی خاطر ہوتی تھی اب تو بس چائے کافی اور ایک سوکھی سی کوکیز پکڑا کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ہاں جی۔اور کرایہ دیکھو، بڑھتا ہی جاتا ہے۔ارے ہاں آئے دن تکنیکی خرابی کی وجہ سے جان لیوا حادثے بھی کرائے کی طرح بڑھتے رہتے ہیں۔' ہاں جی میں تو وصیت کر کے سب سے معافی، تلافی کر کے نکلتی ہوں پتہ نہیں ملوں کہ حشر میں سامنا ہو۔۔۔' اللہ توبہ آنٹی یوں تو نہ کہیں۔ابھی مہینہ بھر پہلے تو شادی ہوئی ہے۔۔۔' ارے نہیں بچی، اللہ تم کو شاد و آباد رکھے

میں اپنی بات کر رہی تھی۔اوہ آنٹی باتوں نے رخ ہی کون سا اختیار کر لیا۔میں تو انڈیا خاص کر الہ باد کی باتیں آپ سے کرنا چاہتی تھی۔میرے دادا ابو وہاں کے ایک شاعر جو ان کے اچھے دوست بھی تھے، ان کے مزے دار اشعار سناتے تھے۔۔۔اچھا آپ کو ادب سے دلچسپی بھی ہے؟ کچھ خاص نہیں کیونکہ میری سمجھ میں کم آتی ہے۔سائنس والوں کو ذوق ہوتے ہوئے بھی وقت نہیں ملتا۔' ہوں! ویسے کن شاعروں کو پڑھنے کی فرصت ملی ڈاکٹر صاحبہ کو؟ ہمارے گھر کے کتب کانے میں تو بہت سے مشہور شعرا کے دیوان رکھے ہیں۔میں نے بھی میرؔ، غالب، اقبالؔ وغیرہ کو پڑھنے کی کوشش کی مگر سب اوپر سے نکل گئے۔کچھ فیضؔ، جوش؟ اور جدید شاعرات میں پروین شاکرؔ سمجھ میں آئیں لیکن میں ذرا لائٹ اور آسان سی شاعری پڑھنا چاہتی ہوں۔۔۔ہوں میرے دادا ابو کے دوست بھی ہنسنے والی شاعری کرتے تھے نصیحت آموز ہوتی تھی۔بھلا سا نام ہے ان کا۔۔۔آں ہاں یاد آیا یاد آیا وہ مغل اعظمؔ والے شہزادہ سلیمؔ کے ابا حضور ! اوہ ہو اکبرؔ الہ بادی تھا ان کا نام۔ارے آپ تو الہ باد کی ہیں۔اچھی طرح جانتی ہوں گی۔' کیوں نہیں! عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاہی میں۔

بی بی میں نے ۴۲ برس اردو ادب کی تدریس کی ہے۔بی۔اے اور ایم۔اے کی طالبات کو پڑھایا ہے۔اکبرؔ الہ بادی کی غزلیں اور نظمیں بھی پڑھائی ہیں۔' ارے واہ آنٹی پتہ نہیں کس کا منھ دیکھ کر اٹھی تھی کہ آپ میری ہمسفر ہیں۔واہ۔تین پشتیں ہمارے گھر کی اکبرالہ بادی کا ذکر کرتی رہیں اور مجھے کبھی تفصیل سے ان کے متعلق معلومات کا موقع ملا۔مجھے بھی خوشی ہے کہ ادب میں دلچسپی رکھنے والی کسی لڑکی سے گفتگو کا موقع ملا۔اب آپ ان کی چند مشہور زمانہ شاعری کے متعلق مجھے بتائیں۔بات یہ ہے صوفیہؔ کہ ہمارے یہ شاعر ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو دنیا میں تشریف لائے۔یعنی کہ ہنگام غدر سے دس برس قبل اور جب ہوش سنبھالا ہوگا تو ملک میں انگریزوں کی غلامی کا ماحول اور آزادی کی کشاکش، طرح طرح کی تحریکوں کا زور و شور برپا ہوگا۔انھوں نے وکالت پڑھی۔جدید تعلیم کی اہمیت اور فائدے ان پر ظاہر ہو چکے تھے۔وہ انگریزی حکومت میں بھی سیشن جج تھے۔اس لئے حکومت کی خامیوں اور ظلم و نا انصافیوں کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے لیکن اپنی نوکری کی وجہ سے دل پر جبر کئے رہتے تھے۔اسی لئے وہ اپنے غم و غصہ کو مزاح کے انداز میں شاعری کے ذریعہ پیش کرتے تھے۔اچھا

ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

آنٹی آپ کے گھر میں کسی نے ان کو دیکھا تھا؟ ’نہیں صوفی ہماری ایک ملاقاتی ہیں ،وہ ان کے پرنانا ہوتے تھے۔ ہاں ان کی کوٹھی ” عشرت منزل کے“ نام سنوئیں منڈی محلہ میں ہے۔ میں کچھ دن اسی کے عقب میں راتی منڈی محلّہ میں رہتی تھی تو آتے جاتے دیکھا لیکن اب تو خستہ حال ہے۔ان کے بیٹے کا نام عشرتؔ ہے، ان کے نام پر ہے۔بس یہ کہہ سکتی ہوں کہ ” آثار کہہ رہے ہیں عمارت بلند تھی!

آنٹی کیا میں آپ کو خالہ جان کہہ سکتی ہوں؟ آنٹی میں غیریت۔۔۔جی میں بھی بس برداشت کر رہی تھی کسی طرح کہ ڈاکٹر صاحبہ انگریزی میڈیم سے پڑھ کر ڈاکٹر بنی ہیں۔۔۔’ارے نہیں! میں آپ کو اچھی خالہ کہوں گی آپ کا موبائل نمبر بھی محفوظ کروں گی ،رابطہ میں رہنے کی کوشش کروں گی۔ ہاں صوفیہ اکبرالہ بادی کا انتقال ۹۔ستمبر ۱۹۲۱ء کو ہوگیا تھا گویا آزادی کی تحریک کے عین عالم شباب میں وہ اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔اچھی خالہ ایک طرح سے دیکھیں تو اچھا ہوا نا؟ وطن کی محبت میں سرشار جب تقسیم وطن کا حادثہ دیکھتے تو کیسے برداشت کرتے؟ ہاں جیسے گاندھی جی جو تقسیم کے خلاف تھے ،ان کے ملک کے لوگوں نے انھیں قتل کردیا۔۔۔’ گاندھیؔ جی تقسیم کا واقعہ تو کسی طرح جھیل گئے لیکن وہ اس نئے ملک کے لئے خزانہ بھی تقسیم کرنا چاہتے تھے کہ مسلمان کیسے کھڑے ہوں گے؟ بس یہی بات حلق سے نہیں اتری ،سو قصہ ختم کردیا۔نہ رہا بانس، نہ بجی بانسری‘ یہ تو ہے! ہاں تو آپ ان کے کچھ ہنسنے ہنسانے والے اشعار بھی تو سنائیں میں موبائیل نوٹ بک میں محفوظ کروں۔کیوں نہیں۔چلیں پہلے ان کی نظم برٹش راج کے کچھ اشعار سنیں: بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشیں برٹش راج کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہیں جو چاہے کھول دے دروازۂ عدالت کو کہ تیل پیچ میں ہے ڈھلی اس کی چول بھی ہے

بھئی واہ کس خوبصورتی سے صاحب کو ڈیم فول کہہ دیا۔جب ہم اپنے ملک کے ڈیم فولس پر نظر ڈالتے ہیں صوفیؔ تو ہنسی کے بجائے رونا آتا ہے۔’ وہ کیسے؟ ” وہ ایسے کہ جب ہمارے ملک کے نوجوانوں انگریز عورتوں کی تیزی ،طرّاری، فیشن بنام عریانیت اور انکا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا دیکھا۔کلب ڈانس، کاکٹیل پارٹیز میں شرکت کی تو گویا حیرت زدہ رہ گئے! عورت ایسی بھی ہوسکتی ہے؟ ان کی سات پشتوں نے نہیں دیکھی تھی۔اب مشرقی عورت کا حسن، حیا، شرم، لحاظ سب انھیں معیوب لگنے لگے۔اب وہ نغمے اور غزلیں انھیں لطیفے معلوم ہوئے۔اور وہ دیوانہ وار ان انگریز لڑکیوں سے تعلقات قائم کرنے، یہاں تک کہ اپنا دین ،ایمان ،تعلیم تربیت قربان کرنے کو تیار ہو جاتے۔۔۔’ اچھا ہاں! یاد آیا امی کی نانی بتاتی تھیں کہ جو کوئی وکالت پڑھنے انگلینڈ جاتا ،وہ اپنے ساتھ ایک میم ضرور لاتا اور یہاں اپنے ملک میں ان کی منکوحہ ایک ایک دن آنسو پرو کران کے لئے ہمہ تن انتظار رہتیں۔“ جی! اسی موضوع پر ان کی بہت مشہور اور طنزیہ نظم ’برق کلیسا‘ یعنی انگریزی تہذیب کے ہندوستانی نوجوانوں پر ہونے والے مضر اثرات نظم کئے ہیں۔مثلاً انگریز دوشیزہ: ’آنکھیں وہ فتنہء دوراں کہ گنہگار کریں‘ گرم تقریر جسے سننے کو شعلہ لپکے‘ دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں۔“ واہ کیا خوب تصویرکشی ہے۔پھر صوفیہؔ ہمارا بدھو ہندوستانی نوجوان اس دوشیزہ کو شریک حیات بنانے کی پیش کش کرتا ہے تو جواباً اسلام کی خوبیوں اور مسلمانوں کی اچھائیوں کو وہ بہت برا کہتی ہے اور ہمسفر بننے سے انکار کردیتی ہے۔” اچھا بھلا وہ برائیاں کیا ہیں؟؟؟ بتائیں تو سہی کہ شاعر نے کیا فرمائیں۔لو بھلا ایک دو ہیں۔سرتاپا برائیوں کا مجسمہ ہے:

’غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے بُوئے خوں آتی ہے اس قوم کے انسانوں سے لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر۔ یہی نہیں یہ ایسے سر پھرے ہیں کہ کسی کی نہیں سنتے:

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں۔

”ہی ہی۔۔ پھر وہ مانی کہ نہیں اچھی خالہ؟“

ارے بٹیا۔اس عقل کے دشمن نے اسلام اور مسلمانوں کی فی الوقت صورت حال سے جو پردہ اٹھایا تو بس جو سنے شرمندگی سے پانی پانی ہوجائے۔” ایسا کیا کہہ دیا اس دشمن ایمان نے؟ تم اصرار کرتی ہو تو سنو:

عرض کی میں نے کی اے لزت جاں راحت روح
اب زمانے پہ نہیں ہے اثر آدمؑ ونوحؑ
شجر طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

”توبہ توبہ“ بالکل ہی ایمان بیچ کھایا کمبخت::

اور سنو دل تھام کر۔

ہم میں باقی نہیں اب خالد جاں باز کا رنگ دل پہ غالب ہے فقط حافظؔ شیراز کا رنگ
یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوش سپاہ
سب کے سب آپ ہی پر پڑھتے ہیں سبحان اللہ۔

”ویسے اچھی خالہ وہ چنگاری تھی اب شعلہ بن کر ساری دنیا کے مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ بلکہ تمام مذاہب کے ماننے والے اپنی اصلیت کھو بیٹھے ہیں۔ نیو ورلڈ آرڈر اور گلوبل ویلج کے کلچر پر چل رہے ہیں۔’ ہاں بس اللہ وقت رہتے سمجھ عطا کرے۔آمین‘۔’ پھر ہوا کیا؟ وہ مانی؟ کس شرط پر؟ ہاں بی بی جب مسلمان نوجوان نے کہا: میرے اسلام کو ایک قصّہء ماضی سمجھو ہنس کے بولی کہ پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو۔” یہ تو بڑی عبرتناک ہے۔“ سو تو ہے۔’ اچھا اس وقت کی سیاست پر بھی ان کی نظر تھی؟ ’ہاں کیوں نہیں! گاندھی جی کی تحریک آزادی، عدم تعاون، ہوم رول اور اپنی مجبوری سرکاری کارندہ ہونے کی وجہ سے کھل کر ساتھ نہ دینے کا غم سوز جان بن جاتا ہے۔اپنے رہنماؤں کی شخصیت بھی مسکراہٹوں کے درمیان بتاتے ہیں۔سرسید احمد خان کی تعلیم جدید، سائنس اور انگریزی خصوصاً لڑکیوں کی تعلیم کو علمائے دین تسلیم کرنے کو راضی نہیں تھے۔اسے اسلام اور مسلمانوں کی دینی بقا کے لئے زہر سمجھ رہے تھے لیکن سرسید کی نگاہ دوربیں اسے وقت کی اولین ضروت سمجھتی تھی چنانچہ یہ اشعار سنو:

سمجھا ہے تو نے نیچر و تدبیر کو خدا
دل میں ذرا اثر نہ رہا لاالہ کا۔
شیطان نے دکھا کے جمال عروس دہر
بندہ بنا دیا ہے تجھے حب جاہ کا

اوہو! تو ہمارے سرسید صاحب نے کیا جواب دیا؟ وقت اور حالات کے تقاضوں کے پیش نظر انھیں حالات سے سمجھوتا کرنے کی منّت کی: افسوس ہے کہ آپ ہیں دنیا سے بےخبر
کیا جانئے جو رنگ ہے شام و پگاہ کا۔

”یعنی اگر یوروپ کا سفر اختیار کریں:

آئے نظر علوم جدیدہ کی روشنی
جس سے خجل ہو نور رخ مہر و ماہ کا۔

پھر ان کی مزاحیہ رگ پھڑک اٹھتی ہے:

ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

رکئے اگر تو ہنس کے کہے ایک بت حسیں ول مولوی یہ بات نہیں ہے گناہ کا
اس وقت قبلہ جھک کے کروں آپ کو سلام پھر نام بھی حضور جو لیں خانقاہ کا
پتلون کوٹ و بنگلہ و بسکٹ کی دھن بندھے سودا جناب کو بھی ہوٹر کی کلاہ کا ’واہ

واہ بڑے دلچسپ شاعر تھے۔ کچھ

اور بتائیں۔ سفر لمبا ہے۔ کچھ بچے رو رہے ہیں۔ نیند بھی بیٹھے ہوئے کہاں آتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ٹکٹوں کی قیمت ہر سال بڑھتی جاتی ہے اور سفر آرام دہ کرنے کے لئے کوئی سبیل نہیں۔ کیا مجبوری ہے۔ سفر کرنا بھی ضروری ہے۔ ’

یاروں نے اتنی دور بسائی

ہیں بستیاں‘‘۔ ہاں بیٹی! اب میرے چاروں بچوں کا آب و دانہ انھیں ادھر ہی لے آیا۔ اب تنہائی کیسے برداشت کریں۔ بچے ہم لوگوں کے لئے پریشان رہتے ہیں اور ہم وہاں اپنے اپنے اکیلے پن سے پریشان رہتے ہیں۔ اس عمر میں کون ساتھ دیتا ہے۔ نوکر تو سمجھ لو تنہا اور ضعیف سمجھ کر جو حشر نہ کریں کم ہیں۔ خبریں سن کر دل ہولتا ہے۔ ہم لوگ کون سا امریکہ گھومنے آتے ہیں۔ آڑے، بیڑے وقت پر بچوں کا ساتھ چاہتے ہیں۔ بچے محبت سے بلاتے اور ہر طرح کا آرام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب کفران نعمت تو نہیں کیا جاتا؟ نہیں نہیں آپ سچ کہتی ہیں۔ میں بھی ممی، پاپا سے ادھر سیٹل ہونے کو کہتی ہوں۔ میرے بھائی بھابھیاں ادھر ہی ہیں۔ جہاں اپنے ہوں، وہی اپنا ٹھکانا ہو۔ آپ نے ادھر رہنے کا فیصلہ کر کے اچھا کیا۔ ہاں اس نوجوان نسل کے لئے خدشے بھی بہت ہیں۔ اکبر الہ بادی بھی انکا اظہار کرتے ہیں

مکان کالج کے سب مکیں ہیں ابھی انھیں تجربے نہیں ہیں
خبر نہیں ہے کہ آگے چل کر ہے کیسی منزل ہیں کیسے جادے
دلوں میں ان کے ہے نور ایماں قوی نہیں ہے مگر نگہباں
ہوائے منطق، ادائے طفلی یہ شمع ایسا نہ ہو بجھا دے۔

ہاں اس قسم کا نقصان بھی بہت ہوا لیکن جن لوگوں نے اپنے گھروں میں بنیادی دینی تعلیم اپنے بچوں کو سنجیدگی سے دیا، ان نوجوانوں نے دین اور دنیا میں توازن قائم کر کے بہت ترقی کیا اور اپنی نسلوں کو اسی انداز میں پروان چڑھایا۔ ایک طرف کے ہو کر نہیں رہے۔۔ انھیں شاعر کا یہ قول برابر تنبیہ کرتا رہا: تم شوق سے کالج میں پڑھو، پارک میں کھیلو جائز ہے غبّاروں پہ اُڑو چرخ کو چھولو

بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو۔

تحریک آزادی میں عملی طور پر حصہ نہ لینے کی مجبوری اپنی نوکری اور عمر ضعیفی کا اعتراف اس طرح افسوس کے ساتھ کرتے ہیں:

مدخولہ گورنمنٹ اکبرؔ اگر نہ ہوتا
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

زور بازو جب نہیں ہے، جب نہیں تیغ و تفنگ سرنگوں خامے سے پھر کاغذ پر گھس گھس کیا کریں۔ ’ سچ ہے عمر بھی طاقت اور کمزوری کی ہوا کرتی ہے۔ انگریزوں کی عیاری اور ہندوستانیوں کی بیوقوفی کی حدود کو لانگھتی ہوئی سادگی پر طنز کرتے ہیں:

دید کے قابل اب اس اُلو کا فخر و ناز ہے جس سے مغرب نے کہا تو آنریری باس (باز) ہے۔

بیٹی! اکبر الہ بادی نے انگریزوں کی اندھی تقلید کو بھی نشانہ بنا کر ہنسی ہنسی میں دور رہنے کی کوشش کی:

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے کوٹ بھی ہے، پتلون بھی ہے
لیکن میں تجھ سے پوچھتا ہوں اے ہندی
یوروپ کا تیری رگوں میں خون بھی ہے۔

اچھی خالہ کچھ اور مزاحیہ اشعار:

لو سنو پھر۔

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منھ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر
ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

یا اسے دیکھیں:

ہیں عمل اچھے مگر دروازۂ جنت ہے بند
کر چکے ہیں پاس لیکن نوکری ملتی نہیں
پردہ کا مخالف جو سنا بول اٹھیں بیگم
اللہ کی مار اس پہ علیگڑھ کے حوالے

اور یہ تو اکبر کا مشہور شعر ہے:

کچھ الہ باد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے فقط اکبر کے اور امرود کے

ارے ہاں وقعی الہ باد کے امرودوں کی بڑی تعریف سنی ہے۔ شاید انھوں نے آم پر بھی کچھ کہا ہے؟ ہاں کیوں نہیں!

نامہ نہ کوئی یار کا پیغام بھیجے
اس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے
پختہ اگر ہوں بیس تو دس خام بھیجئے
ایسا نہ ہو کہ آپ لکھیں یہ جواب میں
تعمیل ہوگی بعد میں، پہلے دام بھیجئے
معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈریس
سیدھے الہ باد میرے نام بھیجئے

لیکن بیٹی جس خوبی نے اس دور کے ہر ادیب و شاعر کو دوام بخشا وہ ان کی اپنے وطن سے دلی محبت ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ کوئی سودا کرنے کو تیار نہ تھے۔ انگریز پوری کوشش کرتے کہ ان کے دلوں کو پھاڑ دیں، تفرقہ ڈال دیں لیکن وہ اپنے طور پر سب کو سمجھاتے رہے:

کہتا ہوں میں ہندو، مسلماں سے یہی
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر تم پانی بن جاؤ موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو۔

بس یہ ایک ایسا وصف ہے کہ شاعر آج بھی عوام کے دل میں بستے ہیں۔ سچ کہا آپ نے۔ بہت اچھا سفر آپ کے ساتھ گزرا اور وقت گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلا۔ اب ہوائی جہاز کے لینڈ کرنے کا اعلان ہو رہا ہے۔۔۔ اللہ حافظ۔ اللہ پھر ملائے کسی خوبصورت موڑ پر۔ آمین۔

 7

شیخ اعظم حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی کی حیات وخدمات

ڈاکٹر نیلوفر حفیظ

Dr. Neelofar Hafeez
Assistant Professor (Persian)
Department of Arabic and Persian,
University of Allahabad,
Prayagraj. 211002.

کشور ہندوستان کی تاریخ میں بے شمار صوفیا اور مشائخ کا ذکر موجود ہے جن کی مساعی جمیلہ کے سبب اس دیار غیر میں تصوف وعرفان کو پھلنے پھولنے کے خوب مواقع میسر آئے خصوصاً خطہ گجرات میں تو ان صوفیا کرام کی ایک طول وطویل فہرست ملتی ہے جنھوں نے انسانیت وشرافت اورمحبت واخوت کے جذبات کوفروغ دینے کے سلسلے میں اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ہے، گجرات کے مشہور ومعروف عرفا، صوفیا اور درویشوں میں حضرت پیر محمد شاہ، حضرت شاہ عالم، حضرت قطب عالم، حضرت شیخ ارکن الدین مجذوب، حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی، شیخ احمد کھٹواور حضرت قاضی محمود دریائی وغیرہ کے نام خصوصی اہمیت کے حامل قرار دیئے جاتے رہے ہیں، گجرات میں سادات علوی میں بھی بے شمار ایسی یگانہ عصر اور نابغہ روزگار شخصیات گزری ہیں جن کے زندہ وجاوید کارناموں نے ہر مکتبہ فکر کے لوگوں کو یکساں فیض پہنچایا ہے اور انھیں عظیم شخصیات کی بدولت گجرات اور اطراف واکناف میں اسلامی تعلیمات کا عام رواج ہوا، ہندوستان بالخصوص گجرات کی تاریخ کی ان عظیم اور رفیع الشان شخصیات میں ایک بزرگ اورصوفی حضرت سید شاہ احمد وجیہ الدین علوی الحسینی گجراتی احمد آبادی کا نام بھی سرفہرست ہے، ہمارے وطن عزیز کے علوی بزرگوں ومشائخ کی تاریخ میں حضرت شاہ وجیہ علوی کو ابتدا ہی سے ایک بلند وارفع مقام حاصل رہا ہے ،اس صوفی بزرگ کی تہہ دار فکر اور متنوع شخصیت بے شمار علمی وروحانی کمالات وفضائل کا سرچشمہ تھی لہذا اگر آپ کوشریعت وطریقت کا مجمع البحرین کہا جائے تو مبالغہ نہ ورزیدہ باشم، یہ ان کی بے پناہ جامعیت وانفرادیئت ہی تھی، جس کی وجہ سے اکابرین، مشائخ، علما، فضلا اور دانشوروں نے آپ کے علم وفضل، ریاضت وعبادت اور روحانیت وتصوف کا خندہ پیشانی کے ساتھ اظہار واعتراف کیا ہے، آپ کا سلسلہ نسب حضرت سید الشہداء سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالی عنہ سے گزرتا ہوا پچیس واسطوں سے حضرت علی کرم اللہ تعالی وجیہہ الکریم تک جا ملتا ہے، گجرات کے صوفی بزرگوں کی تاریخ میں شاذ ونادر ہی ایسی قد آور اور ممتاز شخصیت دیکھنے کو ملے گی جن کی عظمت وشہرت گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ کم ہونے کے بجائے مزید افزوں ہوتی چلی جا رہی ہے، شاہ وجیہہ الدین کی ذات بابرکات ابتدا ہی سے بے شمار ہنر وکمالات کا بحر ذخار رہی تھی ،آپ کا علمی تبحر، شخصی کمالات، جامیعت اور روحانی فیوض کے ذکر سے تاریخ کے صدھا صفابت روشن ومزئین نظر آتے ہیں نہ جانے کتنے تشنہ کاموں نے ان کی ذات گرامی نے سیرابی وفرحت بخشی ہے اور نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں نے منزل مقصود کا نشان آپ ہی کی رہنمائی کے سبب مل سکا ہے آپ نے اپنے بے پناہ ہنر وکمالات کے سبب اس صفحہ قرطاس پر ہمیشہ کے لیے دائمی نقوش اپنی یادگار چھوڑے ہیں بقول حافظ:

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

آپ کے جد امجد حضرت سید بہاء الدین مکی قدس الہہ سرہٗ سید بہاالدین کا اصل وطن تو یمن تھا لیکن آپ مکہ معظّمہ میں آکر مقیم ہو گئے تھے اسی وجہ سے کئی مورخین نے انھیں مکی تحریر کیا ہے، آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں وہ کشور ہندوستان میں تشریف لائے اور گجرات میں سکونت اختیار کی اور ہدائت خلق میں مشغول ہو گئے ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے سید معین الدین کو ان کا جانشین بنایا گیا اور پھر ان کے بعد ان کے صاحب زادے قاضی سید عطا الدین مختلف علاقوں میں منصب قاضی کے فرائض انجام دیتے رہے، شاہ وجیہہ الدین کے پدر بزرگوار کا نام قاضی نصر اللہ محمود تھا جو قاضی کے منصب پر فائض تھے اور اپنے زمانے کے متقی، عبادت گزار اور پرہیزگاروں میں شمار ہوتے تھے خصوصاً معاصرین میں ان کا تقویٰ اور دیانت داری بڑی مشہور تھی، حاکم وقت سلطان مظفر حلیم نے ان کی پرہیزگاری اور خدا ترسی سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ ان کو شاہی محل کے نزدیک ایک جگہ عنائت فرمائی تھی تا کہ وہاں رہ کر وہ یکسوئی کے ساتھ اپنے علمی ودینی کاموں کوانجام دے سکیں اور حکمران وقت کو بھی ان کا قرب حاصل رہے، یہ ہی وہ جگہ ہے جو آج بھی خانقاہ وجیہہ الدین کے نام سے مرجع خلائق ہے شاہ صاحب کی ولادت باسعادت ۲۲ محرم ۹۱۰ میں بہ مقام چمپانیر

ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

میں ہوئی تھی اور ایام طفلی کا زمانہ انھوں نے اسی جگہ گزارا تھا، تقریباً آٹھ سال تک کا عرصہ اپنے پدر بزرگوار کے زیر سایہ رہ کر تعلیم وتربیت حاصل کی اس کے بعد اپنے والد ماجد کے ساتھ ہی احمد آباد میں تشریف لے آئے اور کے بعد انھوں نے احمد آباد میں پرورش و پرداخت پائی، آپ کا نام مبارک احمد اور لقب وجیہہ الدین تھا اور آپ کو نام سے زیادہ لقب سے شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، ان کی تعلیم وتربیت ایک علمی وادبی خانوادہ میں ہوئی تھی آپ نے صغر سنی میں ہی کلام پاک حفظ کرلیا تھا اور اس کے بعد دینی علوم کے حصول کی جانب متوجہ ہوئے آپ نے علوم عربیہ کی بیشتر کتابوں کا علم اپنے عزیز از جان چچا حضرت مولانا سید قاضی شمس الدین قدس سرہ سے حاصل کیا تھا چچا کے علاوہ انھوں نے اپنے ماموں جان شاہ بڑا ابن ابوالقاسم سے بھی دینی علوم حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ فرگذاشت نہیں کیا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ شیخ محدث ابوالبرکات بنبانی عباسی، ملک المحدثین علامہ محمد بن مالکی مصری، حضرت علامہ مولانا عماد الدین طارمی اور مفسر قران حضرت علامہ مولانا ابو الفضل گاذرونی وغیرہ جیسی مشہور اور یگانہ عصر شخصیات سے بھی کسب فیض کیا تھا ۹۳۴ تک وہ تقریباً تمام اہم علوم وفنون میں یدطولیٰ حاصل کر چکے تھے، ۹۳۵ ہجری میں انھوں نے ''مدرسہ علویہ'' کے نام سے ایک درس گاہ کی داغ بیل ڈالی اور اس میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، آپ اپنے طلبہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی کردار سازی، اخلاق سازی، روحانی تربیت پر بھی خصوصی توجہ صرف کرتے تھے آپ کے شاگرد آپ کے علمی فیضان سے ہی فیض یاب نہیں ہوتے تھے بلکہ روحانی انوار سے بھی منور ہوتے تھے، اس مدرسہ میں ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ علم تفسیر، علم حدیث، معانی وبلاغت، منطق، فلسفہ، ہیئت، مناظرہ اور ادب وغیرہ جیسے علوم کی تدریس کی جاتی تھی، آپ نے اس میں فتویٰ نویسی کا بھی باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا جہاں دور دور سے لوگ اپنے مسائل ومصائب آپ کے پاس لاتے، اور ان کا حل دریافت کرتے تھے، آپ کی انتھک کوشش اور محنت کے سبب اس درس گاہ نے آہستہ آہستہ ایک دانش گاہ بزرگ کی حیثیت اختیار کرلی تھی، جہاں سے سینکڑوں متلاشیان حق، درس حاصل کیا کرتے تھے اور پھر آگے چل کر ان طالب علموں نے صرف اپنے علاقے یا خطے ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں پھیل کر زندگی کے گونا گوں شعبوں میں اپنی گرانقدر خدمات انجام دیں اور نہ صرف ملک بلکہ بیرون از ملک میں بھی نمایاں ترقی اور کامیابی حاصل کی کہتے ہیں کہ شاہ صاحب نے تقریباً ۴۶ سال تک اس ادارے میں تعلیم وتربیت کا انتظام کیا، درس وتدریس کو لے کر آپ اس قدر سنجیدہ تھے کہ صرف ایک دو مواقع کو چھوڑ کر کبھی مدرسہ کو مقفل نہیں کیا گیا، آپ تا عمر لوگوں کی رہنمائی کرتے رہے اور اٹھاسی سال کی عمر میں بروز یک شنبہ صبح صادق کے وقت ۲۹ محرم ۹۹۸ ہجری میں اس دار فانی کو الوداع کہا، اپ کا مزار مبارک احمد آباد گجرات میں زیارت گاہ عام وخاص ہے ان کی وفات کے سانحہ پر بہت سے شاعروں نے تاریخیں نظم کی ہیں ذیل میں فقط ایک تاریخ نقل کی جارہی ہے:

''علوی بودہ آن ستودہ صفات
سقط الراس مدفنش گجرات
گفتہ ام سال نقل او بہ یقین
خلد مسکن عجب وجیہ الدین
این شاہ وجیہ الدین از عمدۂ گجراتی
ہم زاہد وہم، عابد عارف حق بے حد
اکثر کتب درسی از حاشیہ وشرحش
مکشوف مطالب شد در مسلہ معتد
در ماہ حرم اوراچون شد سفر جنت از
رحلت او غمگین شد خلق خدا بی حد
از ہاتف حق جستم چو سال وصال او
گفتا زسرا ایما بر بام بہشت آمد'' ۱؎

۹۹۸ ہجری

حضرت شاہ وجیہہ الدین نے اپنے پیچھے اپنے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑیں تھیں آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے اور جانشین شاہ عبداللہ علوی کے زہد وتقویٰ اور فضل وکمالات کے متعلق تذکروں اور تاریخی کتابوں میں خاصی تفصیل دیکھنے کو ملتی ہے البتہ دیگر اولادوں کے متعلق معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں تاریخ کے بعض ماخذ سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ آپ کے تمام صاحبزادے اور صاحبزادیاں نہائت دین دار، متقی اور پرہیز گار تھے اور ہمہ وقت ذکر الٰہی میں مستغرق ومنہمک رہا کرتے تھے اور وہ لوگ مختلف قسم کی کتابوں کو پڑھنے کے بڑے شائقین میں سے تھے البتہ ان کے بارے میں بہت زیادہ تفصیلات کہیں نظر نہیں آتی ہیں اس لیے ان کے متعلق تفصیلی طور پر کچھ کہہ پانا قدرے مشکل ہے۔

شاہ وجیہہ الدین علوی اپنے زمانے کے دانشور صوفی بزرگوں میں ایک بلند واعلیٰ مقام پر فائض تھے ان کے معاصرین میں انھیں بڑا پاکیزہ، متقی اور پرہیز گار صوفی سمجھا جاتا تھا، اوران کے ادب واحترام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جاتا تھا، ان کے اخلاق وکردار کے سبب ان کو ابتدا ہی سے ایک انفرادی اور امتیازی مقام حاصل تھا، یہ ہی سبب ہے کہ بڑے

بڑے دانشوروں، جید اساتذہ اور مفکرین نے آپ کی خوب خوب تعریف وتحسین کی ہے مثلاً اکبر کے دور کے عظیم دانشور آقائے عبدالقادر بدایونی نے اپنی کتاب ''منتخب التواریخ'' میں آپ کے کمالات وصفات کا ذکر بڑی عقیدت مندی اور احترام کے ساتھ کیا ہے اور آپ کے اوصاف جمیلہ وخصائل حمیدہ کے متعلق تفصیلی گفتگو کی ہے اب میں ذیل میں ان کی تحریر کردہ کتاب کے اردو ترجمے سے چند سطور نقل کر رہی ہوں جن کو پڑھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عبدالقادر بدایونی جیسا عظیم دانشور بھی ان کی عظمت کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کرتا ہے:

''بڑے عالم اور متقی اور عابد تھے جادہ شریعت پر مستقیم اور گوشہ قناعت میں مقیم ہمیشہ درس علوم دینی کا شغل رکھتے تھے، جمیع علوم عقلی اور نقلی میں ان کو ایسا ملکہ تھا کہ صرف ہوائی سے قانون اور شفا اور شرح مفتاح اور عضدی تک ہر کتاب پر انھوں نے شرح لکھا ہے، ہمیشہ خلائق کو ان کی صحبت سے فیض ہوتا رہتا تھا۔۔۔۔۔اسم شافی کے پورے پورے مظہر تھے ہرگز اپنی خوشی سے کسی اہل دنیا کے گھر نہ جاتے تھے مگر اپنی عمر میں ایک دوبار کسی کے جبر سے کہیں گئے ہیں ورنہ کبھی اپنے گھر یا مسجد سے قدم باہر نہ رکھا، نماز جمعہ کی وہیں پڑھتے تھے ہر قسم کے لوگ امیر غریب ان کے گھر جاتے، لباس ووضع میں کچھ ان کو عوام سے امتیاز نہ ہوتا تھا'' ۲

کاتب ازل نے شاہ صاحب کو ایک حساس ذہن ودل کے ساتھ ساتھ شیریں ولطیف زبان بھی عطا کی تھی اس لیے ان کی زبان سے جو بھی الفاظ نکلتے تھے وہ سامعین کے اذہان وقلوب پر پوری طرح نقش ہو جاتے تھے اور تاعمر وہ ان سے فیضیاب ہوتا رہتا تھا، آپ مخلوق خدا کے ساتھ ہمیشہ محبت، ہمدردی اور مشفقانہ سلوک روا رکھتے تھے یہ ہی وجہ تھی کی جو بھی ان سے ایک مرتبہ ملاقات کر لیتا تھا ساری عمر کے لیے ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا اور ان کی تعلیمات سے مسلسل مستفیض ہوتا رہتا تھا، ان کی ذات مبارک تقویٰ وپرہیزگاری، سادگی وشرافت، عاجزی وانکساری، اور خلوص وہمدردی کا ایسا پیکر تھی کہ ہمیشہ اطراف وجوانب کے لوگ ہی ان سے ملنے کے مشتاق نہیں رہتے تھے بلکہ دور دراز کے سفر کی صعوبتوں کو برداشت کر کے لوگ آپ کی ایک جھلک پانے کے لیے مشتاق وبیتاب رہتے تھے ، ان کی ذات مبارک نے ہر خاص وعام کو یکساں فیض پہنچایا ہے حضرت شاہ وجیہہ الدین کی قد آور اور عظیم المرتبت شخصیت کے متعلق مولانا عبدالرحمان پرواز اصلاحی نے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بالکل درست لکھا ہے:

''گجرات کی عظیم المرتبت اور باکمال ہستیوں میں حضرت شاہ وجیہ الدین علوی کی ذات گرامی بھی ہے، جن کی بدولت دنیا میں نیا انقلاب آیا، تشنگان علم کی جس بڑی تعداد نے ان سے سیرابی حاصل کی شائد ہی کوئی دوسری ذات ان کے مدمقابل نکلے، شاہ وجیہہ الدین کا علمی اور روحانی فیضان مدرسہ اور خانقاہ کی شکل میں صدیوں رہا، گجرات کے آسمان پر ان کے علمی کارناموں کی شعاعیں ابھی تک پرتو فگن ہیں'' ۳

حضرت شاہ وجیہہ الدین کو کتابوں کے مطالعے کا شوق حد سے بڑھا ہوا تھا، ان کا بیشتر وقت مختلف موضاعات کی کتب بینی میں صرف ہوتا تھا اور یہ کتابوں سے آپ کی بے پناہ محبت ہی تھی کہ آپ کی ذات علوم ومعارف کا ایک بحر زخار بن گئی تھی آپ نے درس وتدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے کاموں پر پر بھی خصوصی توجہ صرف کی ہے آپ کو جب بھی درس وتدریس کے کاموں سے فراغت ملتی تو گونا گون موضوعات سے متعلق کتابوں کے مطالعے میں منہمک ومستغرق ہو جاتے تھے شاہ صاحب کے تحریری کارناموں میں سب سے بڑا اور اہم کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے بکثرت کتابوں پر حواشی اور شرحیں تحریر کی ہیں جن کی ارزش وافادئیت ان کے زمانے سے لے کر اب تک اسی طرح قائم ودائم ہے ، شاہ وجیہہ الدین ایک زود نویسی اور کثیر التصانیف شخص تھے آپ کی تصانیف کے متعلق دانشوروں کی مختلف آراء دیکھنے کو ملتی ہیں، بعض محققین کے مطابق آپ نے تقریباً ۲۰۰ کے قریب کتابیں اور رسالے تحریر کیے ہیں جبکہ بعض کے مطابق آپ کی کتابوں کی ے تعداد ۳۰۰ سے بھی متجاوز ہے، دانشوروں کے متفق الآرا نہ ہونے کے سبب ان کی کتابوں کی درست تعداد کے متعلق تو کچھ کہہ پانا قدرے مشکل ہے کیونکہ انھوں نے جو بھی رسالے اور کتابیں تحریر کی تھیں ان میں سے بیشتر حوادث زمانہ کی نذر ہو کر صفحہ قرطاس سے اپنا نام ونشان محو کر چکی ہیں اور اگر کہیں موجود بھی ہیں تو ہماری دسترس سے دور ہیں اس لیے حتمی طور پر کچھ کہاط قدرے دشوار نظر آتا ہے، البتہ عصر حاضر میں ان کی تقریباً ۷۰ یا اس سے کچھ زائد کتابوں کے بارے میں پتہ چلتا ہے جن کو تلاش وتحقیق بسیار کے بعد آقائے سید حسینی پیر علوی نے اپنی کتاب ''تذکرۃ الوجیہہ'' میں تحریر کیا ہے شاہ صاحب کی دستیاب شدہ کتابوں کی فہرست ذیل میں درج کی جا رہی ہے:

رسالہ جنات عدن علی تفسیر البیضاوی، حاشیہ بیضاوی، حاشیہ علی تفسیر الرحمانی، شرح نخبہ فی اصول حدیث، شرح تجرید، حشیہ علی شرح عقائد تفتازانی، حاشیہ شرح مختصر الاصول لابن الحاجب، حاشیہ عضدی اصول فقہ میں، حاشیہ کشف الاصول، حاشیہ شفا قاضی عیاض، شرح بسیط فی الفرایض، رسالۃ الاصول، حاشیہ شفا قاضی عیاض، شرح بسیط فی الفرایض، رسالۃ الانسکریہ فی

10

اجوبتہ الطفقریۃ، شرح قدیمہ، حاشیہ شرح چغمنی، حاشیہ مختصر معانی، حاشیہ آصفہانی، شرح وجیز، رسالہ الکلام، حاشیہ علی شرحین للمفتاح فی المعانی والبیان، حاشیہ علی شرح المواقف فی الکلام، حاشیہ شرح مطالع، حاشیہ شرح العلامتہ الجامعی، حاشیہ کافیہ فی النحو، حاشیہ الجلالیہ، حاشیہ علی منہل العلامتہ الدمامینی، وافیہ شرح کافیہ، حاشیہ علی حاشیہ الخیالی، شرح ابیات منہل الدمامینی، شرح ابیات تسہیل، شرح تحفہ شاہیہ، حاشیہ شرح فوائد ضیائیہ، شرح ارشاد قاضی شہاب الدین دولت آبادی، حاشیہ مطول علم معانی، حاشیہ زبدہ، شرح شمیسہ فی المنطق، حاشیہ شرح تہذیب، حاشیہ عین المفتاح، حاشیہ قطبی منطق میں، شرح حکمتہ العین، شرح لوائح جامی، شرح کلید مخازن فارسی، حاشیہ علی الشرح تذکرہ النیشا پوری، شرح رسالہ علی قوشچی فی الھیئۃ فارسی، شرح علی جام جہاں نما فارسی، رسالہ القلب، رسالہ وقف اعداد، حقیقت محمدی، رسالہ ترتیب فی الصلوٰۃ، رسالہ ایمان، رسالہ فی تحقیق ابلیس، حاشیہ محقق دوانی، رسالہ تفسیر والدین آمنو واتبعتھم ذریتھم بایمان، رسالہ فامامن ثقلت موازینہ، حاشیہ علیٰ کتاب السید الشریف الجرجانی، رسالہ فی اجوبتہ الاعتراضات، الفقیہ الحیر تی علی فاضل الھندی، حاشیہ بزودی، رسالہ طریقہ بیعت، المختصر المولودالاما الجزری، اوراد وجیہ، مکتوبات، حاشیہ شرح مقاصد، مختصر تلخیص وحاشیہ ضریری۔

آقائے شاہ وجیہہ اوران کے معاصرین کی تحریروں سے با سانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا انھوں نے نہائت ہی سادگی، پرہیزگاری اور بے نیازی کے ساتھ اپنی ہمہ زندگی بسر کی تھی، وہ ایک اعلیٰ اور باعظمت خاندان کے چشم و چراغ ہونے کے باوجود بھی کسب معاش کر کے اپنے ہمہ اخراجات پورے کیا کرتے تھے اور رزق حلال کے معاملے میں حیرت انگیز حد تک احتیاط برتتے تھے ''رسالۃ الوجیہ'' کے حوالے سے سید ہاشم حسینی نے ان کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ جب ان کے والد بزرگوار کو اس بات کا علم ہوا کہ ان کا بیٹا گھر کا کھانا نہیں کھاتا ہے تو انھوں نے اس کی وجہ دریافت کی کہ آخر کیا سبب ہے کہ تم گھر کا کھانا نہیں کھاتے ہو تو اس پر انھوں نے جو جواب دیا ہے اس کو میں بعینہ نقل کر رہی ہوں:

''جب آپ کے والد گرامی کو یہ معلوم ہوا تو آپ سے اس کا سبب دریافت کیا آپ نے جواباً عرض کیا کہ چونکہ آپ منصب قضا پر متمکن ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے ملازم خرید و فروخت میں احتیاط نہ رکھتے ہوں، آپ کے والد نے فرمایا کہ اس منصب رفیع پر قائم ہونے کے باوجود میں رزق حلال کے معاملے میں مکمل احتیاط رکھتا ہوں اور شبہات سے بھی دور رہتا ہوں اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تم جیسا پرہیزگار اور تقوی شعار فرزند عطا کیا، لہٰذا تمہارا زہد و تقویٰ میرے تقوی و پرہیزگاری کی بین دلیل اور واضح علامت ہے''۔[۴]

حضرت شاہ وجیہہ الدین کے ملفوظات کو بھی صوفیانہ ادب میں خصوصی اہمیت و مقبولیت حاصل ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ آپ کے ملفوظات صوفیانہ ادب کا ایک گرانقدر سرمایہ ہیں جن کی ارزش و افادئیت آج ک ہے اب ذیل میں ان کے کچھ اقوال زرین پیش کیے جارہے ہیں جو آج کے حبس زدہ اور پر انتشار ماحول میں زخم خوردہ انسانیت کے زخموں کو مندمل کرنے میں نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں آپ فرماتے ہیں۔

۱۔ خدائے قدوس کا ہمیشہ ذکر کرتے رہو، ذکر سے وسوسے دور ہوتے ہیں اور دل کی صفائی حاصل ہوتی ہے، دل کی صفائی کا نشان شوق اور ولولہ محبت ہے۔

۲۔ خدا سے غافل کرنے والی عادت سے بچو اور غفلت لانے والی شے کو ترک کردو۔

۳۔ علم اور شغل دونوں حاصل کرو، کیونکہ دونوں کا مقصد ایک ہے، شغل کرنا ریاضت سے بہتر ہے اور خلوت اس سے زیادہ مفید ہے، ایام شغل میں کشف و کرامت کا انتظار نہ کرو۔

۴۔ روغن زیادہ استعمال کرو، گوشت کم کھاؤ۔

۵۔ راحت سے سستی ہوتی ہے، حلاوت نہیں ملتی ہے۔

۶۔ دنیا کو ترک کردو خدا مل جائے گا، اور دنیا سے دور ہو خدا تم سے قریب ہو جائے گا۔

۷۔ جوانی کی ریاضت بہت مفید ہے، جوانی میں جتنا سلوک اور ریاضت ہو اتنا ہی زیادہ مفید ہے۔

۸۔ مرشد کی اجازت کے بغیر ریاضت و مجاہدہ کرنا محض مغز کو سکھانا یا بدن کو ضعیف کرنے کا سبب ہوتا ہے۔

۹۔ مجاہدے اور ریاضت سے فتوحات کا باب کھل جاتا ہے مگر حجاب نہیں ہٹتا۔

۱۰۔ راحت اور تکلیف میں نفس کا رجحان معلوم کرو تا کہ آئندہ حال میں سنبھل سکو۔

۱۱۔ نفس خطرہ میں مبتلا کر دیتا ہے، ذکر کرو خطرے دور ہو جائیں گے۔

۱۲۔ سمع سے روحانی لذت حاصل ہوتی ہے۔

۱۳۔ ضعیفوں کی امداد کرنا، غریبوں سے سلوک کرنا، ہاتھ کی عبادت ہے۔ خویش و اقربا سے ملنا، علما اور اولیا اللہ سے ملنا، پاؤں کی عبادت ہے۔ مناظر قدرت دیکھ کر کوف الٰہی پیدا ہونا اور گریاں ہونا، آنکھ کی عبادت

11

ہے،توحید کی باتیں اور صلحا کا کلام سننا، کان کی عبادت ہے، دنیا سے قطع تعلق اور عقبیٰ کی طرف رجوع کرنا، دل کی عبادت ہے، کلام الٰہی اور مقبول دعاؤں کا پڑھنا، زبان کی عبادت ہے، اللہ کی ملاقات کا شوق ہونا، روح کی عبادت ہے۔

۱۴۔نفس کا کام ہی ہے وسوسے ڈالنا مگر تمہارا کام یہ ہے کہ ہر دم نفس کا لحاظ رکھو، نفس اپنے کام میں لگا رہے اور تم اپنے کام میں لگے رہو۔

۱۴۔کشایش اور ترقی زیادہ روزہ رکھنے سے نہیں ہوتی بلکہ شغل سے زیادہ ترقی ہوتی ہے ۵

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی اپنے زمانے کی ایسی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت ہیں جو صدیوں کے انتظار کے بعد شاذونادر ہی دنیا میں پیدا ہوتی ہیں ان کے افکار وخیالات اور عقائد ونظریات نے عہد بہ عہد اور نسل بہ نسل لوگوں کی روحانی اور ذہنی تربیت کی ہے اور آج بھی یہ سلسلہ اسی طرح جاری وساری ہے، عالم انسانیت کے لیے یہ ان کی بے لوث خدمات ہی کا نتیجہ ہے کہ آج اس دنیا سے رخصت ہوئے انھیں ایک طول وطویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی لوگ اتنے ہی ذوق وشوق اور ادب واحترام کے ساتھ کرتے ہیں جیسا کہ ان کے اپنے زمانے میں کیا جاتا تھا، عصر حاضر کے حبس زدہ ماحول میں اس عظیم شخصیت کے افکار ونظریات سماجی وروحانی دونوں ہی اعتبار سے نہ صرف قابل غور ہیں بلکہ ان پر عملی اعتبار سے کام کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے اب آخر میں ملا عبدالنبی احمد نگری کے ان اشعار کے ساتھ اپنی بات ختم کرتی ہوں:

جامع علوم وکامل عرفان
والی ملک وفضل شاہ جہان
طالبان را بحق رسانیدہ یقین
عاشقان رانمودہ روی مبین
صوفی وصافی از کدورت خاک
سر بسر جان از عناصر پاک
خوش بگو نام او وجیہہ الدین
وجہ او وجہ پاک دین متین
قدس، الل سرہٗ الاعلیٰ
نوراللہ وجہ بہ صفا۔

ماخذ ومنابع:

۱۔تذکرۃ الوجیہہ، سید حسینی پیر علوی، ناشر گجرات اردو اکادمی، حکومت گجرات، ۱۹۹۰،ص ۱۱۹۔

۲۔ منتخب التواریخ، اردو ترجمہ، عبدالقادر بدایونی، مترجم مولوی محمد احتشام الدین، ناشر منشی نول کشور لکھنؤ، ص ۴۱۴۔۴۱۵۔

۳۔ شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتیؒ احوال وآثار، مولانا عبد الرحمٰن پرواز اصلاحی، ناشر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی، ۲۰۱۵،ص ۱۵۔

۴۔
www.facebook.com/share/p/14Dj3pLKJq//:https

۵۔تذکرۃ الوجیہہ f، سید حسینی پیر علوی، ناشر گجرات اردو اکادمی، حکومت گجرات، ۱۹۹۰،ص ۹۹۔۱۰۰۔

 12

21ویں صدی کی تعلیمی ترقی میں پسماندہ طبقات کی موجودہ صورتحال: ایک جائزہ

سونو رجک

اسسٹنٹ پروفیسر، مانوسی ٹی ای دربھنگہ

محمد اشفاق عالم، اسسٹنٹ اردو ٹرانسلیٹر

سید رضا الرحمن، پی ایچ ڈی اسکالر، مانوسی ٹی ای دربھنگہ

محمد جمشید عالم، پی ایچ ڈی اسکالر، مانوسی ٹی ای دربھنگہ

محمد ندیم، پی ایچ ڈی اسکالر، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن، ایل این ایم یو، دربھنگہ

اُتّم کمار، ایم ایڈ اسکالر، مانوسی ٹی دربھنگہ

Abstract

یہ تحقیق بھارت کے پسماندہ طبقات، بالخصوص درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبائل اور دیگر پسماندہ طبقات کی تعلیمی صورتحال اور اس میں حائل رکاوٹوں کا جائزہ لیتی ہے۔ تعلیم کو قومی ترقی اور سماجی انصاف کا بنیادی ذریعہ قرار دیا جاتا ہے، لیکن زمینی سطح پر یہ طبقات اب بھی مالی مشکلات، صنفی امتیاز، سماجی تعصب اور ڈیجیٹل سہولتوں کی کمی کا سامنا کر رہے ہیں۔ اس مطالعے میں مخلوط تحقیقی طریقہ کار استعمال کیا گیا، جس کے تحت 500 طلبہ، 200 والدین اور 100 اساتذہ سے مقداری و معیاری ڈیٹا اکٹھا کیا گیا۔ شماریاتی تجزیے , ANOVA, t-test, Standard Deviation,Mean Correlation کے نتائج نے واضح کیا کہ مالی بوجھ طلبہ کی تعلیمی ترقی کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے، مرد و خواتین طلبہ کی تعلیمی رسائی میں نمایاں صنفی فرق موجود ہے، شہری و دیہی طلبہ کے درمیان ڈیجیٹل سہولتوں کا نمایاں تفاوت پایا گیا، اور حکومتی تعلیمی بجٹ 4- اور معیارِ تعلیم کے درمیان مضبوط مثبت تعلق r = 78.0 موجود ہے۔ مزید یہ کہ تحقیق نے ظاہر کیا کہ اگر حکومت تعلیمی بجٹ میں اضافہ کرے، خواتین کی تعلیم کے لیے مساوی مواقع فراہم کرے، اور دیہی علاقوں میں ڈیجیٹل انفراسٹرکچر کو بہتر بنائے تو پسماندہ طبقات کی تعلیمی ترقی میں نمایاں بہتری آسکتی ہے۔ یہ نتائج پالیسی سازوں، تعلیمی ماہرین اور سماجی اداروں کے لیے اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مساوی تعلیمی مواقع فراہم کیے بغیر سماجی انصاف اور پائیدار ترقی کے اہداف حاصل نہیں کیے جاسکتے۔

کلیدی الفاظ: پسماندہ طبقات، تعلیمی عدم مساوات، مالی مشکلات، صنفی امتیاز، ڈیجیٹل سہولتیں، تعلیمی بجٹ

تعارف (Introduction)

تعلیم کسی بھی معاشرے کی ترقی اور سماجی انصاف کے قیام کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے، لیکن بھارت میں درج فہرست ذاتیں (SC)، درج فہرست قبائل (ST) اور دیگر پسماندہ طبقات (OBC) اب بھی تعلیمی عدم مساوات کا سامنا کر رہے ہیں (2011,Deshpande)۔ اگرچہ آئینی تحفظات، ریزرویشن، اسکالرشپس اور دیگر حکومتی اسکیموں کے ذریعے ان طبقات کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن زمینی حقائق مختلف ہیں (Jha 2019,Parvati)۔ غربت، سماجی امتیاز، تعلیمی وسائل کی عدم دستیابی، اور تعلیمی اداروں میں امتیازی سلوک جیسے عوامل ان کے تعلیمی مواقع کو محدود کرتے ہیں (2021,Rawat)۔ نیولبرل تعلیمی اصلاحات اور نجکاری کے رجحان نے معیاری تعلیم تک رسائی کو مزید مشکل بنا دیا ہے، جس سے غریب اور پسماندہ طبقات کے طلبہ زیادہ متاثر ہو رہے ہیں (2007,Tilak)۔ اگرچہ نئی تعلیمی پالیسی (NEP 2020) میں مساوات پر زور دیا گیا ہے، لیکن عملی سطح پر اس کے مکمل نفاذ کے لیے مزید کوششوں کی ضرورت ہے۔ اس تحقیق کا مقصد ان چیلنجز کا تجزیہ کرنا اور ایسے اقدامات تجویز کرنا ہے جو پسماندہ طبقات کو تعلیمی دھارے میں شامل کر سکیں۔ تعلیم کسی بھی قوم کی ترقی، خوشحالی، اور استحکام کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نہ صرف فرد کی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو نکھارتی ہے بلکہ ایک مضبوط اور ترقی یافتہ معاشرے کی تشکیل میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

21ویں صدی کو تعلیمی ترقی کا دور کہا جاتا ہے، جہاں دنیا بھر میں تعلیم کو جدید خطوط پر استوار کیا جا رہا ہے، ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کو نصاب کا حصہ بنایا جا رہا ہے، اور تعلیمی پالیسیاں مزید جامع اور مؤثر بنائی جا رہی ہیں (UNESCO, 2022)۔ اس کے باوجود، پسماندہ طبقات کو معیاری تعلیم تک مساوی رسائی حاصل نہیں ہوسکی، اور وہ اب بھی تعلیمی عدم مساوات کا شکار ہیں۔ پسماندہ طبقات ان افراد یا گروہوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو سماجی، معاشی، اور جغرافیائی طور پر دیگر طبقات سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان میں دیہی علاقوں کے باشندے، غریب خاندان، اقلیتی برادریاں، مہاجرین، اور خواتین شامل ہیں۔ اگرچہ عالمی سطح پر تعلیم کے فروغ کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں، لیکن ترقی پذیر ممالک میں یہ طبقات اب بھی بنیادی تعلیمی حقوق سے محروم ہیں (World 2021,Bank)۔ اقوامِ متحدہ کے پائیدار ترقی کے اہداف (SDGs) میں تعلیم کو سب کے لیے لازمی اور معیاری بنانے پر زور دیا گیا ہے، خاص طور پر SDG-4 میں یہ عزم ظاہر کیا گیا ہے کہ کوئی بھی فرد تعلیمی مواقع سے محروم نہ رہے (2015,UN)۔ تاہم، حقیقت میں تعلیمی عدم مساوات اب بھی ایک بڑی رکاوٹ ہے، جس کی بنیادی وجوہات میں غربت، تعلیمی سہولیات کی کمی، صنفی امتیاز، اور ڈیجیٹل تفریق شامل ہیں (2023,OECD)۔ غربت پسماندہ طبقات کی تعلیمی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹوں میں سے ایک ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں لاکھوں بچے اسکول جانے کے بجائے مزدوری کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ ان کے خاندان بنیادی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔

ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

عالمی بینک کی ایک رپورٹ کے مطابق، کم آمدنی والے ممالک میں تقریباً 53 فیصد بچے پرائمری تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ہی اسکول چھوڑ دیتے ہیں (2021,World Bank)۔ اس کے علاوہ، تعلیمی سہولیات کی کمی بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ یونیسکو کے مطابق، دنیا بھر میں تقریباً 258 ملین بچے معیاری تعلیمی اداروں تک رسائی سے محروم ہیں، خاص طور پر وہ جو دور دراز اور دیہی علاقوں میں رہتے ہیں (2022,UNESCO)۔ صنفی امتیاز بھی تعلیم کے میدان میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، خاص طور پر ترقی پذیر ممالک میں۔ عالمی سطح پر 130 ملین لڑکیاں بنیادی تعلیم حاصل کرنے سے محروم ہیں (UNICEF, 2021)۔ اس کی بنیادی وجوہات میں ثقافتی اور سماجی رکاوٹیں، کم عمری کی شادی، اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ناکافی سہولیات شامل ہیں۔ اگرچہ کئی ممالک میں خواتین کی تعلیم کے فروغ کے لیے پالیسیاں متعارف کرائی گئی ہیں، مگر عملی طور پر ان پر مکمل عمل درآمد نہیں ہو سکا، جس کی وجہ سے صنفی عدم مساوات بدستور قائم ہے (2020,GPE)۔ 21 ویں صدی میں تعلیم کا ایک نیا چہرہ ڈیجیٹل لرننگ ہے، لیکن ڈیجیٹل تفریق بھی پسماندہ طبقات کے لیے ایک سنگین مسئلہ ہے۔ آن لائن اور فاصلاتی تعلیم کے بڑھتے ہوئے رجحان نے کئی طلبہ کو فائدہ پہنچایا ہے، لیکن وہ بچے جو انٹرنیٹ اور ڈیجیٹل آلات تک رسائی نہیں رکھتے، اس جدید تعلیمی انقلاب سے باہر رہ گئے ہیں (2021,ITU)۔ عالمی اقتصادی فورم کی ایک رپورٹ کے مطابق، کووڈ-19 کے دوران فاصلاتی تعلیم کی جانب منتقلی سے لاکھوں بچے تعلیم سے مکمل طور پر محروم ہو گئے کیونکہ ان کے پاس آن لائن کلاسز کے لیے ضروری وسائل موجود نہیں تھے (WorldEconomic 2021,Forum)۔ پسماندہ طبقات کی تعلیمی ترقی کے لیے مختلف اقدامات ضروری ہیں، جن میں تعلیمی مساوات پر زور دینا، غریب طلبہ کے لیے اسکالرشپ اور مالی معاونت کے پروگرام متعارف کرانا، دیہی اور کم ترقی یافتہ علاقوں میں تعلیمی اداروں کی بہتری، اور خواتین کی تعلیم کے لیے خصوصی اسکیمیں شامل ہیں (2023,OECD)۔ اس کے علاوہ، ڈیجیٹل تعلیمی مواقع کو ہر فرد کے لیے قابلِ رسائی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ حکومتیں اور نجی ادارے مل کر کام کریں تاکہ جدید تعلیم سب کے لیے دستیاب ہو (2022,UNESCO)

متعلقہ ادب کا جائزہ اور تصوراتی خاکہ (Conceptual Framework and Review)

بھارت میں اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں ذات پات پر مبنی امتیازات اب بھی ایک اہم مسئلہ ہیں۔ ریچل تھارنٹن (2019) کی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ یونیورسٹیوں میں SC/ST طلبہ کے خلاف غیر رسمی امتیاز بدستور موجود ہے، جو ان کی تعلیمی ترقی میں بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔ اسی طرح "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم" کے عنوان سے ایک مقالہ تاریخی تناظر میں مسلم سلاطین اور نو آبادیاتی دور کے تعلیمی ڈھانچے پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس مقالے میں مکاتب، مدارس، خانقاہوں، کتب خانوں اور ادبی سوسائٹیوں کے قیام کو تعلیم کے فروغ میں اہم قرار دیا گیا ہے، تاہم یہ بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ موجودہ دور کے تعلیمی چیلنجز اور تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس تسلسل میں "ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی صورتحال" کے عنوان سے ایک اور مقالہ سچر کمیٹی رپورٹ کی روشنی میں ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی اور سماجی پسماندگی کو نمایاں کرتا ہے۔ اس مقالے میں تعلیم، معیشت اور روزگار کے حوالے سے مسلمانوں کی پسماندگی کی وجوہات کو واضح کیا گیا ہے اور سفارشات کے مؤثر نفاذ کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ مزید برآں "دیگر پسماندہ طبقات" کے عنوان سے شائع ہونے والی تحقیق بھارت میں او بی سی (Other Backward Classes) کی تعریف، ان کی سماجی و تعلیمی پسماندگی اور حکومتی تحفظات پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس تحقیق میں واضح کیا گیا ہے کہ اگرچہ او بی سی کے لیے مختلف قسم کے تحفظات مختص کیے گئے ہیں لیکن ان کے عملی نفاذ اور حقیقی اثرات کے حوالے سے مزید تحقیق ضروری ہے۔ اس پس منظر میں موجودہ مطالعے کا مقصد پسماندہ طبقات کی تعلیمی صورتحال کا مختلف زاویوں سے جائزہ لینا ہے۔ اس تحقیق کے بنیادی مقاصد میں پسماندہ طبقات کے غربت اور تعلیمی رسائی کے درمیان تعلق کا تجزیہ کرنا، مرد اور خواتین طلبہ کی تعلیمی رسائی میں فرق کو جانچنا، شہری، نیم شہری اور دیہی علاقوں میں ڈیجیٹل تعلیمی سہولیات کے فرق کا موازنہ کرنا، اور حکومتی تعلیمی بجٹ اور معیارِ تعلیم کے درمیان تعلق کو واضح کرنا شامل ہیں۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے چند مفروضات قائم کیے گئے ہیں۔ پہلا مفروضہ یہ ہے کہ پسماندہ طبقات کے طلبہ کو تعلیمی اخراجات کی وجہ سے کوئی نمایاں مشکلات درپیش نہیں ہیں۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ پسماندہ طبقات کے مرد اور خواتین طلبہ کی تعلیمی رسائی میں کوئی فرق موجود نہیں ہے۔ تیسرا مفروضہ اس بات کا تعین کرتا ہے کہ پسماندہ طبقات کے شہری، نیم شہری اور دیہی علاقوں میں ڈیجیٹل سہولیات کی دستیابی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چوتھا مفروضہ یہ ہے کہ پسماندہ طبقات کے حکومتی تعلیمی بجٹ اور اسکولوں کے تعلیمی معیار کے درمیان کوئی تعلق موجود نہیں ہے۔

تحقیقی طریقہ کار (Research Methodology)

اس تحقیق میں پسماندہ طبقات کی تعلیمی ترقی پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا مطالعہ کیا گیا ہے، جس کے لیے توصیفی تحقیق (Descriptive Research) کے ساتھ ساتھ تحلیلی (Analytical) طریقہ اپنایا گیا ہے۔ یہ تحقیق ثانوی ذرائع (Secondary Sources) اور مقداری و معیاری طریقۂ کار (Qualitative Methods Quantitative) کے امتزاج سے کی گئی ہے تاکہ مختلف سماجی و تعلیمی عوامل کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے مخلوط تحقیقاتی طریقہ کار (Mixed Method Research) اختیار کیا گیا، جس میں ایک طرف سرکاری رپورٹس اور ڈیٹا بیس سے حاصل شدہ اعداد و شمار کا مقداری تجزیہ کیا گیا جبکہ دوسری طرف تعلیمی ماہرین، اساتذہ اور پسماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کے انٹرویوز کے ذریعے معیاری ڈیٹا اکٹھا کیا گیا۔ اس طرح تحقیق میں مقداری اور معیاری دونوں زاویوں سے ڈیٹا کا تجزیہ کیا گیا ہے تاکہ زیادہ ہمہ گیر نتائج حاصل کیے جا سکیں۔ تحقیق کی آبادی میں مختلف سماجی و تعلیمی گروہ شامل تھے جن میں پسماندہ طبقات (OBC ST,SC) سے تعلق رکھنے والے اسکول اور کالج کے طلبہ،

ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

14

ان طبقات کے علاقوں میں تدریسی فرائض انجام دینے والے اساتذہ، اپنے بچوں کی تعلیم کے مسائل کا سامنا کرنے والے والدین، اور تعلیمی پالیسیوں پر کام کرنے والے حکومتی نمائندے شامل تھے۔ نمونے کے انتخاب کے لیے خوشی سے منتخب کردہ نمونہ (Purposive Sampling) استعمال کیا گیا تاکہ براہِ راست تعلیمی پسماندگی کے مسائل سے متعلقہ افراد کو شامل کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے کل 200 افراد پر مشتمل ایک نمونہ تیار کیا گیا، جس میں 100 طلبہ، 50 اساتذہ، 30 والدین اور 20 تعلیمی ماہرین شامل تھے۔ ڈیٹا جمع کرنے کے لیے مختلف ذرائع استعمال کیے گئے جن میں سروے (Surveys)، انٹرویوز (Interviews) اور دستاویزی تجزیہ (Document Analysis) شامل ہیں۔ سروے کے ذریعے طلبہ، اساتذہ اور والدین سے سوالناموں کے ذریعے معلومات اکٹھی کی گئیں، جبکہ تعلیمی ماہرین اور پالیسی سازوں کے انٹرویوز کیے گئے تاکہ تعلیمی نظام کی خامیوں اور اصلاحات سے متعلق ان کے خیالات سامنے لائے جا سکیں۔ اس کے علاوہ مختلف تحقیقی مقالات، سرکاری رپورٹس اور تعلیمی اداروں کے اعداد و شمار کا بھی تجزیہ کیا گیا تاکہ مزید ٹھوس شواہد فراہم کیے جا سکیں۔ ڈیٹا کے تجزیے کے لیے مقداری معلومات پر شماریاتی تکنیکیں استعمال کی گئیں جن میں اوسط (Mean)، معیاری انحراف (Standard Deviation) اور رجحانی تجزیہ (Trend Analysis) شامل تھے۔ دوسری طرف معیاری ڈیٹا کو موضوعاتی تجزیہ (Thematic Analysis) کے ذریعے پرکھا گیا تاکہ پسماندہ طبقات کی تعلیمی ترقی پر اثر انداز ہونے والے عوامل کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے اور ایک جامع تصویر سامنے آ سکے۔

تجزیہ اور تشریح (Analysis and Interpretation)

اس تحقیق کے دوران حاصل شدہ ڈیٹا کا تفصیلی تجزیہ مختلف شماریاتی تکنیکوں کی مدد سے کیا گیا تاکہ پسماندہ طبقات کی تعلیمی رسائی اور ترقی میں حائل رکاوٹوں کو بہتر انداز میں سمجھا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے 500 طلبہ، 200 والدین اور 100 اساتذہ سے معلومات اکٹھی کی گئیں، جس نے ایک متوازن اور نمائندہ سیمپل فراہم کیا۔ تجزیے کے لیے Mean، Standard Deviation، t-test، ANOVA اور Correlation Analysis جیسی جدید شماریاتی تکنیکوں کا استعمال کیا گیا تاکہ اعداد و شمار سے حقیقی اور قابل اعتماد نتائج اخذ کیے جا سکیں۔ سب سے پہلے جب تعلیمی اخراجات اور مالی مشکلات کا جائزہ لیا گیا تو یہ بات سامنے آئی کہ پسماندہ طبقات کے طلبہ کو تعلیم کے سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ مالی بوجھ کی صورت میں درپیش ہے۔ Mean کی قدر 23.4 اور Standard Deviation کی قدر 12.1 اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ زیادہ تر طلبہ کو تعلیمی اخراجات کے باعث دشواری کا سامنا ہے۔ مزید یہ کہ وظائف اور مالی معاونت کی سہولیات نہایت محدود ہیں، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مالی مشکلات ان طلبہ کی تعلیمی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اس پہلو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر حکومت اور تعلیمی ادارے مناسب مالی معاونت فراہم کریں تو پسماندہ طبقات کے طلبہ کی تعلیمی شمولیت اور کارکردگی میں نمایاں بہتری آ سکتی ہے۔ اسی طرح صنفی بنیاد پر تعلیمی رسائی کے فرق کو جانچنے کے لیے t-test کا استعمال کیا گیا۔ نتائج سے یہ واضح ہوا کہ مرد اور خواتین طلبہ کی تعلیمی رسائی میں نمایاں فرق موجود ہے۔ p-Value کی قدر 0.05 سے کم ہونے کی وجہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ صنفی امتیاز اب بھی تعلیم میں ایک سنجیدہ رکاوٹ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواتین طلبہ کو مالی، سماجی اور ثقافتی دباؤ کی وجہ سے تعلیم میں آگے بڑھنے کے کم مواقع حاصل ہیں۔ یہ فرق پالیسی سازوں اور تعلیمی ماہرین کے لیے ایک سنجیدہ سوال ہے کہ خواتین کو مردوں کے برابر تعلیمی مواقع فراہم کرنے کے لیے کیا عملی اقدامات کیے جائیں۔ ڈیجیٹل سہولیات کے اثرات کا مطالعہ کرنے کے لیے ANOVA کا استعمال کیا گیا، جس نے شہری، نیم شہری اور دیہی علاقوں کے درمیان نمایاں فرق کو اجاگر کیا۔ نتائج نے بتایا کہ شہری علاقوں کے طلبہ کو نسبتاً زیادہ ڈیجیٹل سہولتیں حاصل ہیں جبکہ دیہی علاقوں کے طلبہ جدید ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ سہولتوں سے محروم ہیں۔ اس فرق کی وجہ سے شہری طلبہ تعلیمی میدان میں زیادہ مواقع حاصل کر پاتے ہیں، جبکہ دیہی طلبہ اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس صورتحال نے تعلیمی عدم مساوات کو مزید بڑھا دیا ہے اور یہ ثابت کیا کہ ڈیجیٹل تقسیم تعلیمی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر حکومت دیہی علاقوں میں ڈیجیٹل سہولتوں کو بہتر بنائے تو اس فرق کو کم کیا جا سکتا ہے اور تعلیمی مساوات کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ مزید برآں، تعلیمی پالیسیوں اور حکومتی اقدامات کے اثرات کو جانچنے کے لیے Correlation Analysis کیا گیا۔ اس میں حکومتی تعلیمی بجٹ اور معیار تعلیم کے درمیان تعلق کا جائزہ لیا گیا۔ Pearson Correlation Coefficient کی قدر r = 0.78 پائی گئی، جو ایک مضبوط مثبت تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب حکومت تعلیمی بجٹ میں اضافہ کرتی ہے تو اس کے براہِ راست اثرات تعلیمی معیار، اسکولوں کی سہولیات، اساتذہ کی تربیت اور طلبہ کی کارکردگی میں بہتری کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تعلیمی ترقی کے لیے سرمایہ کاری کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ مجموعی طور پر اس تحقیق کے تجزیے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ پسماندہ طبقات کی تعلیمی ترقی کو کئی بڑی رکاوٹوں کا سامنا ہے، جن میں مالی مشکلات، صنفی امتیاز اور ڈیجیٹل تقسیم سب سے نمایاں ہیں۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے مالی معاونت کی فراہمی، خواتین کی تعلیم کے لیے خصوصی اقدامات، اور دیہی و شہری علاقوں میں یکساں ڈیجیٹل سہولتوں کا قیام ناگزیر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، تعلیمی بجٹ میں اضافہ ان مسائل کے حل کے لیے ایک مؤثر اور دیرپا حکمت عملی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس طرح یہ تحقیق نہ صرف مسائل کی نشاندہی کرتی ہے بلکہ ان کے حل کے لیے واضح سمت بھی فراہم کرتی ہے۔

بحث اور نتیجہ (Discussion and Conclusion)

اس تحقیق سے حاصل شدہ نتائج پسماندہ طبقات کی تعلیمی صورتحال کے کئی اہم پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ ثابت ہوا کہ پسماندہ طبقات کے طلبہ کو تعلیمی اخراجات کی وجہ سے نمایاں مشکلات کا سامنا ہے۔ Mean کی بلند قدر (23.4) اور Standard Deviation (12.1)

نے واضح کیا کہ مالی بوجھ ان طلبہ کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اس کے باعث وہ اعلیٰ تعلیم تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس سے یہ مفروضہ رد ہوا کہ مالی اخراجات ان طلبہ کے لیے کوئی بڑی مشکل نہیں۔ مزید یہ کہ وظائف اور مالی امداد کے پروگرام ناکافی ثابت ہوئے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان طبقات کے لیے مالی معاونت میں خاطر خواہ بہتری کی ضرورت ہے۔ صنفی امتیاز کے پہلو سے t-test کے نتائج نے یہ ظاہر کیا کہ مرد اور خواتین طلبہ کی تعلیمی رسائی میں نمایاں فرق موجود ہے۔ 05.0p-Value اس امر کا ثبوت ہے کہ خواتین کو مردوں کے مقابلے میں زیادہ رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ غربت، سماجی دباؤ، اور ثقافتی رویوں نے خواتین کی تعلیم کو مزید محدود کر دیا ہے۔ اس طرح یہ مفروضہ بھی رد ہوا کہ مرد و خواتین کی تعلیمی رسائی یکساں ہے۔ شہری اور دیہی تقسیم کے تناظر میں ANOVA کے نتائج نے بتایا کہ شہری، نیم شہری اور دیہی علاقوں میں ڈیجیٹل سہولتوں کی دستیابی میں نمایاں فرق موجود ہے۔ شہری طلبہ بہتر انٹرنیٹ اور جدید تعلیمی وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جبکہ دیہی طلبہ ان سہولتوں سے محروم ہیں۔ یہ فرق تعلیمی عدم مساوات کو مزید بڑھاتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ تعلیمی مساوات کے لیے دیہی انفراسٹرکچر میں سرمایہ کاری ناگزیر ہے۔ مزید برآں، Correlation Analysis نے ظاہر کیا کہ حکومتی تعلیمی بجٹ اور معیار تعلیم کے درمیان ایک مضبوط مثبت تعلق (78.0 = r) موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تعلیمی بجٹ میں اضافہ ہوتا ہے تو اسکولوں کی سہولتیں، اساتذہ کی کارکردگی، اور طلبہ کی مجموعی کامیابی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ تعلیمی معیار بہتر بنانے کے لیے سرمایہ کاری سب سے مؤثر حکمتِ عملی ہے۔ ان اعداد و شمار پر مبنی نتائج کے ساتھ ساتھ تحقیق نے یہ بھی اجاگر کیا کہ درج فہرست ذات (Scheduled Castes)، درج فہرست قبائل (Scheduled Tribes) اور پسماندہ طبقات (OBCs) کی تعلیمی صورتحال اب بھی کمزور اور غیر مساوی ہے۔ ان طبقات کی خواندگی کی شرح میں اگرچہ گزشتہ دہائیوں میں بہتری آئی ہے، لیکن یہ اب بھی قومی اوسط سے کم ہے۔ خواتین کی خواندگی مردوں کے مقابلے میں خاصی کم ہے، خصوصاً دیہی علاقوں میں۔ ابتدائی تعلیم میں داخلے کی شرح میں اضافہ ضرور ہوا ہے، لیکن ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مرحلے تک پہنچنے والے طلبہ کی تعداد کم ہے۔ ڈراپ آؤٹ ریٹ غربت، سماجی تفریق اور تعلیمی اخراجات کی وجہ سے زیادہ پایا گیا۔ اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ تعلیم میں بھی ان طبقات کی نمائندگی محدود ہے۔ اگرچہ ریزرویشن پالیسیوں اور سرکاری اسکیموں کی وجہ سے کچھ بہتری آئی ہے، مگر پھر بھی یہ تعداد ناکافی ہے۔ حکومت نے اسکالرشپ، فری شپ، مڈ ڈے میل، رہائشی اسکولوں اور خصوصی کوچنگ مراکز جیسے اقدامات کیے ہیں، لیکن ان کا دائرہ کار محدود رہا ہے۔ دوسری طرف سماجی تعصب، امتیازی رویے، اور معیاری اساتذہ کی کمی اب بھی ان طبقات کی تعلیمی ترقی میں رکاوٹ ہیں۔ اس تحقیق کے نتائج مجموعی طور پر اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ پسماندہ طبقات کی تعلیمی ترقی کے راستے میں چار بڑی رکاوٹیں حائل ہیں: مالی مشکلات، صنفی امتیاز، شہری و دیہی ڈیجیٹل تقسیم، اور حکومتی سرمایہ کاری کی کمی۔ اس کے ساتھ ساتھ سماجی تعصب، ثقافتی رویے اور معیاری تعلیم کی کمی بھی اہم عوامل ہیں جو ان کی تعلیمی ترقی کو محدود کرتے ہیں۔ تاہم، یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر حکومت تعلیمی بجٹ میں اضافہ کرے، خواتین کے لیے مساوی تعلیمی مواقع فراہم کرے، اور دیہی علاقوں میں ڈیجیٹل انفراسٹرکچر کو مضبوط کرے تو ان طبقات کی تعلیم میں انقلابی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اس طرح پسماندہ طبقات قومی ترقی میں مؤثر کردار ادا کر سکیں گے اور مساوات، برابری، اعلیٰ اقدار اور حب الوطنی جیسے اوصاف سے مزین ایک بہتر معاشرہ تشکیل دیا جا سکے گا۔

References

Bourdieu, P. (1986). The Forms of Capital. In J. Richardson (Ed.), Handbook of Theory and Research for the Sociology of Education (pp. 241–258). Greenwood. https://home.iitk.ac.in/~amman/soc748/bourdieu_forms_of_capital.pdf

Deshpande, S. (2011). Social Justice and Higher Education in India. Indian Journal of Human Development, 5(2), 289–302 https://www.academia.edu/36917386/Social_Justice_and_Higher_Education_in_India_Today

Jha, P., & Parvati, P. (2019). Education in India: Policies, Practices, and Emerging Concerns. Routledge.

Rawat, A. (2021). Caste, Education, and Social Mobility in India: Challenges and Opportunities. Economic & Political Weekly, 56(30), 47–55.

Tilak, J. B. G. (2007). Post-Elementary Education, Poverty, and Development in India. International Journal of Educational Development, 27(4), 435–445.

UNESCO. (2022). Global Education Monitoring Report: Inclusive Education for All. United Nations Educational, Scientific and Cultural Organization file:///C:/Users/rahma/Downloads/1382516_EN.pdf

World Bank. (2021). Education for All: Progress and Challenges. The World Bank Group.

OECD. (2023). Bridging the

16

Kashmir Uzma. (2023). Hindustani Musalmanon ki taleemi wa maashi soorat-e-haal.

SONU RAJAK
ASSISTANT PROFESSOR MANUU COLLEGE OF TEACHER EDUCATION DARBHANGA (BIHAR)
Email ID: - sonu.06541@gmail.com
Mobile no:- 7979072824
Md Ashfaque Alam
Assistant Urdu Translator
Email: ashfaquekne1@gmail.com
Mobile no: 6203268056

Syed Razaur Rahman
Ph.D. Scholar, JRF, MANUU CTE Darbhanga
Email: - rahmanr869@gmail.com
Mobile no: - 7352758812

Md Jamshed Alam
Ph.D. Scholar, JRF, MANUU CTE Darbhanga
Email:jamshedalam2487@gmail.com
Mobile no: 8292432487

Md Nadim
Ph.D. Scholar, Dept. Of Education LNMU Darbhanga
Email ID: - Nadim87169@gmail.com
Mobile No: - 9508822412

Uttam Kumar
M.Ed. Scholar Manuu College of Teacher Education Darbhanga (Bihar)
Email Id: - uttamkumar8676@gmail.com Mobile no: - 7903087750

Educational Divide: Policy Recommendations for Equitable Learning Opportunities. Organisation for Economic Co-operation and Development.
United Nations. (2015). Sustainable Development Goals (SDGs). United Nations.
UIS. (2020). Out-of-School Children Initiative Report. UNESCO Institute for Statistics.
UNICEF. (2021). The State of the World's Children: Education and Gender Equality. United Nations Children's Fund.
GPE. (2020). Girls' Education and Gender Equality Strategy. Global Partnership for Education. https://www.globalpartnership.org/node/document/download?file=sites/default/files/2017-05-gpe-gender-equality-at-a-glance pdf
ITU. (2021). Measuring Digital Development: Facts and Figures. International Telecommunication Union.
World Economic Forum. (2021). Education in the Post-Pandemic World. WEF Report.
UNESCO. (2022). Teachers and Teaching in Disadvantaged Areas. United Nations Educational, Scientific and Cultural Organization.
Haadiya Magazine. (2022). Muslimano ki taleemi pasmandigi: Asr-e-hazir ke tanazur mein. https://haadiya.in/musalmano-ki-taleemi-pasmandigi-asr-e-hazir-k-tanazur-m-haadiyamag
Darul Uloom Deoband. (2022). Hindustani Musalmanon ka nizaam-e-taaleem. https://darululoom-deoband.com/urduarticles/archives/3842

نشانیات: معنی و مفہوم

ڈاکٹر نسیم احمد

اسسٹینٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

گاندھی فیضِ عام کالج، شاہجہانپور

(Semiotics)نشانیات کی سادہ ترین تعریف "نشانات و علامات" کا مطالعہ یا علم ہے۔ یہ نظریہ اس بات کی سائنسی تحقیق کرتا ہے کہ کسی بھی نظام میں معنی کس طرح تشکیل پاتے ہیں اور ان کی تفہیم کس طرح کی جاتی ہے۔ درحقیقت دنیا میں موجود تمام مظاہر کسی نہ کسی شکل میں علامات و نشانات کے طور پر عیاں ہوتے ہیں۔ دراصل نشانیات کا مقصد انھیں نشانات کا مطالعہ ہے۔

نشانیات کی تعریف کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:۔

(Daniel Chandler)ڈینیل چینڈلر

If you go into a bookshop and ask
them where to find a book on semiotics you
Even .are likely to meet with a blank look
you might be asked to define what ,worse
which would be a bit tricky if -semiotics is
It's .you were looking for a beginner's guide
worse still if you do know a bit about
because it can be hard to offer a ,semiotics
simple definition which is of much use in the
If you've ever been in such a .bookshop
you'll probably agree that it's wise ,situation
. Semiotics could be anywhere.not to ask
The shortest definition is that it is the study
But that doesn't leave enquirers .of signs
'What do you mean by a sign'.much wiser
.people usually ask next
Daniel :Semiotics for Beginners)
(1. p.Chandler

[ترجمہ: اگر آپ کسی کتب خانہ پر جا کر نشانیات پر کوئی کتاب مانگیں تو ممکن ہے کہ آپ کو بے اعتنائی کا سامنا کرنا پڑے۔اس سے بھی بدتر یہ کہ آپ سے نشانیات کی تعریف پوچھ لی جائے، جو تھوڑا اور بھی پیچیدہ ہوسکتا ہے اگر آپ ابتدائی رہنما کتاب کی تلاش میں ہیں ۔ یہ معاملہ اس وقت مزید دشوار کن ہو جاتا ہے جب آپ نشانیات کے بارے میں تھوڑا بہت جانتے ہوں، کیونکہ پھر کوئی سادہ تعریف بتانا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کبھی ایسی صورتحال سے گزرے ہیں، تو آپ شاید اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اس موضوع پر سوال نہ پوچھنا ہی بہتر ہے۔ نشانیات کہیں بھی ہوسکتی ہے۔اس کی مختصر ترین تعریف یہ ہے کہ یہ نشانات کا مطالعہ ہے۔ مگر اس سے پوچھنے والے کو کچھ زیادہ سمجھ میں نہیں آتا۔"نشان سے آپ کی مراد کیا ہے؟" لوگ عام طور پر اگلا سوال یہ پوچھتے ہیں۔]

نشانیات اس بات کی تحقیق کرتی ہے کہ معنی کس طرح وجود میں آتے ہیں اور ان کی رسائی کس طرح ہوتی ہے۔ ان کا انحصار اس علم پر مبنی ہے کہ کسی بھی قسم کے نشانات معنوں میں کیسے تبدیل ہوتے ہیں۔ حقیقی طور پر ارض و سماوات میں رونما ساری کارکردگیاں کہیں نہ کہیں نشانات و علامات کی شکل میں ہی عیاں ہوتی ہیں بس ان کا مطالعہ ہی نشانیات کا مقصد ہے۔ یہ نظام انسان، چرند، پرند، درند، اور یہاں تک کہ حیوانات میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ہماری زبانیں بھی اسی نظامِ نشانات پر مبنی ہیں۔ یہ نشانات نہ صرف فنونِ لطیفہ، فلسفہ، سائنس یا دوسرے علوم میں موجود ہے بلکہ اس کا اطلاق ہماری روزمرہ کی زندگی پر بھی ہوتا ہے۔ ہم اکثر یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا کام اور ہمارے خیالات لاشعوری طور پر ہمارے ثقافتی ورثہ کا حصہ ہوتے ہیں اور ان کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ فوری طور پر ہم کتنے فطری طریقے سے انھیں بیاں کرتے یا سر انجام دیتے ہیں۔ ہم سبھی کہیں نہ کہیں ایک ماہر نشانیات کا فرض نبھا رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے گرد و نواح میں ہو رہے واقعات کو نشانات کی رو سے ہم غیر شعوری طور پر ہی مواصلت کی شکل دے رہے ہوتے ہیں۔ ہم شہد کی مکھیوں کو دیکھتے ہیں کہ جب وہ رقص کرتی ہیں تو نشانیات کے طور پر وہ یہی بتا رہی ہوتی ہیں کہ رس کہاں موجود ہے۔ ٹریفک لائٹ کا لال، پیلا اور سبز رنگ بھی نشانیات کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ہم غیر شعوری طور پر ہی ان رنگوں پر عمل پیراں ہوتے ہیں کیوں کہ یہ لائٹ کا نظام ثقافتی طور پر ایک عرصۂ دراز سے ہمارے ذہن میں پیوست ہے۔

جب ہم نشانیات کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو اسٹوئک فلسفیوں اور اس کے بعد آگسٹین اور پوینسوٹ سے ہوتے ہوئے یہ علم جان لاک تک آتا ہے جو پہلی بار اسے Semiotics کا نام دیتا ہے۔

Ferdinand de Saussure اور Charles Sanders Pairce نشانیات کے سرخیل:

آج ہم جس نشانیات سے روبرو ہیں اس کا آغاز انیسویں و

بیسویں صدی کے دو معروف ماہرین لسانیات ونشانیات فرڈیننانڈ ڈسوسیر [یا سوسیور] اور چارلز سینڈرس پیئرس نے کیا۔سوسیور کا تعلق یورپی اسکول سے تھا جبکہ پیئرس کا امریکی اسکول سے۔ان دونوں ماہرین نشانیات کے نظریات کو بعد میں معروف فلسفیوں و دانشوروں ، جن میں کلاڈ لیوی اسٹراس، مائکل فوکو، ژاک دریدا، ژاک لاکاں، جولیا کرسٹیوا، رولاں بارتھ، اُمبیر تو ایکو وغیرہ ، نے دوسرے علوم وفنون مثلاً بشریات ، جمالیات، نفسیاتی تجزیہ، مواصلات، اور سیمنٹکس وغیرہ کا حصہ بنایا۔

کا نام دیا۔Semiology کہتا تھا جبکہ سوسیور نے اسے

Semiotcs پیئرس اسے

اس علم کو دونوں اصطلاحات بنیادی طور پر ایک ہی معنی دیتی ہیں۔

ساختیاتی لسانیات پر جب سوسیور کے کچھ کلاس لیکچرز کو ان کے تلامیز نے ان کی وفات کے بعد 1916 میں

کے نام سے شائع کرایا تو یہ لسانیات کی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ تھا Cours de linguistique générale اور جدید لسانیات کا آغاز بھی۔سوسیور کا لسان اور نشان کا نظریہ بڑا منفرد اور کئی معنوں میں لسانیات اور نشانیات کی نئی شمع روشن کرنے والا تھا۔انھوں نے کئی جدید و قدیم اسطلاحوں کے ذریعے نئے معنی پیدا کیے اور ان کا ایک مکمل نظام وضع کیا۔سوسیور نے جس نظام نشانات کی بنیاد ڈالی وہ دراصل دو حصوں پر مبنی تھا۔

"سوسیور

کے نزدیک ہر شے ایک نشان (Sign) ہے، جو اپنے مکمل معنی رکھتا ہے۔وہ اس نشان کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے: Signifier اور Signified ۔"

Signifier سے وہ اس نشان (Sign) کی جسمانی ساخت یا شکل مراد لیتا ہے اور

Signified سے وہ نشان (Sign) کا تصور یا معنی یعنی وہ چیز جو ذہن میں ہو مراد لیتا ہے۔

اس کو مثال کے ذریعے اس طرح سمجھا جا سکتا ہے:

مان لیجیے ایک لفظ "گلاب" ہے جسے سوسیور ایک Sign یعنی نشان کہتا ہے اور جو اپنے معنی رکھتا ہے۔یہ نشان گلاب ※ دو اجزاء سے مل کر بنا ہے۔جسے وہ Signifier (دال) اور Signified (مدلول) کہتا ہے، یعنی گلاب میں "گ، ل، ا، ب سے مل کر ایک لفظ یا نشان جو تصویر کی شکل میں عیاں ہوا، اسے سوسیور signifier کہتا ہے اور جو اس کے معنی ہیں یعنی ایک خوشبو دینے والا خاص طور پر لال رنگ والا، اپنی خاص بناوٹ کے ساتھ ایک پھول، جو اپنا خاص سیاق وسباق رکھتا ہو یعنی یہ محبت ورومانیت کی ترجمانی کر سکتا ہے، دوستی کا ااظہار کر سکتا ہے، خوبصورتی کو بیاں کر سکتا ہے، شادی کے لیے ہو سکتا ہے یہاں تک کہ جنازہ کے لیے بھی ہو سکتا ہے، کو سوسیور signified کہتا ہے۔ان دونوں کے درمیان ایک باہمی ربط پایا جا تا ہے۔سوسیور کے نزدیک معنی اپنے لفظ سے آزاد اور خود مختار (Arbitrary) ہوتا ہے یعنی نشان کا صوتی روپ، ڈھانچہ یا تصویر (Signifier) اور اس کے معنی (Signified) کے درمیان آزادانہ رشتہ ہوتا ہے۔سوسیور کی نشانیات (Semiology) کہتی ہے کہ لفظ "گلاب" کی صوت اور ہم اس سے کیا معنی اخذ کرتے ہیں اس میں فرق ہوتا ہے۔یہ معنی ہمیشہ آواز سے آزاد ہوتے ہیں یعنی ان کے درمیان ایک من مانا رشتہ ہوتا ہے۔الفاظ پر اگر ہم نظر ڈالیں تو ان کی آواز یعنی بناوٹ اور جو اس لفظ کے معنی لیے گئے ہیں وہ ثقافتی طور پر مخصوص اور روایتی ہوتے ہیں۔

پیئرس کا قول ہے:

"Nothing is a sign unless it is interpreted as a sign."

کوئی بھی چیز نشان نہیں ہے جب تک کہ اسے نشان سے تعبیر نہ کیا جائے۔

سوسیو کا نظریہ نشان جہاں دو رخی یا دو الفاظ (Dyadic) کا مرکب ہے وہیں پیئرس کا نظریہ سہ رخی یا تین اجزاء (Triadic) پر مبنی ہے۔سوسیور نشان کو Signifier اور Signified میں تقسیم کرتا ہے وہیں پیئرس اسے Representamen, Object , Interpretant کے طور پر پیش کرتا ہے۔

Representament (نمائندگی) اور سوسیور کے Signifier میں کافی مماثلت ہے۔

Object (کوئی بھی حقیقی یا خیالی شے)

Interpretent (تصور، ترجمان یا مترجم): یہ سوسیور کے Signified کے زیادہ نزدیک نظر آتا ہے۔اس طرح Reprasentamen سوسیور کے Signifier کی طرح ہی نشان کو صوتی پہلو کو بیان کرتا ہے جبکہ Interpretent وہی کام کرتا ہے جو سوسیور کا Signified کرتا ہے یعنی وہ نشان کی وضاحت کرتا ہے جس سے اس کے معنی مراد لیے جاتے ہیں۔اور شے (Object) کسی بھی خیالی اور حقیقی چیز، کوئی قصہ یا واقعہ یا کوئی خوبی یا خرابی یا کوئی قانون وغیرہ سبھی نشانیات کی رو سے "شے" کے دائرے میں آتے ہیں۔

شبیہ (Icon): نشان اور اس کی نمائندگی کرنے والی شے کے درمیان مماثلت۔مثال کے طور پر کسی انسان کا فوٹو۔فوٹو کی مماثلت اسکی نمائندگی کرنے والے شخص سے ہے۔بیت الخلا کے دروازہ پر لگی عورت اور

آدمی کی تصویر۔ جو حقیقی معنوں میں ایک مرد اور دوسری تصویر عورت کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ دونوں روائتی طور پر یہ معنی دیتے ہیں۔

اشاریہ (Index): یہ ایک ایسی علامت ہے جو کسی چیز کے معنی کو بیان کرتی ہے جو اشارہ کی شکل میں ہوتا ہے۔ چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ اسی طرح مسکراہٹ خوشی کی علامت (اشاریہ) ہے۔ اسی طرح دھواں آگ کی علامت (اشاریہ) ہے خود میں آگ نہیں ہے۔ سڑک کے نشانات، ٹریفک لائٹس، وغیرہ اشاریہ ہیں۔

علامت (Symbol): علامت ایسا نشان ہے جس کا اس شے سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے جس کی وہ حقیقی معنوں میں نمائندگی کرتا ہے۔ ان کا آپس میں ایک روائتی رشتہ ہوتا ہے ایک ایسا رشتہ جسے ہم نے وقت کے ساتھ سیکھا ہے۔ لفظ کرسی اور Object کے درمیاں کوئی حقیقی ربط نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر ساری زبانوں میں اسے کرسی ہی کہا جاتا۔

سوسیور نشانیات کو" معاشرے میں نشانات کی زندگی" سے تصور کرتا ہے۔ نشانیات کا دوسرے علوم وفنون سے بہت گہرا رشتہ ہے۔۔ اس کا اطلاق انسانی اور غیر انسانی دونوں شعبوں پر بخوبی ہوتا ہے۔ ادبی تنقید میں نشانیات کا کلیدی رول ہوتا ہے۔ ادبی عمل میں یہ متن کی وسیع تر معنوی ساخت کو اجاگر کرتی ہے۔ مغرب میں تو اسے باقاعدہ ایک ڈسکورس کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں اردو میں اس پر بہت کچھ نہیں لکھا گیا۔ گنتی کے دو چار مضامین ہی نظر آتے ہیں ۔ہمیں نشانیات پر باقاعدہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔

سوسیو کا ثنائی نظام: تنقید اور بین المتونیت (Intertextuality)

فردناند دِسوسیور کا دورخی نظریہ [Dyadic Model] در حقیقت نشانیات کی بنیاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نظام کے ذریعے معنی کی پیدائش دو اجزا کے باہمی تعلق میں قید ومحدود کردی جاتی ہے۔ اور تسلیم یہ کرلیا جاتا ہے کہ معنی ایک خود مختار اور مکمل اکائی ہے۔ اس نظریہ پر بعد کے مفکرین نے سخت تنقید کی۔ جس میں ژاک دریدا کا نام سرفہرست ہے۔ وہ اپنے نظریہ ردتشکیل کے ذریعے اس پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ معنی کو کبھی بھی کسی ایک نشان میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ معنی کبھی بھی کسی بند نظام میں وجود میں نہیں آتے ۔ وہ ہمیشہ دوسرے نشانوں کے ساتھ ان کے تعلق اور ان سے اختلاف یا فرق کی بنیاد پر پیدا ہوتے ہیں۔

متن سے باہر معنی کا انحصار: دریدا اپنی بات کو دلیل سے ثابت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کسی لفظ کا معنی دوسرے الفاظ کی موجودگی یا غیر موجودگی سے بنتا ہے۔ اس کی مثال دن اور رات سے لی جاسکتی ہے۔ دن کا معنی تب وجود میں آتا ہے جب رات کا تصور ہو۔ یہ معنی فرق Difference پر مبنی ہوتا ہے۔

بین المتونیت (Intertextuality): جب معنی کی پیدائش کا یہ وسیع تصور ہمارے سامنے آیا تب ہی بین المتونیت کا نظریہ وجود میں آیا۔ اس نظریہ کے مطابق کوئی بھی نشان یا یوں کہیں ادبی متن اپنا تنہا و اکیلا وجود نہیں رکھتا بلکہ اس کا انحصار دوسرے متون، ثقافتی حوالوں، قصے کہانیوں، نظموں پر ہوتا ہے۔ یہ آپس میں جڑے ہوتے ہیں۔ ایک تخلیق کار کی تصنیف ماضی میں تحریر کردہ ادب کا حصہ ہوتی ہے۔ فرض کیجیے ہم منٹو کا شاہکار افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگ" پڑھ رہے ہیں تو اس میں معنی صرف افسانے کے الفاظ تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ اس دور کی تاریخ، تقسیم ہند کا صانحہ، اخبارات اور اس دور کی دوسری تصانیف اور فکشن وغیرہ کا حوالہ بھی سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ جس سے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا متن اس سارے تاریخی و ثقافتی اور ادبی متون سے مل کر اپنا معنی پیدا کرتا ہے۔

رولاں بارتھ کا کردار: بنیادی اور ثانوی معنی، اور اسطورہ (Myth)

رولاں بارتھ (Roland Barthes) کا نام بھی محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ نشانیات کے میدان میں انھوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے سوسیور کے نظریہ ونظام میں مزید اضافہ کرتے ہوئے معنی کی ایک نئی سطح کو بیان کیا۔ اور اس زمرہ میں انھوں نے دو نئی اصطلاحیں اخذ کیں، جنھیں انھوں نے ثانوی معنی [Connotation] اور اسطورہ [Myth] کا نام دیا۔

بنیادی معنی [Denotation]: یہ کسی نشان کا عام، سادہ یا لغوی معنی تسلیم کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بار پھر "گلاب" کو لیتے ہیں۔ اس کا اصل و بنیادی معنی ایک مخصوص قسم کا پھول ہے۔ جس میں پتیاں اور خوشبو بھی ہوتی ہے۔ اس کا یہ معنی ہر جگہ یکساں ہوتا ہے اور اس کا یہ معنی ثقافت سے بھی آزاد ہوتا ہے۔

ثانوی معنی (Connotation): ثانوی معنی کسی نشان کا علامتی یا اضافی یا جذباتی معنی ہوتا ہے، جو اپنا سماجی وثقافتی سیاق وسباق رکھتا ہے۔ مثلاً گلاب کے ثانوی معنی جیسا کہ اوپر بھی بیان کیا جاچکا ہے جمالیات، دوستی ومحبت اور رومانیت وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ یہ سماج کے اندر ہی وجود میں آتے ہیں اور وقت وحالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

اسطورہ (Myth): رولاں بارتھ کا اسطورہ ایک ایسا نظام ہے جس میں وہ ثانوی معنی کو فطری یا سچائی بنا کر پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی اشتہار میں ایک موٹر سائکل کو لیجیے۔ یہاں یہ صرف ایک سواری نہیں ہے۔ اگر اسطورہ کے خیال کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھیں تو یہ مردانگی، جوانی یا آزادی کی علامت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اسی طرح اور بہت سی مثالیں ہیں۔ بارتھ کا نظریہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہمیں ان پوشیدہ معنوں کی شناخت کرنا

چاہیے اور انھیں سمجھنا چاہیے جو اسطورہ کے طور پر ہمارے لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔۔اس طرح ہماری روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہونے والی اشیا جیسے کوئی خاص لباس ،کوئی اشتہار وغیرہ اپنے بنیادی ومخصوص معنی سے علیحدہ ایک گہرا ومعنی خیز سیاسی یا سماجی پیغام دیتے ہیں۔

اس طرح رولاں بارتھ اپنے نظریہ کے ذریعے یہ ثابت کرتا ہے کہ نشانیات صرف اور صرف الفاظ تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق ہمارے فیشن ہماری ثقافت، ہمارے اشتہارات اور یوں کہیے کہ ہماری غذا یعنی کھانے پینے کی عادات میں بھی نشانات کا ایک وسیع ومکمل نظام موجود ہوتا ہے۔جو مسلسل طور پر معنی پیدا کررہا ہوتا ہے اور یہ مسلسل جاری رہتا ہے۔

]Umberto Eco امبیرتو ایکو [کے نشانیات کے نظریہ کی سب سے بڑی خوبی یہ کے وہ اسے صرف زبان تک محدود نہیں کرتے بلکہ وہ اس میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کو شامل کرتے ہیں۔وہ ایسی سائنس تسلیم کرتے ہیں جو ہر قسم کے نشانات وعلامات اور معنی کے وجود میں آنے کا مطالعہ کرتی ہے۔وہ مانتے ہیں جہاں بھی معنی پیدا ہوتے ہیں وہاں نشانیاتی عمل کارفرماں وجاری ہوتا ہے۔اس طرح ان کے نزدیک اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اس میں فلمیں،تصاویر،اشارے،فن تعمیر اور فیشن وغیرہ بھی شامل کیا جاتا ہے۔

ایکو کے اہم نظریات اور تصورات

1. نشانیاتی عمل (Semiosis)

Semiosis ایکو کا ایک ایسا تصور یا عمل ہے جس میں کوئی نشان یا علامت کسی چیز کا حوالہ دیتی ہے۔اس کی تشکیل میں تین اعضاء کار فرماں ہیں۔

Representamen (علامت): وہ شے جو معنی کا حوالہ دے۔مثال کے طور پر لفظ درخت※ یا اس کی تصویر

Object (حوالہ): اس سے مراد وہ حقیقی شے' درخت※ جس کا حوالہ دیا جارہا ہے۔

Interpretant (مفہوم): ایک ایسا ذہنی خیال یا تصور جو علامت کے استعمال سے وجود میں آئے۔

ایکو کا خیال ہے کہ اس عمل کو نہ تو انفرادی تسلیم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی سماجی، بلکہ یہ دونوں کے بیچ میں ہوتا ہے۔

معنی کا لامحدود سلسلہ (Unlimited Semiosis)

Eco کے نظریے کے مطابق کسی بی m نشان یا علامت کا معنی کسی بھی طرح حتمی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ایک Interpretant (مفہوم) خود نئی علامت بن جاتا ہے۔جس سے کسی اور معنی کا حوالہ وجود میں آتا ہے اور اس طرح یہ سلسلہ لامحدود بن جاتا ہے۔مثلاً۔

لفظ درخت※ ایک Interpretant کو جنم دیتا ہے۔جس میں لکڑی ہوشاخیں ہون اور سبز رنگ وغیرہ ہو۔

یہاں سبز رنگ خود ایک نئے نشان یا علامت کو جنم دیتا ہے جس کا مفہوم زندگی بھی لیا جاسکتا ہے اور ※ ماحولیات بھی۔

ماحولیات کی علامت ایک نئی علامت بن کر ہمارے سامنے گلوبل وارمنگ کی شکل میں نمودار ہوسکتی ہے۔

اس طرح ایکو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کے معنی ایک کے بعد دیگرے ایک زنجیر کی صورت اختیار کرلیتا ہے اور آگے بڑھتا رہتا ہے مگر اس میں کوئی بھی معنی مستقل نہیں ہوتا۔

تشریح اور فہم (Interpretation and Understanding)

Eco نے اپنی مایہ ناز کتاب" The Limits of
" r p
میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ معنی کا سلسلہ بھلے ہی لاحدود ہو مگر اس کی کچھ حدود ضرور ہوتی ہیں۔ان کے نزدیک ناظرین یا قارئین پوری طرح آزاد نہیں ہیں کہ وہ کسی متن کے جو چاہیں معنی نکال لیں۔ان کے مطابق کسی ادبی پارے کے متن یا علامت کی تشریح اس کی بنیادی ساخت اور اس کے سیاق وسباق کے اندر ہی عمل میں آنی چاہئے۔

متن کا ارادہ (Intentio Operis):Eco کسی بھی متن کو ارادہ سے جوڑتا ہے۔ان کے مطابق ہر متن کا ایک ارادہ ہوتا ہے۔جو اس کی داخلی ساخت میں پایا جاتا ہے۔ایک بہتر تشریح وہی تسلیم کی جاتی ہو اس ارادے کو سمجھنے کی سعی کرے۔

Eco کے نظریے پر اگر غور کیا جائے تو یہ پہلو صاف عیاں ہوتا ہے کہ معنی کوئی ٹھوس مستحکم و مستقل شے نہیں ہے بلکہ یہ ایک سائنسی عمل ہے جو نشانات وعلامات، سیاق وسباق اور ثقافت کے درمیان ہوتا ہے۔ان کا موقف نشانیات کو ادب، فلسفہ اور سماجی علوم کے وسیع میدان میں ایک کلیدی طرز یا طریقہ کار کے کے روپ میں قائم کرتا ہے جو نشانیات کے میدان میں ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

اختتامیہ

اگر نتیجے کے طور پر کہا جائے تو نشانیات (Semiotics) ایک ایسے علم کو کہا جاتا ہے جو معنی کے وجود میں آنے ،تبدیل ہونے اور منتقل ہونے کے طریقوں کی وضاحت کرتا ہے۔یہ علم صرف زبان تک ہی محدود نہیں بلکہ اس نے ہماری زندگی کے ہر پہلو مثلاً سماج، ثقافت، فنون لطیفہ، فلسفہ۔ ابلاغ، سائنس، اشتہارات، علامات اور روزانہ کی معلومات حتی کہ قدرتی مظاہر وغیرہ سبھی کو اپنے احاطے میں لیا ہے۔اس علم کی بنیاد سوسیور اور پیرس کے ذریعے رکھی گئی اور انھوں نے ہی اس کے بنیادی اصول بنائے ان دونوں کو جدید نشانیات کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔سوسیور کا دال اور

مدلول(Signifierاور Signified) کا دورخی تصوراور پیٖیرس کا Interpretant, Object,Representamen سہ رخی تصور نے معنی کی تفہیم میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔بعد کے مفکرین جن میں دریدا، رولاں بارتھ، امبرتوا ایکو وغیرہ نے اس علم کونئ جہتیں اور نئے زاویے شامل کیے ۔دریدا اپنے نظریے ردتشکیل کے ذریعے سوسیور کے دورخی نظرے پر سخت تنقید کرتا ہےاس کے نزدیک معنی کبھی بھی کسی ایک نشان میں محدودنہیں رہتا بلکہ دوسری علامات ونشانات کے تعلق اورفرق سے تشکیل پاتا ہے۔اسی تصور سے بین المتونیت(Intertextuality) کا نظریہ وجود میں آیا۔ بارتھ نے بنیادی وثانوی اوراسطورہ کا نظریہ پیش کیا جس کے ذریعے انھوں نےمعنی کے ثقافتی پہلوکواجاگرکیا۔ایکونے دوسری طرف معنی کو لامحدودمعنوی سلسلہ بتایا۔ان کا اہم نظریہ نشانیاتی عمل(Semiosis) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

آخر میں ، مجموعی طور پر نشانیات سے مراد ایک ایسا فکری و سائنسی نظام یا علمی شعبہ ہے جس کے ذریعے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ اس دنیا یا پھر کسی متن کو کیسے دیکھیں، سمجھیں اور کیسے معنی پیدا کریں۔ یہاں معنی کوئی مستقل شے نہیں ہیں بلکہ یہ مسلسل جاری رہنے والا عمل ہے۔اس کے ذریعے روزمرہ کی چیزیں مثلاً زبان، نشان و علامت، مظاہر اور ثقافتی اشکال میں چھپے ہوئے معنوں کو منظر عام پر لایا جاتا ہے۔اردو ادب وتنقید میں نشانیات پر کوئی خاص کام نہیں ہوا ہے، اس لیے ہماری ادبی شخصیات کو اس طرف خاص توجہ کرنی چاہیے ،جس کے ذریعے ادب اور ثقافت کو جدیدطرز پر پرکھنے اورسمجھنے کے نئے امکانات پیدا ہوں۔

اردوحوالہ جات

1۔ بیگ، مرزاخلیل احمد۔تنقید اور اسلوبیاتی تنقید۔نئی دہلی: شعبہ لسانیات،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ، 2005

2۔عتیق اللہ، ڈاکٹر۔جدید ادبی نظریات۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔2011

3۔ نارنگ، گوپی چند۔ساختیات، پس ساختیات اورمشرقی شعریات۔مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔1990

4۔اختر، سلیم۔ساختیات اور لسانیات۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1993

5۔آغا، وزیر۔ جدید اردوتنقید: اصول ونظریات۔ بہاولپور: اردو اکیڈمی، 1989

6۔قاسمی، ابوالکلام۔ پس ساختیات اورعصری تنقید۔ نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2011

انگریزی حوالہ جات

Hill and .Mythologies.(1972). Roland,Barthes
Wang.1
The :Semiotics.(2017). Daniel,Chandler
Routledge.2.Basics
Of .(1976). Jacques,Derrida .3
. Johns Hopkins University Press.Grammatology
A Theory of .(1976). Umberto,Eco .4.
Indiana University Press.Semiotics
The Limits of .(1990). Umberto,Eco .5
Indiana University Press.Interpretation
.(1958-1931). Charles Sanders,Peirce .6
Harvard .Collected Papers of Charles Sanders Peirce
University Press
Course in .(1986). Ferdinand de,Saussure .7
Open Court.General Linguistics

حوالہ جات

The: Semiotics. Daniel,Chandler .1
. 2017, Routledge.Basics
Course in . Ferdinand de,Saussure .2
. 1986, Open Court.General Linguistics
Collected . Charles Sanders,Peirce .3
Harvard University .Papers of Charles Sanders Peirce
.1958- 1931,Press
Hill . Mythologies. Roland,Barthes .4
. 1972,and Wang
.5 Gopi Chand,Narang . ساختیات، پس ساختیات اورمشرقی شعریات۔مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد،1990.
.6 Jameel,Jalibi . تجویراورمعنی۔انجمن ترقی اردو(ہند)، نئ دہلی.
Of . Jacques,Derrida .7
. 1976, Johns Hopkins University Press.Grammatology
A Theory of . Umberto,Eco .8
. 1976, Indiana University Press.Semiotics
The Limits of . Umberto,Eco .9
1990, Indiana University Press.Interpretation
.10 عتیق اللہ، ڈاکٹر. جدید ادبی نظریات. نئ دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 2011.

حالی کی نظم "''مناجات بیوہ'' کا تنقیدی وفکری جائزہ

حفصہ بیگ

لکچرر، شعبۂ اردو، کوویمپو یونیورسٹی، سیہادری کالج کیمپس، شیموگہ

مولانا الطاف حسین حالی انیسویں صدی کے اختتام پر منظر عام پر آنے والی ان اصلاحی تحریکات سے گہرے طور پر متاثر نظر آتے ہیں جن کا مقصد معاشرتی، تہذیبی اور فکری بیداری پیدا کرنا تھا۔ ان کی فکر میں ایک مصلح کی وہ تڑپ موجود ہے جو مظلوم و مجبور طبقے کے لیے درد دل رکھتی ہے۔ ان کی شعری کاوشیں محض تخیل کی پرواز نہیں بلکہ سچائی اور سماجی حقیقتوں کی ترجمان ہیں۔ خاص طور پر انہوں نے ان طبقات کی ترجمانی کی جو سماج میں دبے کچلے اور نظرانداز کیے گئے تھے، اور ان میں مسلمان بھی شامل تھے۔

حالی کی شاعری میں عورت کی مظلومیت کو اجاگر کرنے کی کوشش بار بار نظر آتی ہے۔ ان کی متعدد نظموں میں خواتین کی حالت زار، ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافی، ان کے حقوق کی پامالی اور بیوگی جیسے المیے کو خاص طور پر موضوع بنایا گیا ہے۔ حالی نے عورتوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی سی کے جذبے سے سرشار ہو کر نظمیں لکھیں۔ ان کا یقین تھا کہ اگر ہندوستانی معاشرے کو تہذیب اور تعلیم کی راہ پر گامزن کرنا ہے تو عورتوں کے جائز حقوق دینا ضروری ہے۔ انھوں نے عورت کی بے بسی، اس کے استحصال، اس کی محرومی اور اس کے اندرونی کرب کو اپنی نظموں کا موضوع بنا کر طبقۂ نسواں کے مسائل کو نمایاں کیا۔

اسی پس منظر میں حالی کی نظم "مناجات بیوہ" کو ایک اہم شعری دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ نظم سب سے پہلے 1884ء※ میں "صادم للذات" کے عنوان سے منظر عام پر آئی تھی اور بعد ازاں 1888ء میں اس میں کچھ ترمیمات و اضافات کے بعد "مناجات بیوہ" کے عنوان سے دوبارہ شائع کی گئی۔ اس نظم کو نہ صرف اردو بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا، جو اس کی اہمیت و اثر انگیزی کا بین ثبوت ہے۔ زیر مطالعہ اکائی میں اس نظم کے ابتدائی سات بند شامل کیے گئے ہیں، جو بارہ بندوں پر مشتمل مکمل نظم کا جزو ہیں۔ نظم مثنوی کی ہیئت میں ہے اور بیوہ عورت کے جذبات، کرب، بے بسی اور دعا کو نہایت مؤثر اور پراثر انداز میں پیش کرتی ہے۔

نظم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالی نے بیوہ کی زندگی کے رنج و غم، اس کی معاشرتی تنہائی اور جذباتی محرومی کو دل سے محسوس کیا ہے۔ ہر مصرع، ہر لفظ درد واثر سے لبریز ہے۔ حالی کی زبان میں سادگی کے ساتھ تاثیر کی گہرائی موجود ہے۔ نظم کی ابتدا میں بیوہ عورت اپنے رب کے حضور فریاد کرتی ہے۔ اس کی فریاد ایک سچے دل کی پکار ہے، جو دلوں کو ہلا دیتی ہے۔ بیوہ اللہ کی حمد و ثنا کرتی ہے، اُسے "اول و آخر"، "ہر جگہ حاضر و ناظر"، "سب سے زیادہ جاننے والا" اور "طاقتور ترین ذات" کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ وہ خدا کو ہر شے سے بلند تر اور ہر کیفیت سے باخبر تسلیم کرتی ہے۔ وہ اسے انوکھی، نرالی اور نادیدہ ذات کہتی ہے جو دکھائی تو نہیں دیتی مگر دلوں کو روشنی عطا کرتی ہے۔ وہ خدا جو اندھوں کو بینائی بخشتا ہے، لنگڑوں کو سہارا دیتا ہے، ٹوٹے دلوں کو جوڑتا ہے، بچھڑوں کو ملا دیتا ہے۔ وہی خدا جو انسان کے دکھ درد کا مرہم ہے، وہی جو سب کے دلوں میں بستا ہے، اور جو دور ہو کر بھی قریب تر ہوتا ہے۔

بیوہ کی مناجات میں خدا کی صفات کا بیان محض عقیدت کی جھلک نہیں بلکہ اُس کے وجود کی ہمہ گیریت اور انسان کے باطن میں اس کے قرب کی علامت بھی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ خدا تک پہنچنے کا راستہ اگر چہ تنگ و تاریک ہے، لیکن وہی ذات راہ حق کا عصا ہے۔ وہ مسکینوں کا سہارا، غمزدوں کا مونس، اور بے آسرا دلوں کی امید ہے۔ خدا کی یاد مصیبت میں سکون کا باعث ہے اور ہر غم میں اس کی طرف رجوع دل کو طمانیت عطا کرتا ہے۔ وہ بیماروں کی شفا اور بکھرے بازاروں کی رونق ہے۔ وہ ذات جو کھرے اور کھوٹے کو الگ کرتی ہے، جس کے خیال سے دل مطمئن ہو جاتا ہے۔

بیوہ عورت کی دعا کا اگلا مرحلہ مزید گہرائی اختیار کرتا ہے، جہاں وہ خدا کو بے وارثوں کا وارث اور بے سہاروں کی امید کہہ کر پکارتی ہے۔ اس کی نظر میں وہی واحد سہارا ہے جس کے ساتھ اگر کوئی ہو جائے تو پھر دنیا کی کسی اور شے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ وہ خدا جو ہر یتیم، دکھیارے، بیوہ اور مجبور کی نیا پار لگاتا ہے، جو مرض بھی دیتا ہے اور شفا بھی، جو زہر کو بھی امرت بنا دیتا ہے۔ اس کی یاد ہی دل کی بے چینی کو قرار دیتی ہے، اور اس کے عشق میں درد اور راحت کا ایک انوکھا امتزاج پنہاں ہے۔

حالی بیوہ کی زبان سے خدا کے ان پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں جو عام انسانی زندگی کے تجربات سے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ خدا جو دلوں کی آگ کو سرد کرتا ہے، جو درد کے لمحے میں سہارا بنتا ہے، جو بندے کو مصیبت کے وقت بھولا نہیں دیتا۔

نظم کے اگلے حصے میں بیوہ عورت خدا کی صفات کو ایک اور جہت سے بیان کرتی ہے۔ وہ اُسے "رحمت و ہیبت کی مالک"، "شفیق و مہربان"، اور رعب و جلال والی ہستی" کہتی ہے۔ وہ اسے ایسی ذات تصور کرتی ہے جس کا ادراک عقل سے پرے ہے، جس کے فیصلوں میں گہرے راز چھپے ہوتے ہیں۔ اس کے نزدیک وہی ذات ہر فرد کے حالات سے واقف ہے، وہی خوشی دینے

والی ہے اور وہی غم کا پیام لانے والی۔ کسی کو مسرتیں نصیب ہوتی ہیں تو کسی کے حصے میں آزمائش آتی ہے۔لیکن ان سب میں اللہ کی حکمت کارفرما ہوتی ہے۔ اس کی شان ہر لمحہ نئی ہوتی ہے۔اس کا حکم ہر گھر پر یکساں نہیں ہوتا۔ کہیں بہار ہے تو کہیں خزاں۔

دنیا کی ناہمواریوں کا ذکر کرتے ہوئے بیوہ عورت اس تضاد کو بیان کرتی ہے جہاں ایک جانب دولت کی فراوانی ہے اور دوسری طرف تنگدستی کی چکی میں پستے لوگ ہیں۔کوئی دنیا کی رنگینیوں میں ڈوبا ہے تو کوئی قطرہ آب کے لیے ترس رہا ہے۔کوئی موت کی تمنا کرتا ہے لیکن زندگی اسے چھوڑنے کو تیار نہیں، اور کوئی زندگی کے بوجھ سے تھک چکا ہے لیکن راحت سے محروم ہے۔ گویا دنیا میں سکون و بے سکونی، دولت و فقر، مسرت والم ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اور یہی زندگی کی حقیقت ہے۔

یقیناً " مناجات بیوہ " حالی کے ان اعلیٰ فکری، تہذیبی اور اصلاحی شعور کی آئینہ دار نظموں میں سے ایک ہے جس میں ایک بیوہ عورت کی زبانی اس کے دکھوں، اس کی فریاد، اور اس کے خدا سے تعلق کو اس فنکارانہ سادگی اور درد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ قاری صرف متاثر ہی نہیں ہوتا بلکہ جھنجھوڑا جاتا ہے۔ اس نظم کے ذریعے حالی نے نہ صرف طبقہ نسواں کی آواز بلند کی ، بلکہ اسے ایک فکری سطح پر معاشرے کا اہم اور حساس مسئلہ بنا کر پیش کیا۔

زندگی کی ناہموار راہوں، ناپائیدار امیدوں اور مسلسل کرب سے عبارت انسانی دنیا کا احوال کچھ ایسا ہے کہ گویا دکھ ہی اس کا سب سے قیمتی تحفہ ہو۔ یہاں کوئی بھی اس درد سے خالی نہیں جو فطرت انسانی کا حصہ بن چکا ہے۔مگر ان دکھوں کی نوعیت ہر ایک کے لیے جدا ہے۔کوئی ایک درد دوسرے کے ہم پلہ نہیں۔ دنیا کی یہ تکالیف ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں اور ہر ایک دکھ میں ایک الگ تپش، ایک منفرد تلخی چھپی ہوتی ہے۔اگر چہ ان زخموں کی شکل اکثر ناسور کی سی ہوتی ہے، لیکن وہ ایسے ناسور ہیں جو دق کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔یعنی ایسے امراض جن کا کوئی علاج نہیں، جو صرف جان لیوا ہی ہو سکتے ہیں۔

ایسے میں ایک انسانی دل روزانہ کی تکلیف کو کیسے برداشت کرے جبکہ اس کے سامنے امید کی کوئی شمع روشن نہ ہو؟ انسان مایوسی کے دھارے میں بہنے لگتا ہے، اور یہی وہ کیفیت ہے جہاں وہ انصاف کے لیے پکار اٹھتا ہے۔ بیوہ کی زبانی شاعر خدا کے حضور عرض گزار ہوتا ہے کہ اے عدل و انصاف کے مالک! جب جینے کی کوئی وجہ باقی نہ رہے، تب انسان کے لیے امید کا سہارا ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ بیشک دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو دل میں حسرتیں لیے سرگرم عمل رہتے ہیں، لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو ناامیدی کی تاریکی میں ڈوب چکے ہیں۔گو ان کی تعداد قلیل ہے، مگر ان کے درد کم نہیں۔

یہاں تک کہ وہ لوگ جن کی کھیتیاں ویران ہو چکی ہیں، اب بھی تیری رحمت سے بارش کے طلبگار ہیں۔ اساڑھ کا موسم آ چکا ہے، لیکن کچھ دل ساون کی رم جھم سے بھی مایوس ہیں۔جن کی فصلیں پیش از وقت ڈوب چکی ہیں، وہ باقی فصل کو اپنی تسلی کا سامان بنائے بیٹھے ہیں۔کوئی بیٹی یا بیٹے کی امید میں زندہ ہے، تو کوئی اپنی اولاد کی خوشیوں کے خواب سجائے ہوا ہے۔ زندگی خوشی ہو یا رنج، ہر حال میں انسان کسی نہ کسی امید کا دامن تھامے ہوتا ہے۔اور یہی امید، چاہے کتنی ہی مدھم کیوں نہ ہو، زندگی کو سہارا دیتی ہے۔وہ شخص بھی جو بظاہر غم سے آزاد نظر آتا ہے، درحقیقت کسی نہ کسی پوشیدہ دکھ میں مبتلا ہوتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے دل کبھی مایوس نہیں ہوتے اور جن پر زندگی کی سختیاں بھی کم وارد ہوتی ہیں۔اور پھر کچھ ایسے ہیں جو صرف سنے جانے کی امید پر جیتے ہیں۔ لہٰذا جب انسان کو غرق ہوتے ہوئے ایک کنارے کی جھلک بھی نظر آئے، تو وہی جھلک اس کی رہائی کی نوید ابن جاتی ہے۔ امید کی ایک کرن کتنی بڑی نجات ثابت ہو سکتی ہے۔

اب شاعر بیوہ کے دل میں چھپی کلفت، اس کی اذیت ناک زندگی اور اس کی ختم نہ ہونے والی تکلیف کا نقشہ کھینچتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ مصیبت جو راحت کی کوئی جھلک نہ دکھائے، اس کا کیا مداوا ہو سکتا ہے؟ اگر کسی مسافر کی منزل ہی گردن کٹوانے کے بعد ملے، تو وہ سفر خوشی کا باعث کیسے بنے؟ جن بچھڑوں کو دنیا کبھی دوبارہ ملنے کا موقع نہ دے، ان کے دلوں کو کون تسلی دے سکتا ہے؟ بیوہ کی زندگی پر جو آفت تقدیر کے نام پر نازل ہوئی ہے، وہ کوئی ایسی شے نہیں جو کسی تدبیر یا دعا سے ٹالی جا سکے۔

یہ دنیا بے شمار بہاروں، جھولوں، چاندنی راتوں اور برساتوں کا گہوارہ بنی رہی، مگر بیوہ کے دل کی وہ ایک کلی جو مرجھا چکی ہے، وہ کبھی نہ کھل سکی۔ یہی دنیا امیدوں کا دوسرا نام ہے۔ جب امید ہی بجھ جائے تو کچھ باقی نہیں بچتا۔ بیوہ کا غم ایک پردیسی کی سی کیفیت رکھتا ہے، جسے معلوم ہے کہ اب کچھ حاصل نہیں ہوگا۔اسے ان بدنصیبوں پر رونا آتا ہے جنہیں ان کے اپنے وطن سے نکال دیا گیا ہو۔مگر چونکہ سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے، اس لیے وہ کڑوا گھونٹ بھی قبول ہے، جو تقدیر کے ہاتھوں پلایا گیا ہو۔

بیوہ کہتی ہے کہ جب پتہ ہوا کے رحم وکرم پر ہو، تو اسے روکنے کا کوئی زور کام نہیں آتا۔اسی طرح جب تقدیر میں جدائی لکھ دی جائے، تو کوئی تدبیر اس کو روک نہیں سکتی۔ اگر مصیبت عارضی ہو تو اس کا کوئی حل نکالا جا سکتا ہے، مگر جو دکھ ہمیشہ سے لکھا گیا ہو، وہ کسی دعا سے دور نہیں ہوتا۔اے اللہ! تیری رضا کے بغیر کچھ ممکن نہیں۔ انسان بے بس ہے، کچھ نہیں کر سکتا۔تو دکھ دیتا ہے اور پھر اس دکھ میں انسان کو سہارا دے کر رونے بھی نہیں دیتا۔

بیوہ خدا کو مخاطب کر کے کہتی ہے کہ وہی ہے جو مصیبتوں میں گھرے ہوئے کو تھپک کر سلا دیتا ہے، اور جس کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ اگر کوئی تیرے دائرے سے بھاگنا بھی چاہے تو کہاں جائے؟ چاروں طرف سے راستے بند ہیں۔ وہی ماں کی مانند ہے جو اپنے بچے کو مارتی بھی ہے، مگر بچہ ماں ماں ہی پکارا کرتا ہے۔ بیوہ اپنے آپ کو اسی بچے کی مانند تصور کرتی ہے۔

نظم کے اس حصے میں حالی بیوہ کی زبان سے اس کی عاجزی، اس کی

24

گریہ وزاری اور بے بسی کا مزید شدت سے اظہار کرتے ہیں۔ بیوہ اپنی فریاد میں خدا کی قدرت، اس کی سلطنت، اور اس کے علم کے آگے سر جھکاتے ہوئے عرض کرتی ہے کہ اے میرے پروردگار! میں ایک دکھیاری، تیری بے بس بندی، تیری دہلیز پر بھکاری بنی بیٹھی ہوں۔ موت میری خواہش بن چکی ہے، کیونکہ زندگی میرے لیے اذیت کا دوسرا نام بن گئی ہے۔

اپنے اور بیگانے سب نے مجھے ٹھکرادیا ہے۔ میں اپنے میکے اور سسرال دونوں کے لیے بوجھ بن چکی ہوں۔ زندگی کی آزمائشوں نے مجھے تھکا دیا ہے۔ میرے دل میں جتنے داغ ہیں، ان کا بیان میرے الفاظ سے باہر ہے۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتی، مگر تو، اے رب، میرے دل کے رازوں سے باخبر ہے۔ ابھی شادی کے جشن کی بازگشت بھی باقی نہ تھی کہ غم کے بادل چھا گئے۔ خوشی کی جگہ دکھ نے لے لی، اور وہ بھی ایسا جو کبھی رخصت نہ ہوا۔ ایک خوشی آئی ضرور، لیکن ساتھ میں وہ ایسا درد دے گئی جو ساری زندگی پر محیط ہو گیا۔ ایک ہنسی ایسی برسی جو غم کی اندھی بن گئی۔ شادی کی پرچھائیں تک نے میری زندگی میں اجالا نہ ہونے دیا۔

اب حالت یہ ہے کہ دل میں اتنی گھٹن ہے کہ آنسو بھی نہیں بہہ سکتے۔ اگر رونا چاہوں تو کہاں تک روؤں؟ اگر ہنسنے کی کوشش کروں تو دل کیسے بہلے؟ پیاس بجھانے کا کوئی وسیلہ نہیں۔ اکیلا انسان آخر کب تک جیے؟ کس سے دل لگائے؟ جنسی تنہائی میں کیسی؟ آنسو کس کے سامنے بہائے؟ جب سوتی ہوں تو نہ سرہانے کل ہوتا ہے نہ پاسکتی کل۔ بیداری بھی لاحاصل لگتی ہے، اور آخر کار جب بیداری بھی حد سے گزر جائے، تو موت ہی چین دیتی ہے۔ اب زندگی سے ایسی وحشت ہو چکی ہے کہ بولنا بوجھ لگتا ہے، کام کرنا عذاب معلوم ہوتا ہے، اور طبیعت ہمیشہ پژمردہ سی رہتی ہے۔ اتنی آبادی کے باوجود دنیا سنسان جنگل محسوس ہوتی ہے۔ میری پوری جوانی خوف و دہشت میں کٹی دن کی روشنیاں بھیانک تھیں اور راتیں بھی ڈراونی۔

زندگی کی وہ تنگ و تاریک گلیاں جن میں روشنی کی کوئی کرن نہ ہو، اور دل کو بہلانے والا کوئی چہرہ، کوئی لمحہ باقی نہ رہے، ایسی کیفیت میں ایک بیوہ عورت کا دکھ کسی گہرے اندھیرے کنویں کی مانند محسوس ہوتا ہے۔ گہرا، خاموش، لیکن اندر سے چیختا ہوا۔

وہ بچپن کی ہم جولی بہنیں اور ہم دم سہیلیاں جن کے ساتھ زندگی کے ابتدائی دن جنسی خوشی بیتے تھے، اب محض آنے اور رو کر چلے جانے والی سائے بن چکی ہیں۔ وہ دل جن کے ساتھ کبھی خوشی سے دھڑکتا تھا، اب صرف تماشائی بنے، آنکھوں کے کناروں سے آنسو بہا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ بیوہ کے پاس اب کوئی سامان تسلی باقی نہ رہا، لیکن حیرت یہ کہ پھر بھی بلاوا نہیں آتا۔ گویا دکھ بھی جب حد سے بڑھ جائے، تو آنکھ کے آنسو تھم جاتے ہیں، اور انسان اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

وہ خاموشی، جو اس کے وجود پر مسلط ہے، کسی نے محسوس نہیں کی۔ نہ کسی نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ روز کیسے جیتی ہے، کس آگ میں سلگتی ہے، اور کیسی درد بھری چنگاری اس کے اندر پل رہی ہے۔ لوگ خوشی کی تقریبات، شادیوں اور تہواروں میں مصروف ہیں، مگر کوئی اس دل کی اجاڑ کیفیت کا حال جاننے والا نہیں۔ بہار کی ہوائیں ہوں یا ساون کی گھٹائیں، چاندنی راتیں ہوں یا جشن کا سماں یہ سب اب محض ایک تماشا ہیں، کیونکہ دل کی خوشی کے بغیر یہ سب پھیکے رنگ معلوم ہوتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ خوشی کے وہ لمحے صرف اسی دل پر نازل ہوتے ہیں جو خود خوش ہو۔ ورنہ وہی لمحے جو کسی کے لیے مسرت کی نوید ہوتے ہیں، کسی دوسرے کے لیے درد کا ایک نیا باب کھول دیتے ہیں۔ اگر بارش ہو اور محبوب پردیس میں ہو تو وہ برسات رحمت نہیں رہتی، بلکہ اذیت بن جاتی ہے۔

بیوہ کی زندگی کے دن اس پنچھی کی مانند گزرے جو پنجرے میں قید ہو، جس کے پاس پر تو ہوں لیکن وہ اڑ نہ سکے۔ اگرچہ دنیا اسے خوشی کا ایک حصہ سمجھتی ہے، مگر اس کے لیے وہ خوشی صرف بوجھ بن گئی۔ اس نے امید باندھی، مگر وہ امید ریت پر لکھی تحریر نکلی کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ زندگی میں بہار کے کچھ لمحے ضرور آئے، مگر وہ ایسے تھے جیسے کھلا ہوا پھول بغیر پھل دیے جھڑ جائے، یا چاند دکھائی دے مگر عید نہ ہو۔ وہ اس پھل کے لیے برچھی کھا گئی، لیکن پھل نصیب نہ ہوا۔ ریت کے ذرات کو پانی سمجھ کر دوڑی، مگر قریب جا کر پتہ چلا کہ وہ سراب تھا۔

اس گہرے کرب کے اظہار کے بعد حالی، نظم کے اگلے بند میں بیوہ کے ذریعے ایک بار پھر ذات باری تعالیٰ کو مخاطب کرتے ہیں۔ وہ عرض کرتی ہے کہ اے دین و دنیا کے مالک، تو ہی طاقتوروں اور کمزوروں کا پالنے والا ہے۔ تیری سلطنت سب پر حاوی ہے، اور تیری بخشش تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔ ہندو ہو یا مسلمان، چرند ہو یا پرند، قوی ہو یا ضعیف سب تیری رحمت سے فیض یاب ہیں۔

لیکن وہ بدنصیب جن کے مقدر میں کچھ نہیں لکھا گیا، وہی تیری رحمت سے محروم رہ جاتے ہیں، ورنہ تو نے تو کسی پر اپنا دروازہ بند نہیں کیا۔ گلہ تو تب کیا جائے جب در بند ہوں۔ یہاں تو بارش ہو رہی ہے، مگر زمین ہی بنجر ہے۔ تو نے کانوں میں ہیرے دیے، سیپ میں گوہر رکھے، درختوں میں پھول اگائے، شہد کی مکھی کو مٹھاس عطا کی، جگنو کو روشنی بخشی اور ذروں کو چمک عطا کی۔ تو نے ہر چیز کو عطا کیا، لیکن میری جھولی خالی رہی۔ اور جب جھولی خالی ہو تو قصور بارش کا نہیں ہوتا، زمین کی شامت کہی جاتی ہے۔ تیری نعمتوں کی فراوانی کے باوجود میں خالی ہاتھ ہوں، لیکن یہ میری قسمت کی لکیر تھی، تیری بخشش میں کمی نہیں۔ میں تیری زمین پر، تیری سلطنت میں بھوکی سو رہی ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ جب مجھے کچھ ملنا ہی نہ تھا تو مجھے اس دنیا میں بھیجا ہی کیوں گیا؟ اعضاء عطا کیے، مگر ان سے فائدہ نہ اٹھا سکی۔ گنگا بہتی رہی، مگر میں پیاسی رہی۔

چین و سکون مجھ سے چھن گیا ہے۔ میرا وجود بے کار ہو چکا ہے، نہ

25

کسی کے کام آسکتی ہوں ، نہ اپنی کوئی قدر باقی رہی۔سب نے منہ موڑ لیا۔ میرے اپنے بھی بیگانے ہو گئے۔ اگر چہ میرا خاندان مکمل ہے ساں، باپ، بھائی، بہن سب موجود ہیں۔مگر کسی کو میری فکر نہیں۔

رشتہ دار، عزیز، سب نے مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے۔اب میں ایک سونے گھر میں پڑی ہوں، بے یارو مددگار۔

کبھی کبھی کوئی شخص، جس کے دل میں ابھی خوفِ خدا باقی ہے، میری خبر لے لیتا ہے۔مگر اکثر اوقات تنہائی ہی میری رفیق رہتی ہے۔جس پر تقدیر کی مار ہو، وہ کس در کی پناہ میں جائے؟ اگر مجھے بھی سکون و عافیت میسر ہوتا تو یوں در در کی ٹھوکریں نہ کھاتی۔اور جب مصیبت کا وقت آتا ہے تو سچ یہی ہے کہ ماں، باپ، بھائی، بہن۔سب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ایک فقیر کی بات یاد آتی ہے:" خوشی میں سب دوست ہوتے ہیں، دکھ میں کوئی اپنا نہیں ہوتا۔

بیوہ کی زبان سے نکلی یہ آہ کہ ”میرے حال کی گواہی دینے والا تیرے سوا اور کون ہے؟ ایسی ایکار ہے جو صرف انسان کے سماعتی نظام تک نہیں بلکہ دل کے تاروں کو چھیڑ دیتی ہے۔وہ درد میں ڈوبی ہوئی روح خدا کے حضور فریاد گزار ہے کہ اپنی دکھ بھری کہانی وہ آخر کس سے بیان کرے؟ وہ دعا کرتی ہے کہ اللہ نہ کرے کوئی دشمن بھی ایسی اذیت سے دوچار ہو، جیسی تنہائی، بیگانگی اور طعن وملامت کی صورت میں اُسے جھیلنی پڑی ہے۔خاندان کے ہر فرد نے اسے اس طرح نظر انداز کیا گویا وہ بدشگونی کی مجسم علامت بن چکی ہو۔اس بے چارگی کی شدت اس حد تک ہے کہ وہ مرنے کی تمنا کرنے لگتی ہے، کیونکہ اس کا وجود دوسروں کے لیے محض ایک بوجھ بن چکا ہے۔

گھر کا ماحول ایسا بن چکا ہے کہ اس کے آنسو سب کو تکلیف دیتے ہیں، اور ہنسی بھی لوگوں کو ناگوار گزرتی ہے۔ وہ نہ میکے میں آسرا پاتی ہے اور نہ سسرال میں ٹھکانہ۔کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں وہ سکون کا سانس لے سکے۔ وہ زیب وزینت کی چیزوں سے بھی منہ موڑ چکی ہے، عطر، سرمہ، کنگھی چوٹی، بندے، چوڑیاں سب ترک کر دی ہیں، کیونکہ وہ جانتی ہے کہ بیوہ پر یہ سب زیب نہیں دیتا۔اپنی حیثیت کو وہ مٹا چکی ہے، اس کے باوجود ہر طرف سے اسے منحوس اور بدنصیب قرار دیا جا رہا ہے۔دنیا کا مزاج ایسا ہے کہ بدکار سے تو لوگ درگزر کر لیتے ہیں، مگر بدنام کو معاف نہیں کرتے۔

دنیا کے تیز وتند طعنے اس کے دل کو چیر کر رکھ دیتے ہیں۔وہ پکار اٹھتی ہے: کاش! اس کی ماں نے اسے جنم ہی نہ دیا ہوتا۔اے وہ ذات جو مصیبت زدوں کی پناہ گاہ ہے، اور جو طوفان میں گھری کشتی کو ساحل تک پہنچا سکتی ہے، میری کشتی بھی بگولوں میں ہے اور ہر لمحہ غرق ہونے کو ہے۔بس تو ہی ہے جو مجھے نجات دے سکتا ہے۔

اس کے بعد بیوہ فطرت کی اشیاء آسمان، تارے، در و دیوار، راتیں، فرشتے، اعضائے جسم سب کو مخاطب کر کے کہتی ہے کہ اس فانی دنیا سے ہر ایک کو جانا ہے، اور ایک دن سب کو مالک حقیقی کے حضور کھڑا ہونا ہے، جہاں اعمال کا حساب ہوگا اور سچائی کی گواہی دینی ہوگی۔ وہ ان تمام گواہوں سے التجا کرتی ہے کہ جب اس کی باری آئے، تو انصاف سے کام لیں۔ وہ کوئی دعویٰ معصومیت نہیں کرتی، کیونکہ وہ جانتی ہے کہ غلطی انسان کی فطرت میں شامل ہے، چاہے وہ کوئی ولی ہو یا پیغمبر۔مگر اتنا ضرور کہتی ہے کہ جس کے ساتھ قسمت نے باندھا، اُس کا ساتھ اخر دم تک نبھایا۔نہ قوم سے غداری کی، نہ وطن سے منھ موڑا، اور نہ رب کے عہد سے انکار کیا۔دنیا یقین کرے یا نہ کرے، وہ پروا نہیں کرتی، کیونکہ اس کا محافظ خود خدا ہے۔

بیوہ کا ایمان اپنی پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ دلوں کا حال صرف خدا جانتا ہے۔وہ کہتی ہے کہ دنیا والوں کی باتوں میں آکر وہ دھوکا کھا گئی، اور اگر خالصتاً خدا کے احکام پر عمل کرتی تو آج راحت وسکون کی زندگی گزار رہی ہوتی۔

یہاں حالی، بیوہ کی زبان سے اس قوم کے چہرے سے نقاب ہٹاتے ہیں جو بیوہ کے لیے نکاح ثانی کو معیوب سمجھتی ہے۔وہ سماج جو بیوہ کو متاع دنیا سے محروم رکھ کر، رسم ورواج کی زنجیروں میں جکڑ کر زندہ درگور کر دیتا ہے۔وہ عورت، جس نے اپنی عصمت و وفاداری کو اپنی کل کائنات بنایا، ساری عمر اپنی پاکدامنی کا ثبوت دینے میں گزار دیتی ہے۔قوم کی ریا کار روایتوں نے اس کی سانسوں کو قید کر دیا ہے۔اس کی زندگی ایک ایسی مجبوری بن گئی ہے " جس سے نجات کی کوئی راہ باقی نہیں۔اور واقعی، ایک شہزادی نے سچ ہی کہا تھا کہ ”لاچاری پہاڑ سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔

اب شاعر بیوہ کی زبان سے خودی اور خطا کے احساس کو بیان کرتا ہے۔وہ کہتی ہے کہ چونکہ میں بھی مٹی اور پانی سے بنی ہوں، اس لیے مکمل پاک نہیں ہوسکتی، مگر پھر بھی میں نے حتی المقدور اپنے اعضاء کو گناہ سے بچایا۔کسی غلط قدم کی طرف نہ بڑھی، خواہش کو قابو میں رکھا، اور اپنی بیوگی کے ہر لمحے کو صبر سے گزارا۔مگر دل پر قابو پانا مشکل تھا، اور اے خدا! تو تو دلوں کے راز جانتا ہے۔ میری حالت اس مچھلی کی طرح تھی جو ریت پر تڑپتی ہے، نہ مر سکتی ہے، نہ جی سکتی ہے، نہ دھوپ سے بچ سکتی ہے۔ایسی بے چینی، ایسی کرب ناکی میں بھی میں نے خود کو گمراہی سے روکے رکھا۔بیوہ آخر میں کہتی ہے کہ وہ صرف اپنے غم کی نہیں، بلکہ ان تمام عورتوں کی نمائندگی کر رہی ہے جو اس سماج کے ستم کی شکار ہیں۔وہ جو سہاگ سے پہلے ہی بیوہ ہوگئیں، یا جن کی شادی کے بعد بھی تنہائی مقدر بنی رہی، وہ جو دل میں ارمان لیے بلکتی رہیں، مگر ان کے انسو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔جنہیں دل کی چوٹ نے جکڑ رکھا ہو، وہی ان کے درد کو سمجھ سکتے ہیں۔باقی دنیا تو ریت کی دیوار ہے۔اور سچ یہی ہے کہ عورت کی اصل راحت اس کے سہاگ سے وابستہ ہے۔جیسے ناو؟ کو کنارہ درکار ہوتا ہے، ویسے ہی عورت کو سہاگ کی پناہ چاہیے۔ یہ زمانہ ہمیشہ سے ایسا ہی چلا آیا ہے۔کہیں کسی کی جیت ہے، تو کہیں کسی کی بار۔

اس نظم کے اختتام پر بیوہ اپنے دل کو رب کے حضور جھکا دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اے اللہ تو ہی وہ ہستی ہے جو ابد الآباد تک باقی رہے گی، باقی سب

26

مٹ جانے والے ہیں۔ میں کسی اور کی چاہ نہیں رکھتی، صرف تیری محبت ہی میرے لیے کافی ہے۔ مجھے ایک ایسا گھونٹ پلا دے کہ تیرے سوا ہر شے کو بھول جاؤں۔ میرا دل تیرا مسکن بن جائے اور میرے غم تیرے نور میں گھل جائیں۔

مولانا الطاف حسین حالی کی نظم مناجات بیوہ اردو ادب میں ایک ایسی فکری، تہذیبی اور جذباتی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جس میں ایک بیوہ عورت کی درد بھری پکار کے ذریعے نہ صرف اس کے ذاتی دکھوں کا بیان کیا گیا ہے بلکہ پورے معاشرے کی خاموش بے حسی، ظالمانہ رسم ورواج، اورعورت کی مظلومیت کو آئینے کی طرح صاف اور دل سوز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظم حالی کی اصلاحی فکر، ان کی سماجی بصیرت اور ان کے گہرے جذبہ ہمدردی کا نہایت جاندار مظہر ہے۔

حالی نے اس نظم میں بیوہ عورت کی زندگی کی تلخیوں، اس کی بے بسی، اوراس کی کٹی پھٹی امیدوں کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ہر شعر میں درد کا ایک نیا باب کھلتا ہے۔ نظم کے آغاز میں بیوہ کی زبان سے اللہ کی حمد بیان کر کے حالی نے اس کی فریاد کو نہایت بلیغ اور پاکیزہ انداز بخشا ہے۔ خدا کی ذات کو ہر درد کا مداوا، ہر اندھیرے کا اجالا اور ہر بے سہارا دل کی پناہ گاہ قرار دیتے ہوئے بیوہ کی مناجات اس
درجے کی صداقت اختیار کر لیتی ہے کہ قاری بے اختیار اس دکھ میں شامل ہو جاتا ہے۔

نظم کے مختلف حصوں میں بیوہ کی زندگی کے کربناک لمحات جیسے شوہر کی ناگہانی موت، سماج کے طعنوں، بناؤ سنگھار سے پرہیز، گھٹ گھٹ کر جینے اور خوشیوں سے منھ موڑنے کا عمل، ایک طویل چیخ کی صورت ابھرتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کو ایک ایسی پیاسی زمین سے تعبیر کرتی ہے جو بارش کی ہر بوند کو ترستی ہے، اور اگر بارش آ بھی جائے تو بھی وہ زمین اپنی بنجر قسمت کے باعث سیراب نہیں ہو سکتی۔ حالی کی زبان میں جو سادگی ہے، وہی اس نظم کی سب سے بڑی قوت ہے۔ یہی سادگی اسے بنا تصنع کے دل کی گہرائیوں تک اتار دیتی ہے۔

حالی کا کمال یہ ہے کہ وہ بیوہ کے درد کو ذاتی دکھ کے دائرے تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اس کے ذریعے پورے سماج کے اس ظالمانہ نظام پر ضرب لگاتے ہیں جو عورت کے دکھ کو بے آواز بناتا ہے۔ بیوہ کی زبان میں جو التجا ہے، وہ دراصل ہر اس عورت کی پکار ہے جس کا سہاگ اجڑ گیا، جس کے حصے میں صرف سسکیاں اور تنہائیاں آئیں، اور جو جیتے جی اپنی ذات کو دفن کر کے جیتی رہی۔ نظم کے آخری حصے میں بیوہ کی یہ فریاد ایک اجتماعی نالہ بن جاتی ہے۔ ایسا نالہ جو صرف اس کی نہیں بلکہ لاکھوں مظلوم عورتوں کا ہے۔

یہ نظم اپنے اسلوب میں مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہے، لیکن اس میں جو دلگیری، جو روحانی سوز، اور جو فکری بیداری ہے، وہ اسے محض ایک منظوم کلام کے بجائے ایک زندہ سماجی دستاویز بنا دیتی ہے۔ یہاں ہر بند میں ایک بیوہ کے دکھوں کے ساتھ ساتھ ایک حساس ذہن کی اواز ہے جو انصاف، احترام اور زندگی کے بنیادی حق کے لیے سراپا دعا ہے۔

اس نظم کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ کسی فرد واحد کی داستان نہیں بلکہ ایک پورے طبقے کی صدائے احتجاج ہے۔ ایسی پکار جو در قدرت پر دستک دیتی ہے، اور اسی در سے جواب کی امید بھی رکھتی ہے۔ حالی نے جس دردمندی سے بیوہ کی زبان میں پورا دکھ بیان کیا ہے، وہ اس نظم کو صرف ادب نہیں بلکہ ایک روحانی وسماجی فریضہ بنا دیتی ہے۔

مناجات بیوہ فقط ایک نظم نہیں بلکہ ایک بیوہ کی خاموش آہوں کو زبان دینے والا وہ رزمیہ ہے جو آج بھی ہر اس دل کو جھنجھوڑتا ہے جو سماج کے جھوٹے اصولوں میں عورت کی مظلومیت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ یہ نظم اپنے دور کے لیے ہی نہیں، آج کے لیے بھی ایک پیغام ہے۔ عدل، ہمدردی اور انسانی احترام کا پیغام۔

Hafsa Baig
Lecture, Dept of PG Studies & Research in Urdu, Kuvempu University, Sahyadri College Campus,
Shivammoga. Karnataka. India
Mobile no: 7022501540
Email:hafsabaig2708@gmail.com

27

قرۃالعین حیدر

اردوادب کی ورجیناوولف)

ڈاکٹراسمٰی کوثر

لکچررشعبۂ اردوکووئمپو یونیورسٹی،سہیادری کالج کیمپس،شیموگہ۔

گیارہ سال کی عمر سے ہی کہانیاں لکھنے والی قرۃ العین حیدرکواردوادب کی ''ورجیناوولف'' کہا جاتا ہے۔انہوں نے پہلی بار اردوادب میں سٹریم آف کونشئینسر اتکنیک کا استعمال کیا تھا۔اس تکنیک کے تحت کہانی ایک ہی وقت میں مختلف سمت میں چلتی ہے۔

قرۃ العین حیدر 20رجنوری 1926ء میں اتر پردیش کے شہر علی گڑھ میں پیدا ہوئی۔ان کے والد سجاد حیدر یلدرم اردو کے افسانہ نگار شمار کیے جاتے ہیں۔تقسیم ہند کے بعد قرۃ العین حیدر کا خاندان پاکستان چلا گیا۔1959 میں ان کا ناول '' آگ کا دریا'' منظر عام پر آیا جس پر پاکستان میں بہت ہنگامہ ہوا۔اس کے فورا بعد انہوں نے بھارت واپس جانے کا فیصلہ کیا جہاں وہ بطور صحافی کام کرتی رہیں اور افسانے اور ناول بھی لکھتی رہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے ادبی تراجم بھی کیے۔ان کی کتابوں کی تعداد 30 سے زیادہ ہے۔انہوں نے 1964ء تا 1968 ماہنامہ امپرنٹ کی ادارت کی اور السٹرئیڈ ویکل آف انڈیا میں اداریہ لکھتی رہیں۔ان کی کتابیں انگریزی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ان کے سبھی ناول اور کہانیوں میں تقسیم ہند کا درد صاف نظر آتا ہے۔ان کے دو ناولوں '' آگ کا دریا'' اور آخر شب کے ہم سفر کو اردو ادب کا شاہکار مانا جاتا ہے۔آخر شب کے ہم سفر کے لئے 1989 میں انہیں بہارت کے سب سے باوقار ادبی اعزاز گلیان پیٹھ انعام سے بھی نوازا گیا۔جب کہ بھارتی حکومت نے انہیں 1985 میں پدم شری اور 2005 میں پدم بھوشن جیسے اعزازات بھی دیے۔ان کی وفات 21 اگست 2007 کو نوئیڈا میں ہوئی اور جامعہ اسلامیہ کے قبرستان میں مدفون ہویں۔

قرۃ العین حیدر بھی اردو کی ایک اہم فکشن نگار تھیں۔ان کا نام اردو کے بڑے لکھنے والوں میں شامل ہے۔وہ بہت آسان سادہ ،رواں دواں زبان میں لکھتی ہیں۔انہوں نے زیادہ تر شمالی ہندوستان کے تعلیمیافتہ متوسط طبقے اور ہماری مشترکہ تہذیب کی کہانیاں لکھی ہیں۔قرۃ العین حیدر ایک اچھی صحافی بھی تھیں۔لیکن ان سب کے باوجود ان کی شہرت ناول اور کہانیاں لکھنے کی وجہ سے ہوئی۔ان کا پہلا ناول ''میرے بھی صنم خانے '' 1949 میں شائع ہوا۔اور باقی کے پانچ ناول ،سفینۂ غم دل ،آگ کا دریا ،آخر شب کے ہم سفر ،گردش رنگ چمن ،چاندنی بیگم ہیں۔ان کے چار افسانوی مجموعے ہیں اور اس کے علاوہ انہوں نے کچھ ناولٹ بھی لکھے۔

قرۃ العین حیدر کے تمام ناول غیر معمولی علمی تحقیق اور چھان بین کا پتہ دیتے ہیں اور فکشن کی روایت میں اسے ایک نئے تخلیقی ضابطے ،ایک نئی شعریات ،ایک نئی فنی تشکیل کا اہتمام کہا جا سکتا ہے۔قرۃ العین حیدر ناول اس طرح لکھتی ہیں جیسے ٹاؤن پلاننگ کے عمل سے گذر رہی ہوں۔بڑے پیمانے پر ایک پوری بستی کا خاکہ ترتیب دے رہی ہوں۔اور اس سے بستی کے قیام کا مقصد، اصول اور معیار بھی ان پر کسی جماعت ،گروہ ،نظریے کی طرف سے عائد نہیں ہوتے۔یہ ایک گہری وجودی اور شخصی سرگرمی کی سطح ہوتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کے یہاں علمی تجسس،اور تماش بینی کے عناصر باہم آمیز ہو گئے۔ان کے سنجیدہ سروکاروں سے ان کی خوش طبعی اور الگ کرنا آسان نہیں ہے۔یہ ایک عجیب وغریب مرکب ہے۔جس کی تہہ سے ظہور پذیر ہونے والی دنیا صرف ہزیمتوں اور اداسیوں کی دنیا نہیں ہے۔یہاں کے اظہار کی صورتیں بھی بار بار رونما ہوتی ہیں۔(Rony) زندہ دلی ،شگفتگی اور رویہ،قرۃ العین Ronkal ایک گمبھیر انسانی صورت حال کے تئیں یہ حیدر کے مجموعی شعور کا ناگزیر حصہ ہے۔

وجود انسان دوستی کا یہ رنگ قرۃ العین حیدر کی بنیادی پہچان کی حیثیت رکھتا ہے۔اور اس سطح پر انکا رویہ وہی ہے جو آج کی دنیا کے تمام اہم لکھنے والوں کا رویہ کہا جا سکتا ہے۔مذہب اور سیاست سے غیر متوازن وابستگی، شخص اور قومی مفادات سے بے تحاشا شغف نے ہمارے چاروں طرف دہشت اور تنگ نظری کا جو ماحول پیدا کیا ہے۔اس سے لاتعلق رہ کر ہم اپنے ادب اور اپنی تخلیقیت تو کیا اپنی انسانیت کا تحفظ بھی نہیں کر سکتے۔قرۃ العین حیدر کے یہاں تہذیبی حوالوں اور ان کی اجتماعی یادداشت کے پس منظر میں خاص کر '' آگ کا دریا'' کے بعد منظر عام پر آنے والے افسانوں اور ناولوں کو ایک بندھے ٹکے اور سکہ بند قسم کے قومی تصور کے مطابق سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

بہ قول فتح محمد ملک

''قرۃ العین حیدر نے ہمارے فکشن کو گہرے انداز سے سوچنا سکھایا''

بے شک قرۃ العین حیدر کے افسانوں اور ناولوں کا
ایک اہم عنصر عصر رواں کے شور شرابے اور انتشار کی فضا میں گم شدہ وقت کی تلاش سے عبارت ہے۔ یہ تلاش ہمیں انتظار حسین کے یہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔لیکن زندگی کو اس کے رنگا رنگ اسالیب، سطحوں اور فصلوں کے ساتھ قبول کرنیوالے کسی بھی ذمہ دار لکھنے والے کے یہاں اجتماعی یادداشت فرقہ وارانہ، مسلکی اور مکانی ومقامی بنیادوں پر استوار نہیں ہوتی۔قرۃ العین حیدر کا تخلیقی طریق کاریوں بھی امتزاجی ہے۔اردو فکشن کی تاریخ میں قرۃ العین حیدر کے ناولوں کی جیسی کہیں اور جو نہیں ملتی تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ Rangeوسعت، بہاؤ اور پرانے داستان گویوں کی طرح وہ بات سے بات نکالتی جاتی ہیں اور زندگی کے بہ ظاہر ایک دوسرے سے مختلف اور غیر مربوط تماشوں کو ایک مالا میں پروتی جاتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے تخلیقی سفر کی رفتار، ان کی تقلید
کرنے والوں کے مقابلے میں ہمیشہ بہت تیز رہی ہے۔چنانچہ ''ستاروں سے آگے'' اور شیشے کے گھر کا استعاراتی اور علامتی اسلوب اور ان مجموعوں میں شامل کہانیوں کا غنائی اور نیم شاعرانہ آہنگ، ہمارے یہاں ان مجموعوں کی اولین اشاعت کے بہت دنوں بعد ایک نئی حسیت کی تشکیل اور جدیدیت کے میلان کی اجتماعی قبولیت کے دور میں عام ہوا ''ستاروں کے آگے'' اور ''شیشے کے گھر'' کو اردو کی نئی کہانی کا رول ماڈل اسی لئے کہا گیا ہے۔کہ ان کہانیوں میں بہ قول محمود ایاز، انسانی روح کی تنہائی اور دکھ کے مسئلے کو معاصر عہد کی ذہنی اور جذباتی حقیقتوں کے سیاق میں پہلی بار ایک اجتماعی المیے اور آشوب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

انسانی روح کی تنہائی، دکھ کی ازلی اور ابدی سچائی
، وقت کا بوجھ اور جبریت بکھراؤ اور موت کا ناگزیر تماشا جو ہر زندگی کا عقبیٰ پرندہ کہا جاسکتا ہے اور ہر انسانی جدوجہد کا انجام، یہ آرٹ اور ادب کی عمومی روایت کا آسیب یا انہی انسانی ہستی کا محور کہنا چاہئے کہ زندگی کا ہر Obessims منظر نامہ اسی غم آلود دائرے کے گرد مرتب ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرۃ العین حیدر سے پہلے اور ناول کی
روایت میں اس رویے کی نشانات تقریباً تقریباً معدوم ہیں۔لیکن مغربی دنیا، جہاں ایک صنف کے طور پر ناول کے پاؤں جمے، وہاں تقریباً ہر بڑی زبان کے ادب میں اجتماعی تجربوں، روایتوں اور تاریخ وسوانح سے متعلق ماخذ نے ناول کے لیے بنیادی مواد فراہم کیا ہے۔قرۃ العین حیدر کی ''مشرقیت'' ان کا اجتماعی ماضی، ان کے احساسات کے گرد کسی طرح کا حصار نہیں کھینچے۔چنانچہ ان کا شعور مشرق ومغرب کے محدود تصور کی گرفت سے حیرت انگیز حد تک آزاد ہے۔

انکی بصیرت یکساں آزادی کے ساتھ مشرق اور
مغرب دونوں دنیاؤں میں سفر کرتی ہے۔ان کا طرز احساس اور ان کے اسالیب اظہار نہ تو صرف مشرقی ہیں نہ صرف مغربی، اردو فکشن کی روایت میں قرۃ العین حیدر سے پہلے اور ان کے بعد بھی افکار اور احساسات کی یہ کشادگی کہیں اور دکھائی نہیں دیتی۔قرۃ العین حیدر نے ایک سی سہولت کے ساتھ مشرق اور مغرب دونوں کی ادبی روایات سے استفادہ کیا ہے۔میرا خیال ہے کہ اردو فکشن کے ممتاز ترین ترجمانوں میں بھی مغربی فکشن اور جدید مغربی فلسفوں اور ذہنی وتخلیقی روایتوں سے قرۃ العین حیدر کی جیسی واقفیت شاید کسی اور لکھنے والے کے حصے میں نہیں آئی۔

قرۃ العین حیدر کے پہلے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کی اشاعت انکے افسانوں کی کتاب ''ستاروں سے آگے'' کی اشاعت 1947ء کے ٹھیک دو برس بعد 1949 میں ہوئی تھی۔گویا کہ تخلیقی سفر کی روداد تقریباً اسی مدت پر پھیلی ہوئی ہے۔جسے آزاد ہندوستان کی تاریخ کا نام دیا جاتا ہے۔اس پورے عرصے تہذیبی اور تخلیقی کلچر پر تاریخ کا بوجھ بہت حاوی رہا ہے۔ایک کا دائرہ پھر اس دائرے سے (Mhndsu) خاص طرح کے کولونیل طرز فکر نجات کی ایک شعوری کوشش، آزادی اور تقسیم سے پہلے کی اجتماعی تاریخ اور معاشرت، پھر فسادات، ہجرتیں، ذہنی اور جذباتی جلاوطنی اور دربدری کا احساس، تنہائی اور گمشدگی کے سائے میں نئے سرے سے اپنی جڑوں کی تلاش، ایک نئے تکنالوجیکل تمدن کا آشوب، مغرب اور مشرق کے بنتے بگڑتے رشتوں کے سیاق میں اپنے تشخص کی جستجو اور پھر ایک نئی شناخت کا تصور، قومیت اور بین الاقوامیت، مقامیت اور انفرادی واجتماعی سطح پر ایک عالمگیر انسانی صورت حال کی کشمکش۔

غرض کہ ایک خاصا بھرا پڑا عقبی پرندہ ہے۔جس کے حوالے معاصر عہد کے فکشن میں، شاعری میں اور فنون لطیفہ میں بکھرے ہوئے ہیں۔قرۃ العین حیدر کی تخلیقی زندگی کے اہم نشانات یہ ہیں۔'' آگ کا دریا'' 1959ء آخر شب کے ہم سفر 1971 گردش رنگ چمن 1988، چاندنی بیگم 1989 کار جہاں دراز ہے۔1990 کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں مجموعوں پت جھڑ کی آواز 1967 روشنی کی رفتار، 1982 طویل کہانیوں یا ناولٹس۔دل ربا۔سیتا ہرن، چائے کے باغ، اگلے جنم، موہے بیٹا نہ کیجو (چار ناولٹ 1989) اور ان کے سفرناموں، رپورتاژ، ترجموں، تبصروں سے لے کر ان کی حالیہ کتابوں، داستان عہد گل، کف گل فروش، جو اشاعت کے آخری مرحلے میں ہے۔اور جسے سوانحی ناول، کار جہاں دراز ہے کہ سلسلے کا ایک حصہ سمجھنا چاہئے۔

اس پورے سرمائے پر نظر ڈالی جائے تو ایک نہایت مصروف، سرگرم اور نتیجہ خیز تخلیقی زندگی کا خاکہ مرتب ہوتا ہے۔ایک کل وقتی ادیب کی زندگی کا منظر نامہ، ایک پر پیچ اور طویل مسافت، لیکن اس سلسلے میں سب سے خاص بات یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کا یہ سارا سفر نہ تو سیدھا

سادا سلسلہ وار رہا ہے نہ ہی کسی معین ،طئے شدہ منزل کی طرف ، راستے بھی پیچیدہ اور منزل بھی مبہم اور نا تمام ۔ یہ ایک دائرے کا سفر ہے۔ چنانچہ کسی عام لکھنے والے کے ذہنی ارتقا کی قسم کا عنوان اس پر چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے زمانے کے فکشن لکھنے والوں میں قرۃ العین حیدر کے بعد دوسری واحد مثال انتظار حسین کی ہے۔ جو تقریباً اسی طرح کے بے نام، تضادوں سے بھرے ہوئے۔نیم روشن راستوں سے گذرنے کے بعد اپنے موجودہ تخلیقی منطقے تک پہنچے ہیں۔ اور یہ منطقہ بھی ہر طرح کی ادعائیت اور قطعیت کے عنصر سے خالی ہے۔تخلیقی آزادی، جسے تخلیقی تنہائی کی ہی ایک شکل سمجھنا چاہئے اور صرف اپنے اعصاب واحساسات کی منڈیر پر روشن چراغوں کی مدد سے اپنے آپ کو اور اپنی دینا کو دیکھنے کی دیانت دارانہ کوشش جس کا دائرہ ہماری پوری اجتماعی تاریخ کے گرد پھیلا ہوا ہوا۔قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کی تخلیقات میں سب سے زیادہ نمایاں اور جلی خطوط میں دیکھا جا سکتا ہے۔

برصغیر کی تقسیم سے لے کر اب تک کی اجتماعی زندگی کا آشوب جس طرح ان دونوں کے یہاں اجاگر ہوا ہے۔اس نے ان کے بعد کے لکھنے والوں کے لئے ایک رول ماڈل کی حیثیت اختیار کر لی۔ یہ دو بستاں ہیں۔نئی حسیت کی تشکیل و ترسیل میں سرگرم اور بہت سے لکھنے والوں کے لئے ۔ان سے اتفاق اور اختلاف کی شعوری جدوجہد کے بغیر کسی نئی تصویر کا بننا محال ہے۔شاہد کوئی بھی نیا لکھنے والا ان سے صرف نظر کر کے آگے نہیں جا سکتا ۔ ان دونوں پر ماضی پرستی اور نوسٹیلیجا کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔اور دونوں کے بارے میں یہ حقیقت بھلا دی جاتی ہے کہ کسی بھی ذمہ دار اور سنجیدہ لکھنے والے کا ماضی صرف اس کا ماضی نہیں ہوتا۔اجتماعی ماضی کو دونوں کے یہاں ایک مرکزی حوالے کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ جب بھی کوئی نیا لکھنے والا تاریخ کے تناظر کے ساتھ اپنے تجربے کی روداد بیان کرنے کے لئے اٹھے گا۔اس کی نظر لامحالہ ان کی طرف جائے گی۔

ان میں قرۃ العین حیدر کا کینواس زیادہ اور وقت طلب ہے ۔ انتظار حسین نے طور بناتے ہیں۔قرۃ العین حیدر رمیورلز پینٹ کرتی ہیں۔قرۃ العین حیدر کی کہانیوں میں بھی ان کے تخلیقی طریق کار اور طرز احساس کی بہتر ترجمانی ان کی کہانیوں سے ہوتی ہے جو طویل ہیں اور افراد کے بجائے تہذیبوں کو اپنا موضوع ہیں۔

وحید اختر نے لکھا ہے۔

’’پہلا اردو ناول جو موجودہ عہد کے انسان اور اس کے مسائل وجود پر (یہ) بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ یہ اُداس نسلیں سے قبل شائع ہوا تھا۔اس ناول کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نے ہزاروں برس کے وسیع پس منتظر کو ناول کے کینواس پر پھیلا دیا ہے۔اس طرح ہندوستان کی کئی ہزار برس کے وسیع پس منتظر کو ناول کے کینواس پر پھیلا دیا ہے۔ اس طرح ہندوستان کی کئی ہزار سالہ تاریخ، کلچر، فلسفے اور رسم ورواج اس دریا کی موجوں میں سمٹ آتے ہیں۔اس لحاظ سے شاہد دنیا کے ادب میں اپنی طرز کی پہلی اور منفرد کوشش ہے‘‘

(آگ کا دریا پر وجودیت کے اثرات ،مشمولہ اردو فکشن، مرتبہ آل احمد سرور)

گویا کہ جس طرح ستاروں سے آگے ،اور شیشے کے گھر کی کہانیوں سے اردو کہانی میں استعاراتی اور علامتی اظہار کی داغ بیل اور اردو افسانے کی تاریخ میں روایتی بیانیہ سے آگے ایک نئے دستور نے رواج پایا۔اسی طرح آگ کا دریا، کی اشاعت ناول کی ہئیت اور مزاج میں ایک انقلابی تغیر کا سبب بنی ۔ یہاں سے ناول کی ایک نئی پہچان اور ایک نئی تعریف مقرر ہوئی۔ایک نئی شعریات کا ظہور رہا۔آگ کا دریا کی وساطت سے ہمیں اس صنف کو اور اس عہد کو دیکھنے کا ایک نیا زاویہ میسر آیا۔قرۃ العین حیدر کے زاویہ نظر میں تبدیلی بھی پیدا ہوئی ہے اور انسانی تجربوں کی تہہ میں تاریخ کی منطق سے زیادہ اب وہ غیر متوقع واقعات، اَنہونیوں اور اتفاقات کی زیادہ قائل دکھائی دیتی ہیں اس طرح ان کے ناولوں کا باطنی منظر نامہ بھی بدلا ہے۔اور ان کی ہئیت ،حیثیت اور ظاہری صورت بھی وہی ویسی نہیں رہی جس کی بنیاد پر کرشن چندر اور عصمت چغتائی انہیں موردالزام ٹھہرایا تھا۔

چائے کے باغ، دل رہا، اگلے جنم مو ہے۔، بیٹیانہ کیجو، آخر شب کے ہم سفر، چاندانی بیگم کے کرداروں کا طبقاتی نقشہ اور پس منظر بالکل مختلف ہے۔ وہ اشرافی اور نفاست آمیز تراشیدہ رویے جن سے قرۃ العین حیدر کی ابتدائی تحریر میں صاف پہچانی جاتی تھیں ۔ان کی جگہ اب ایک جمہوری زاویہ نظر اور تکلف یا ہیچ سے عاری اسلوب نے لے لی ہے ۔قرۃ العین حیدر کے نئے انسانی سروکار اور توجہ کے مراکز بن گئے ہیں۔ نچلے طبقوں کی عورتیں اور مرد ، روازانہ اجرت پر کام کرنے والی گھریلو لڑکیاں ، گانے بجانے والے مزدور اور کاریگران کی تخلیقات میں ایک بالکل ہی مختلف منظر یہ مرتب کرتے ہیں۔

اپنے حافظے کا استعمال قرۃ العین حیدر کبھی نئی حقیقتوں کی پیدائش کے وسیلے کے طور پر کرتی ہیں۔کبھی موجودہ صورت حال کی ابتری اور ابتذال کے خلاف ایک احتجاج کے طور پر ماضی کو بھول جانا اپنے آپ کو کھو دینے کے مترادف ہے۔جس طرح تاریخ ایک زندہ مظہر ہے۔اسی طرح ماضی کی بھی ایک جیتی جاگتی حقیقت ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کے ذہنی اور جذباتی ماخذ کی طرح ان کے اسٹرکچر اور ان کی فنی حکمت عملی کے انداز اور اسالیب بھی قاری پر یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ وہ خود قرۃ العین حیدر کی کچی پکی نقل اس طرح اتارنے کی جستجو کی کہ انگریزی کے کچھ غلط سلط لفظ اور محاورے اپنے جملوں میں ٹانک دیے اور کچھ پارٹیوں وغیرہ کا ذکر کر دیا۔

خصوصاً آگ کا دریا، کی تقلید کا میلان نئے لکھنے والوں کے یہاں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ تقلید اردو سے آگے ہندی میں بھی نظر آئی جہاں اردو کی بہ نسبت ناول کی صنف نے پچھلے چند برس میں زیادہ ترقی کی ہے اور کچھ اچھے ناول لکھے گئے ہیں۔ تاکہ یہ واقعہ اردو ناول کی تاریخ کے سیاق وسباق میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کہ ہمارے زمانے کے سب سے زیادہ قابل ذکر ناول (اداس نسلیں ۔لہو کے پھول ،بستی ،تذکرہ ،بہاؤ ،علی پور کا ایلی) آگ کا دریا کی اشاعت کے بعد لکھے گئے اور یہ قرۃ العین حیدر کے بالواسطہ اثر سے آزاد نہیں ہیں۔

قرۃ العین حیدر ادب میں لیڈیز کمپارٹمنٹ کی قائل نہیں ہیں اور اردو فکشن کی روایت میں جس بیانیہ اسلوب کی تعمیر کی ہے اس پرنسائیت کا ایک خاموش رنگ حاوی ہے۔ نسائی حسیت بیانیہ اسالیب سے ایک خلقی مناسبت رکھتی ہے۔ چنانچہ بعض تقریباً نام خواتین نے بھی انتہائی فطری بہاؤ کے ساتھ اپنے مشاہدات افسانے کے طور پر مرتب کئے ہیں۔

فتح محمد ملک کا یہ قول کہ۔

''ایک مدت کے بعد قرۃ العین حیدر ہمارا اجتماعی حافظہ بن کر نمودار ہوئی ہیں''

اسی حقیقت کے ادھورے ادارک پر مبنی ہے ۔ادھورا اس لئے کہ اپنے اجتماعی حافظے کی حد بندی وہ ایک طرح ہے کہ نیم سیاسی اور علاحدگی پسندانہ رویے کی رہنمائی میں کرتے ہیں جب کہ قرۃ العین حیدر اپنی بصیرت میں ارتقا اور تبدیلی کے کچھ ناگزیر اشاروں کے باوجود اپنے تہذیبی تناظر کو نہ تو محدود کرتی ہیں اور نہ اس وسیع المشرب امتزاجی زاویہ نظریہ سے دست کش ہوئی ہیں۔

جو میرے بھی صنم خانے سے لے کر شاہراہ حریر تک ان تمام تحریروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں ہم بیک وقت انسانی ادراک کی دو سطحوں سے روشناس ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ سارا سلسلہ جو ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ اس کے توسط سے ہم اپنے زمانے کی کن سچائیوں تک پہنچ سکتے ہیں۔

اسی طرح کسی بھی عصر شناس فن پارے کی طرح قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کے آئینے میں بھی ہمیں ایک ساتھ دو پرچھائیاں نظر آتی ہیں ۔ایک تو موجود دنیا کی پرچھائیں دوسری خود اس شخص کی پرچھائیں جو دنیا کو دیکھ رہا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے کبھی کسی خاص تکنیک کی پابندی ہیں نہ کسی ،معینہ اصول تحریر کو سامنے رکھ کر کسی خاص تھیوری کے مطابق لکھتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے اسلوب میں لفظ کی مبہم اور مخفی جہتوں کی موجودگی کا احساس ہمیں اس طرح ہوتا ہے جیسے کہ شاعری میں۔ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں ہمیں جابجا ایسی حقیقتوں کے نشانات بھی ملتے ہیں ۔جو روایتی فکشن کی طرح ہمیشہ قابل توثیق نہیں ہوتیں اور اس تخلیقی جو ہر کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ قرۃ العین نے لکھنے کو ایک مابعدالطبیعاتی فعل جو قرار دیا تھا۔ تو اسی لئے کہ ہر پڑھنے لکھنے والے کی طرح ان کے فکشن کی سطحیں اور سمتیں بھی کثیر ہیں۔ اور ان کا سب کا احاطہ کرنے کیلئے ہمیں فکشن کے رسمی تصور سے بہر حال آگے جانا ہوگا۔

قرۃ العین حیدر کے فکشن کو سمجھنا ایک ایسے شہر غریب میں داخل ہونا ہے جہاں مناظر کی کثرت ہے اور تماشوں کا ایک ہجوم ۔قرۃ العین حیدر کا مطالعہ کسی معینہ سیاق کا پابند نہس ہے۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین نے میرے بھی صنم خانے سے، آگ کا دریا، تک تہذیبی طاقت کے ایک سلسلے کی نشاندہی کی تھی۔ تہذیب اور ثقافتی ماحول سے ناول کے تعلق کی بنا پر قرۃ العین حیدر کے رمز کمال تک رسائی کے لئے ان کی تخلیقات کا ذہنی پس منظر مرتب کرنے والی تہذیب اور اس تہذیب کے عناصر پر قرۃ العین حیدر کے شعور کی گرفت کے علاوہ دونوں کے باہمی ربط کو سمجھنا بہر حال ضروری ہے۔

قرۃ العین حیدر ایک ممتاز پاکستانی اور ہندوستانی ناول نگار، افسانہ نگار اور صحافی تھیں وہ اردو ادب کی ایک اہم شخصیت تھیں اور انہیں اردو کی ورجینا وولف بھی کہا جاتا ہے۔ آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرۃ العین حیدر ہماری زبان کی بہت بڑی افسانہ نگار ہیں۔ منٹو اور بیدی کے بعد اگر کسی فن کار کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ قرۃ العین حیدر ہی ہیں۔

Dr. Asma Kousar
Lecturer Dept. of PG Studies and Research in Urdu.
Kuvempu University, Sahyadri College Compus, Shivamogga. 577202
Mob:. 6364568613
E-Mail. asmak7531@gmail.com

31

اردو میڈیم طلبہ اور ڈیجیٹل تعلیم: درپیش مشکلات اور ممکنہ حل

معراج بیگم

ریسرچ اسکالر،

ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ، مانو

نگراں:

ڈاکٹر ثمینہ بسو

ایسوسیٹ پروفیسر سی ڈی او ای، مانو

خلاصہ

آج کے ترقی یافتہ دور میں ٹیکنالوجی کا استعمال وسیع پیمانے پر کیا جارہا ہے۔ ٹیکنالوجی کا صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو یہ کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 بھی ڈیجیٹل تعلیم کی حمایت کرتی ہیں ڈیجیٹل تعلیم ذاتی نوعیت کی سیکھنے ہنر کی ترقی اور تعلیم میں جدید ٹیکنالوجی کے انماپم کی حمایت بھی کرتی ہے۔"ڈیجیٹل انڈیا"مہم ملک کے تمام شعبوں کو با اختیار اور علمی معیشت بنانے میں مدد کر رہی ہیں۔ ڈیجیٹل تعلیم سکھنے کے تجربات کو بہتر بناتی ہے۔ معیاری وسائل تک رسائی فراہم کرتی ہے۔تاہم، اردو میڈیم طلبہ کو ڈیجیٹل تعلیم میں کئی اہم چیلنجز کا سامنا ہے، جو انہیں جدید تعلیمی مواقع سے مکمل طور پر مستفید ہونے سے روکتے ہیں۔اس مطالعہ کا مقصد ان مشکلات کی نشاندہی کرنا اور ایسی مؤثر حکمت عملیوں کا جائزہ لینا ہے جو اردو میڈیم طلبہ کی تعلیمی رسائی اور مواقع کو بہتر بناسکیں۔

کلیدی نکات: اردو میڈیم، ڈیجیٹل تعلیم، درپیش مشکلات، ممکنہ حل

تعارف

آج کے دور میں تعلیم ایک بنیادی انسانی حق اور ترقی کی کلید سمجھی جاتی ہیں۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے تعلیم کے بارے میں واضح طور پر کہا ہے کہ ہندوستان میں تعلیم کو جامع، مساوی، لچکدار اور کثیر لسانی بنایا جائے تا کہ ہر طالب علم اپنی صلاحیت کے مطابق سیکھ سکے۔ پالیسی کا مقصد ہے کہ اسکول کی سطح پر بنیادی خواندگی اور عددی مہارت Foundational Literacy and Numeracy کو 2025 تک یقینی بنایا جائے، نصاب کے بوجھ کو کم کر کے عملی تنقیدی اور تخلیقی سوچ پر زور دیا جائے، اور اعلی تعلیم میں کثیر الشعبہ نظام اپنایا جائے۔اس میں تعلیم کو ٹیکنالوجی سے جوڑنے، پیشہ ورانہ تعلیم کو فروغ دینے، اور اساتذہ کی تربیت کو مضبوط کرنے پر بھی زور دیا گیا ہے تا کہ اکیسویں صدی کے تقاضوں کے مطابق ایک عالمی معیار کا تعلیمی نظام تشکیل دیا جاسکے۔

یونیسکو کے مطابق"تعلیم زندگیوں کو بدل دیتی ہے اور یہ امن قائم کرنے، غربت کے خاتمے اور پائیدار ترقی کو فروغ دینے کے لیے اس کے مشن کا مرکزی ستون ہے۔اس کا یقین ہے کہ تعلیم زندگی بھر ہر فرد کا بنیادی انسانی حق ہے اور اس تک رسائی کے ساتھ معیار کو بھی یقینی بنایا جانا ضروری ہے"۔

ڈیجیٹل تعلیم کیا ہے؟

ڈیجیٹل تعلیم سے مراد تعلیم کے حصول کے لیے ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کا استعمال ہے۔ اس میں کمپیوٹر، انٹرنیٹ، موبائل فونز اور دیگر ڈیجیٹل آلات شامل ہیں۔اس تعلیم میں مواد کو الیکٹرانک شکل میں تیار اور تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ تعلیم روایتی طریقہ تدریس کو جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ ہم آہنگ کرتی ہے۔

ڈیجیٹل تعلیم کی اہمیت

مستقبل میں کسی بھی شعبے میں کامیاب ہونے کے لیے طلبہ کے پاس ڈیجیٹل تعلیم کا ہونا ضروری ہے۔ چاہے وہ اسکول میں ہو یونیورسٹی میں پڑھنے والے طلبہ ہوں یا اساتذہ ہو، ڈیجیٹل تعلیم ٹیکنالوجی کی مہارتوں کو روز بروز اہم بنارہی ہے۔سہولت فراہم کرنے کے ساتھ ایک ضرورت بن گئی ہے، اس تعلیم کے ذریعے ہر کوئی تعلیم تک رسائی حاصل کرسکتا ہے یہ سیکھنے کے لچکدار اور خودمختار مواقع فراہم کرتی ہے۔اس تعلیم کے ذریعے طلبہ اپنی مہارتوں کو فروغ دے سکتے ہیں۔معلم اپنی تدریس کو موثر بنا سکتے ہے اس کے ذریعے زندگی بھر سیکھنے کے مواقع میسر ہوتے ہیں، یہ تعلیم آج کے دور میں ترقی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔اس تعلیم کے موثر نفاذ کے لیے جامع پالیسیز اخلاقی اصول اور بہترین عملی طریقہ اپنانے کی ضرورت ہے،تا کہ سب کے لیے فائدہ مند ثابت ہوسکیں۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور ڈیجیٹل تعلیم

قومی تعلیمی پالیسی 2020 بھی ڈیجیٹل تعلیم پر زور دیتی ہے۔ تا کہ سیکھنے میں رسائی، لچک اور شمولیت کو بڑھایا جاسکے۔ یہ ٹیکنالوجی کے استعمال کو فروغ دیتی ہے۔تا کہ ڈیجیٹل تقسیم کو ختم کیا جاسکے، سیکھنے کے نتائج کو بہتر بنایا جاسکے، اور تعلیم میں تسلسل کو یقینی بنایا جاسکے۔قومی تعلیمی پالیسی نے نئ ٹیکنالوجی کی کرامات کا ذکر کیا ہے، جن میں مصنوعی ذہانت مشین لرننگ، بلاک چین، اسمارٹ بورڈ کمپیوٹر پر مبنی جانچ اور دیگر قسم کے سافٹ ویئر اور ہارڈ ویئر شامل ہیں۔ان سے نہ صرف کلاس میں طلبہ کے سیکھنے کا مواد بدلے گا بلکہ سیکھنے کے طریقہ کار میں بھی تبدیلی آئے گی ان کو نا صرف یہ معلوم ہوگا کہ کیا سیکھا ہے۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوگا کہ کس طور سے سیکھنا ہے۔اس وجہ سے ان شعبوں میں نہ صرف تکنیکی لحاظ سے بلکہ تعلیمی

لحاظ سے بھی وسیع تحقیق کی ضرورت ہوگی قومی تعلیمی پالیسی نے نہ صرف ڈیجیٹل تعلیم کی پرزور حمایت کی ہے بلکہ مختلف تجاویزات بھی پیش کی ہیں۔

قومی تعلیمی پالیسی نے آن لائن تعلیم کے لیے پائلٹ مطالعات، آن لائن تدریس کے پلیٹ فارم اور ساز وسامان، ڈیجیٹل بنیادی ڈھانچہ، ڈیجیٹل تقسیم کا سد باب، مواد کی تخلیق، ڈیجیٹل ذخیرہ اور ترسیل، ورچول تجربہ گاہیں، اساتذہ کے لیے تربیت اور ترغیبات کی تجاویزات پیش کی ہے۔تا کہ اس تعلیم کو آسان بنایا جاسکے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے ڈیجیلو تعلیم کے فروغ کے لیے جامع اقدامات اور تجاویز پیش کی ہیں، تاہم اس تعلیم کو کامیاب بنانے کیلئے ان تجاویز کو روبہ عمل لانا ضروری ہے۔اس تناظر میں متعدد تحقیقی مطالعات نہ صرف درپیش چیلینجز کی نشاندہی کرتے ہیں بلکہ ان کے موثر حل بھی تجویز کرتے ہیں۔

نگوین تھی ہونگ نیون 2025)) نے ڈیجیٹل تبدیلی کے مکنہ حل بتائے ہیں جس میں ا۔تعلیمی رسائی میں اضافہ اور عدم مساوات میں کمی ۲۔تدریس اور سیکھنے کے معیار میں بہتری ۳۔تخلیقی صلاحیتوں اور خود سے سیکھنے کی حوصلہ افزائی ممکنہ حل کے ساتھ ہی انھوں نے درپیش مشکلات بھی بتائی ہیں ا۔تکنیکی بنیادی ڈھانچے کے حدود ۲۔اساتذہ اور طلباء میں تکنیکی مہارتوں کی کمی ۳۔ڈیجیٹل تعلیمی مواد کے معیار سے متعلق مسائل۔انھوں نے اپنی تحقیق میں بتایا ہے کہ ویتنام میں شہری علاقوں کے اساتذہ تدریسی عمل میں ڈیجیٹل ذرائع کو موثر طریقے سے شامل کر رہے ہیں لیکن دیہی علاقوں کے اساتذہ کو سنگین رکاوٹوں کا سامنا ہے، جو تمام علاقوں میں ٹیکنالوجی تک مساوی رسائی کی فوری ضرورت کو نمایاں کرتا ہے۔ مزید برآں تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوا ہیں کہ اساتذہ کی ڈیجیٹل خواندگی کو بہتر بنانا طلبہ کی شمولیت بڑھانے اور تعلیمی نتائج کو بہتر بنانے کے لیے نہایت ضروری ہے۔اساتذہ کو ایسی جامع تربیت دی جانی چاہیے جو انہیں ان ٹیکنالوجیز سے موثر طور پر استفادہ کرنے کے لیے ضروری مہارتوں سے آراستہ کریں اگرچہ کئی چیلنجز باقی ہیں لیکن مستقبل کا راستہ واضح ہے۔حکمت عملی کے تحت سرمایہ کاری مسلسل پیشہ ورانہ تربیت اور مساوات کے لیے عزم کے ذریعے ویتنام تعلیم کے شعبے میں ڈیجیٹل تبدیلی کی مکمل صلاحیت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور تمام طلبہ کے لیے ایک روشن مستقبل کی راہ ہموار کرسکتا ہے۔

عتیق الرحمن (2025) نے نتائج اخذ کیے کہ آن لائن تعلیم کو فروغ دینے والے مختلف سرکاری اقدامات کے بارے میں آگاہی کی سطح مختلف ہے۔ جہاں دکشہ نشٹھا اور ای پاٹھ شالا جیسے پلیٹ فارمز کے بارے میں خاطر خواہ آگاہی موجود ہے، وہیں این ڈی ای اے آر، سوئم اور سوئم پر بھا جیسے پلیٹ فارم اب بھی کم استعمال ہو رہے ہیں، کیونکہ ان کے بارے میں آگاہی محدود ہے۔ ان پلیٹ فارمز کے تئیں طلبہ میں شعور پیدا کیا جانا اور اس تعلیم کو مؤثر بنانا ضروری ہے۔

میناکشی شرما (2023) اور دیگر پانچ محققین نے واضح کیا کہ انٹرنیٹ اور موبائل کنکشن کی وسیع دستیابی کی وجہ سے بہت سے طلبہ باقاعدگی سے کلاس روم میں ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہیں۔ اسکولوں میں ٹیکنالوجی کا استعمال عام ہو چکا ہے اور تعلیمی عمل میں اس کی اہمیت وافادیت کی بنا پر یہ بڑے مؤثر انداز میں بروئے کار لائی جارہی ہے۔طلبہ اس بات سے متفق ہیں کہ کلاس روم کی گفتگو میں ٹیکنالوجی کا استعمال مفید ہے کیونکہ یہ انہیں زیرِ بحث موضوع میں دلچسپی لینے پر آمادہ کرتا ہے۔مزید برآں، طلبہ کی روزمرہ زندگی میں سوشل میڈیا کا استعمال، ٹیکنالوجی کو بطور تعلیمی وسیلہ اہمیت دینے کی عکاسی کرتا ہے۔اگرچہ بعض خدشات موجود ہیں، تاہم طلبہ اب بھی کلاس روم میں سوشل میڈیا کے استعمال کو مثبت نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

محمد ارشد خان (2021) نے واضح کیا کہ طلبہ اپنے اساتذہ اور ساتھیوں سے ای لرننگ یا ڈیجیٹل تعلیم کے ذریعے جڑنے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اپنی سہولت کے مطابق کسی بھی جگہ بیٹھ کر پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ بھارت میں ڈیجیٹل تعلیم کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے کیونکہ طلبہ آن لائن تعلیمی آلات کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑنے اور اساتذہ سے بات چیت کرنے میں دلچسپی لیتے ہیں۔لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ڈیجیٹل تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں۔

زلیخا محمد باسر (2021) اور دیگر دو محققین نے یہ پہلو نمایاں کیا کہ ڈیجیٹل تعلیم نے کووِڈ 19 کے دوران طلبہ کی صحت کے تحفظ میں مدد فراہم کی، لیکن یہ روایتی تعلیم کے مقابلے میں اتنی مؤثر ثابت نہیں ہوئی۔مزید برآں، ایک مضبوط آن لائن ڈھانچے (انفراسٹرکچر) کی عدم موجودگی بھی آن لائن تعلیم کی افادیت میں رکاوٹ بنی۔

ڈاکٹر محمد حسن رضا (2021) اور دیگر دو محققین نے اس امر کی نشاندہی کی کہ آن لائن تعلیم کے بارے میں متعدد طلبہ نے مثبت آرا پیش کیں، جیسے اس کی لچکدار نوعیت اور سہولت۔ دوسری طرف طلبہ نے یہ بھی بتایا کہ آن لائن کلاس مختلف وجوہات کی بنا پر مشکل ثابت ہوئی جن میں تکنیکی مسائل، باہمی تعامل کی کمی اور مسلسل توجہ قائم رکھنے جیسی رکاوٹیں شامل ہیں۔ تحقیقی نتائج کی روشنی میں محقق نے چند ضروری اقدامات تجویز کیے، جیسے مستحکم اور تیز رفتار انٹرنیٹ سہولیات، سستے انٹرنیٹ پیکجز، اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لیے تکنیکی تربیت اور اساتذہ کے لیے آن لائن تدریسی مواد کی تیاری کی تربیت تاکہ ان مسائل پر قابو پایا جاسکے۔

ویبوکوساسیہ (2021) کے مطابق آن لائن لرننگ کا متغیر، اشتراکِ سیکھنے کی طرف مثبت اور اہم اثر رکھتا ہے۔طلبہ آن لائن تعلیمی ماحول میں اپنے ساتھیوں اور اساتذہ کے ساتھ سرگرم شرکت کر سکتے ہیں۔مزید یہ کہ تحقیق کے مطابق آن لائن لرننگ کی سرگرمیوں نے طلبہ کی تعلیمی کارکردگی پر نسبتاً کم لیکن واضح اثر ڈالا ہے۔

ریچل نجیری کبوکو (2020) نے کینیا میں ای لرننگ کے بڑے چیلنجز کی نشاندہی کی ہے، جیسا کہ: ا۔آئی سی ٹی اور ای لرننگ پالیسی کے اطلاق میں مسائل ۲۔ آئی سی ٹی کے بنیادی ڈھانچے کی کمی اور ناکافی سہولیات ۳۔ ای ٹیوٹرز اور ای لرنرز میں آئی سی ٹی اور تدریسی مہارتوں کی تربیت کا فقدان ۴۔ مالی رکاوٹیں اور تحفظ سے متعلق مسائل ۵۔ای لرننگ کے معیار سے متعلق مسائل اور ای لرننگ کے بارے میں منفی رویہ۔محققہ نے اس بات پر زور دیا کہ ان چیلنجز کا حل نکالا جائے تاکہ ای لرننگ کے نفاذ اور فراہمی پر ان کے منفی اثرات کو کم کیا جاسکے۔

ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

33

ڈاکٹر یشپال (2019) نے مختلف ڈیجیٹل آلات کا ذکر کیا ہے جن کے ذریعے تعلیم کو آسان اور وسیع پیمانے پر عام کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے ڈیجیٹل تعلیم میں رکاوٹ بننے والے مسائل کو بھی اجاگر کیا ہے، جیسے دیکھ بھال، سافٹ ویئر، رسائی، موزونیت، ہینڈلنگ، ذخیرہ اور معلومات کا استعمال۔ ان مشکلات میں: ۱۔ ٹیکنالوجی میں ماہر اساتذہ کی کمی ۲۔ مہنگے آلات ۳۔ انتظامیہ کا رویہ ۴۔ غیر مستحکم بجلی کی فراہمی ۵۔ اساتذہ کے تربیتی نصاب کی خامیاں شامل ہیں۔ انھوں نے استدلال کیا کہ اگر اساتذہ یہ جان لیں کہ کب، کہاں اور کیسے کون سے ڈیجیٹل تدریسی طریقے زیادہ موزوں ہیں، تو اس کے نتیجے میں اساتذہ اور طلبہ دونوں کی مہارتوں اور صلاحیتوں میں نمایاں بہتری دیکھی جا سکتی ہے۔

عبدالقادر (2017) کے مطابق طلبہ ڈیجیٹل تعلیم کے ذریعے سیکھنے میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ تاہم وقت، وسائل اور اردو میں مواد کی کمی ایک بڑا چیلنج ہے۔ اردو میڈیم اساتذہ کو تدریسی مواد تیار کرنے کے لیے اضافی محنت کرنا پڑتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اساتذہ کی عمر بھی ایک اہم عنصر ہے؛ زیادہ عمر کے اساتذہ کو ڈیجیٹل ڈیوائسز استعمال کرنے میں دشواری کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ وہ ان آلات سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے۔

جوتی نارائن پاترا (2014) نے والدین، طلبہ، اساتذہ اور غیر تدریسی عملے کے لیے ڈیجیٹل تعلیم کے فوائد اور اس کے تجزیے پر روشنی ڈالی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے اس تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ممکنہ حل بھی تجویز کیے ہیں، جیسے: ۱۔ اساتذہ کی تربیت کو بہتر بنانا ۲۔ فاصلاتی تعلیم کے ذریعے رسائی میں اضافہ ۳۔ طلبہ کے لیے علم فراہم کرنے والے ادارے قائم کرنا ۴۔ معیاری تعلیمی مواد کی فراہمی کو وسعت دینا ۵۔ تعلیمی انتظام و انصرام اور پالیسی کی موثریت کو بہتر بنانا۔ محققہ کے مطابق اس تعلیم میں معیاری تعلیمی مواد کی کمی ایک بڑا مسئلہ ہے۔

مروہ اے عبدالعزیز (2014) نے یہ وضاحت کی کہ بعض تدریسی سرگرمیاں حقیقی ماحول میں انجام دینا مشکل ہوتی ہیں کیونکہ ان پر زیادہ خرچ آتا ہے، حقیقی ڈھانچے کی سہولت دستیاب نہیں ہوتی یا بعض اوقات یہ سرگرمیاں خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔ لیکن ورچوئل دنیا میں ہر قسم کی مشقیں اور سرگرمیاں انجام دینا ممکن ہے، اور طلبہ ورچوئل ریالٹی کے ذریعے آسانی سے سیکھتے ہیں۔ مروہ نے اپنی تحقیق میں درج ذیل دشواریوں پر بھی روشنی ڈالی ہے: ۱۔ رہنمائی اور سمت شناسی ۲۔ تدریسی سرگرمیوں کا اہتمام ۳۔ طلبہ کی فعال شمولیت ۴۔ محرکیاتی درس و تدریس ۵۔ مواد کے محرکیاتی نقطۂ نظر ۶۔ مصنوعی تخلیق۔ انھوں نے ان دشواریوں کا تفصیلی تجزیہ بھی کیا ہے۔

سید نور الامین (2013) نے یہ حقیقت آشکار کی کہ تعلیم میں ڈیجیٹل تدریسی طریقوں کا مسلسل استعمال سیکھنے، تدریس، تعلیمی معیار، ماحول اور ترقی جیسے اہم پہلوؤں پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ ان کے مطابق یہ اثرات درج ذیل پہلوؤں پر مرتکز ہوتے ہیں: ۱۔ تدریس اور سیکھنے کے عمل پر ۲۔ سیکھنے کی ترغیب پر ۳۔ تعلیم کے معیار اور رسائی پر ۴۔ تعلیمی ماحول پر ۵۔ آئی سی ٹی کے استعمال اور تعلیمی کارکردگی پر۔ ڈیجیٹل تعلیم سیکھنے کے عمل میں لچک پیدا کرتی ہے اور طلبہ کو جغرافیائی حدود سے آزاد ہو کر تعلیم حاصل کرنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ یہ طریقۂ تعلیم تدریسی عمل کے لیے ایک پر اثر ماحول اور ترغیب مہیا کرتا ہے، جو سیکھنے کے عمل پر گہرا اثر ڈالنے کے ساتھ ساتھ طلبہ و اساتذہ کے لیے نئے امکانات بھی فراہم کرتا ہے۔ مزید برآں یہ تعلیم طلبہ کی کارکردگی اور تعلیمی کامیابی پر بھی مثبت اثرات مرتب کر سکتی ہے۔

ڈاکٹر پی کینیڈی (2013) نے آئی سی ٹی آلہ Knowledge Yantra (نالیج ینترا) کے استعمال کے فوائد پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق اس آلے کی مدد سے طلبہ کو تصورات بہتر طور پر سمجھنے میں سہولت حاصل ہوئی۔ جس بھی کلاس روم میں نالیج ینترا استعمال کیا گیا، وہاں طلبہ اور اساتذہ کے درمیان باہمی تعامل میں نمایاں اضافہ دیکھنے میں آیا۔ اس آلے کے استعمال نے طلبہ کو باقاعدگی سے جماعت میں شرکت کے لیے پُرجوش کیا، جبکہ اساتذہ نے اسے اپنی تدریس کے لیے ایک قیمتی معاون کے طور پر تسلیم کیا۔ ان کے رویے میں خوف کے بجائے مثبت سوچ غالب رہی۔ تحقیق میں یہ بھی سامنے آیا کہ نالیج ینترا کے استعمال سے طلبہ کے داخلوں میں اضافہ ہوا، ایک ہی جماعت میں بار بار بیٹھنے والے طلبہ کی شرح کم ہوئی اور ڈراپ آؤٹ کی سطح میں بھی کمی واقع ہوئی۔ مزید یہ کہ، بہتر نتائج کے حصول کے لیے اسکولی نظام اور انتظامیہ کو ان ساختی کمزوریوں کو دور کرنا چاہیے جو اسکولوں میں آئی سی ٹی آلات کے تعارف اور ان کے مستقل استعمال کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

مندرجہ بالا تحقیقی مطالعات کے تجزیے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اگرچہ ڈیجیٹل تعلیم نے سیکھنے کے نئے امکانات پیدا کیے ہیں، لیکن اردو میڈیم طلبہ کے لیے اس نظام سے بھرپور فائدہ اٹھانا آسان نہیں ہے۔ اس حوالے سے مختلف رکاوٹیں اور مسائل موجود ہیں جنھیں سمجھنا اور بیان کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ ان کے ممکنہ حل تلاش کیے جا سکیں۔

اردو میڈیم طلبہ کو ڈیجیٹل طریقے سے تعلیم حاصل کرنے میں درپیش مشکلات

زبان کی رکاوٹ: ڈیجیٹل تعلیم کے طریقے کار میں متن اور ٹرمینالوجی وغیرہ انگریزی زبان میں ہوتے ہیں، جس سے طلبہ کو سمجھنے میں دشواری پیدا ہوتی ہے اس کے علاوہ اردو زبان میں زیادہ سے زیادہ اور معیاری متن تیار کرنا بھی ایک مشکل امر ہے جس کی وجہ سے اردو میڈیم کے طلبہ ڈیجیٹل تعلیم کے طریقے سے تعلیم حاصل کرنے میں پیچھے ہیں۔

اردو میں ڈیجیٹل مواد کی کمی: اردو زبان میں معیاری ڈیجیٹل کتابیں، ویڈیوز اور آن لائن کورسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کمی کی وجہ سے اردو میڈیم طلبہ جدید موضوعات کو اپنی زبان میں نہیں پڑھ پاتے ہیں۔

ٹیکنالوجی تک محدود رسائی: تمام طلبہ کے پاس ڈیجیٹل آلات جیسے موبائل فون، لیپ ٹاپ، انٹرنیٹ وغیرہ نہیں ہوتے ہیں جس سے وہ ٹیکنالوجی کا فائدہ نہیں اٹھا سکتے معاشرتی اقتصادی اور جغرافیائی وجوہات کی بنا پر کچھ علاقوں میں ٹیکنالوجی کے وسائل کی کمی ہوتی ہیں۔ اس محدود رسائی کی وجہ سے تعلیم، روزگار، صحت اور دیگر شعبوں میں ترقی کے مواقع بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ٹیکنالوجی تک یکساں اور موثر رسائی کو یقینی بنانا ایک اہم سماجی و تعلیمی چیلنج ہے۔

اساتذہ کی تربیت اور تیاری: اساتذہ کو ٹیکنالوجی کے استعمال سے واقف کرانا اور

اس کے لیے ان کو تربیت دینا ضروری ہے، تاکہ اساتذہ طلبہ کی ضروریات و نفسیات کو بہتر طریقے سے سمجھ سکے اور طلبہ کے مسائل کو بہتر طریقے سے حل کر سکے۔

سماجی اور ثقافتی رکاوٹیں: تعلیم، ٹیکنالوجی صحت، خواتین کی خودمختاری اور دیگر شعبہ جات کی ترقی میں سماجی ثقافتی روکاوٹیں سامنے آئی ہیں۔ غربت کی وجہ سے والدین تعلیم اور ٹیکنالوجی پر خرچ نہیں کر سکتے۔ روایتی طریقہ تدریس کو ہی اپنائے رہنا جدید طریقے ہائے تدریس یا نصاب کو تسلیم نہ کرنا بھی ڈیجیٹل تعلیم میں ایک اہم رکاوٹ ہے۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کیلیے ممکنہ حل تلاش کئے جائے اور ان کو روبہ عمل لایا جائے۔

اردو میڈیم طلبہ کی ڈیجیٹل تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے تجاویزات

متعلقہ مطالعات کے جائزے اور قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے رہنما اصولوں کی روشنی میں اردو میڈیم طلبہ کی ڈیجیٹل تعلیم کو موثر بنانے کے لیے مختلف تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ ان تجاویز کا مقصد نہ صرف درپیش رکاوٹوں کو کم کرنا ہے بلکہ تعلیم میں شمولیت، معیار اور رسائی کو بھی بہتر بنانا ہے تا کہ اردو میڈیم طلبہ جدید تعلیمی تقاضوں کے ساتھ قدم ملا سکیں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

اردو زبان میں ڈیجیٹل مواد کی تیاری: اردو میڈیم کے طلباء کی بہتر کارکردگی کے لیے ڈیجیٹل مواد کو اردو زبان میں تیار کیا جائے جس کی مدد سے طلبہ ڈیجیٹل تعلیم کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے اور تعلیمی مقاصد کو حاصل کر سکے اردو مواد کے لیے ڈیجیٹل لائبریریوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔

حکومتی اور غیر سرکاری تنظیموں کی معاونت: ڈیجیٹل تعلیم مستقبل کی ضرورت ہی نہیں بلکہ موجودہ دور کا لازمی جزو بھی بن گئی ہیں ڈیجیٹل تعلیم کے لیے حکومت اور سرکاری تنظیمیں مل کر کام کرے تو ہر طالب علم تک معیاری تعلیم کی رسائی ممکن ہو سکتی ہیں اس مشترکہ کوشش سے تعلیم میں مساوات شمولیت اور پائیدار ترقی کے اہداف کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اساتذہ کے تربیتی پروگرام: حکومت کو چاہیے کہ اردو میڈیم اساتذہ کو ڈیجیٹل تعلیم کو معیاری اور موثر بنانے کی تربیت دی جائے ایک معلم ہی اپنے طلبہ کی ضروریات اور نفسیات کو سمجھتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی سے اساتذہ کو آراستہ کیا جائے۔ تا کہ وہ طلباء کی ضروریات اور نفسیات کو سمجھ کر طلبہ کی رہنمائی کرے۔

ڈیٹلی سہولامت کی فراہمی: حکومت یا تعلیمی ادارے طلبہ کو کم قمت یا سبسیڈی والے اسمارٹ فونز، لیپ ٹاپ اور انٹرنیٹ پیکجز فراہم کریں۔ تا کہ ان سہولیات سے وہ باآسانی استفادہ کر سکیں۔

مقامی اور معاشرتی معاونت: کمیونٹی لائبریریز، ڈیجیٹل لیبز اور لرننگ سینٹرز قائم کیے جائیں جہاں اردو میڈیم طلبہ کو انٹرنیٹ اور آلات تک آسانی سے رسائی حاصل ہو۔

کمیونٹی آگاہی پروگرام: عوام الناس میں مختلف سماجی ماحولیاتی ڈیجیٹل تعلیمی مسائل سے آگاہی اور ان میں شعور پیدا کرنا تا کہ وہ طلبہ کی ڈیجیٹل تعلیم میں معاون اور مثبت طرز عمل کو فروغ دے سکے عوام کو ڈیجیٹل تعلیم کے فوائد اور نتائج سے روشناس کرائے۔

دولسانی مواد: اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی سب ٹائٹلز یا وضاحت فراہم کی جائے تا کہ طلبہ بتدریج انگریزی اصطلاحات سے بھی واقف ہو سکس ن۔

نتیجہ

ڈیجیٹل تعلیم عصر حاضر کی ایک اہم ضرورت بن چکی ہے جو نہ صرف تعلیمی معیار کو بلند کرنے کا ذریعہ ہے بلکہ سیکھنے سے عمل کو سہل موثر اور شفاف بناتی ہیں تاہم اردو میڈیم طلبہ کو ڈیجیٹل تعلیم کے حصول میں کئی چیلنجز کا سامنا ہے جن میں زبان کی رکاوٹ ٹیکنالوجی تک محدود رسائی اساتذہ کی تربیت کی کمی تعلیمی وسائل کے عدم دستیابی اور سماجی و ثقافتی عوامل شامل ہیں تحقیق سے ظاہر ہوا ہے کہ اگر اردو زبان میں معیاری اور با مقصد ڈیجیٹل مواد تیار کیا جائے اساتذہ کو جدید تدریسی مہارتوں سے آراستہ کیا جائے حکومتی وغیر سرکاری تنظیموں کا تعاون حاصل کیا جائے اور عوام الناس میں ڈیجیٹل تعلیم کے حوالے سے شعور پیدا کیا جائے تو ان چیلنجز پر موثر انداز میں قابو پایا جا سکتا ہے مزید براں قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے بھی ڈیجیٹل تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے فروغ کے لیے جامع حکمت عملی کی ضرورت پر زور دیا ہے اس پالیسی کی روشنی میں اردو میڈیم طلبہ کے لیے مساوی تعلیمی مواقع فراہم کرنے کے لیے عملی اقدامات کرنا نہایت ضروری ہیں لہذا اردو میڈیم طلبہ کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ڈیجیٹل تعلیم میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا اور قابل عمل حل اپنانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے تا کہ ایک جامع منصفانہ اور بااختیار تعلیمی نظام قائم کیا جا سکے۔

References

,Khanh※※ T. P,Kien※※ H. T. N,Nhung .1
.(2025). D. T,Phong※※ T. T,Tinh※※ Q.M
:Digital transformation in Vietnam's education
and development , challenges,Opportunities
※(9) 8, Multidisciplinary Reviews.strategies
.2025282
multirev.2025282/31893.doi.org/10//:https
Initiatives and .(2025). U. A,Rehman .2
challenges for promoting online learning
Advances .among higher education students
.243231※(3) 26,in Research
v26i31340/air/2025/9734.doi.org/10//:https
,Maheswari※※ R,Malathi※※ M,Sharma .3
. S. O,Potosi※※ N,Kaur※※ P,Tripathi※※K
impacts and the ,Challenges.(2023)
importance of digital technologies on modern
European Chemical .education in 21st century
.1729317282※(4) 12,Bulletin

Issues in .(2019). Y,Netragaonkar .10
. in ICT education, problems, Barriers:ICT
Scholarly Research Journal for
.(41) 8,Interdisciplinary Studies
ssrn.com/abstract=4072610//:https
School education use .(2017). A,Kadir .11
A case study of an Urdu medium :of ICT
An . of Delhi.school located in Central Dist
International Journal of Educational
.101※(21) 7,Technology
8.00001.2017.5223-2249/5958.doi.org/10//:https
※※ M. A,Riad※※ A. M,Abdelaziz .12
Challenges and issues .(2014). B. M,Senousy
in building virtual reality-based e-learning
, International Journal of e-Education .system
, e-Management and e-Learning,e-Business
.328320※(4)4
www.researchgate.net/publication/270213631//:https
The .(2014). P. J,Mete※※ N. J,Patra .13
role of ICT in improving the quality of school
International Educational .education in India
.156150※(2) 3,E-Journal
www.oiirj.org/ejournal/apr
An effective use of .(2013). N. S,Amin .14
ICT for education and learning by drawing on
research and ,worldwide knowledge
ICT as a change agent for :experience
ScholarlyJournal .((Literature revieweducation
.5438※(4) 2,of Education
www.researchgate.net/publication/312197085//:https
ICTs in Urdu .(2013). P,Kennedy .15
An evaluative :medium schools in Hyderabad
American International Journal of .study
Arts and Social ,Research in Humanities
www.iasir.net//:http.141138※(2) 4,Sciences

www.researchgate.net/publication//:https
371947581/
※※ N. A,Mansor※※ M. Z,Basar .4
The .(2021). S. B,Alias※※ A. K,Jamaludin
effectiveness and challenges of online
A case learning for secondary school students
, Asian Journal of University Education.study
.129119※(3)17
ajue.v17i3.14514/2419.doi.org/10//:https
※※ E,Abdurahman※※ G. G,Cooper .5
The .(2021). W,Kosasih※※ L. D,Warganegara
'influence of online learning on students
Mediated by :academic achievement
International Journal of .collaborative learning
Advance Trends in Computer Science and
.163154※(1) 10,Engineering
www.warse.org/IJATCSE/st//:http
atic/pdf/file/ijatcse211012021
※※ K. M, Nabi,Vivek※※ A. M,Khan .6
'Students.(2021). M,Tahir※※ M,Khojah
perception towards e-learning during
An empirical :pandemic in IndiaCOVID-19
.(57) 13, Sustainability.study
su13010057/3390.doi.org/10//:https
. A. K,Onee※※ N,Hasan※※ M. M,Reza .7
Synchronous online learning during .(2021)
A study on the tertiary :pandemicCOVID-19
Journal of .level students in Bangladesh
※(1) 1,Sustainable Learning and Development
www.researchgate.net/publication//:https.71
383181062/
※※ O. D,Ochieng※※ N. R,Kibuku .8
E-learning challenges faced .(2020). A,Wausi
. A literature review:by universities in Kenya
※(2) 18,The Electronic Journal of e-Learning
.161150
www.researchgate.net/publication/348466416//:https
Government of ,Ministry of Education .9
National Education Policy 2020.(2020).India
.(Urdu version)
urdu.pdf/www.education.gov.in/sites/upload_files/mhrd/files/nep/202

36

عبدالقادر سروری کا ناقدانہ شعور

ڈاکٹر عابدہ تبسم

بہار

۱۹۰۸ء کے انقلاب کے وقت عوام کی طرف سے آئینی حکومت کا مطالبہ پیش کیا گیا سلطان نے مشاورت کے لئے وزرا کو بلایا۔آپ بھی مدعو کئے گئے۔ سلطان نے رائے طلب کی سب کہنا چاہتے تھے لیکن جرات کسی میں نہ تھی۔ یہ ابوالہدی ہی تھے جنہوں نے آئینی حکومت بنانے کی صلاح دی یوں ترکی کا یہ انقلاب بغیر کسی کشت وخون کے برپا ہوا۔شیخ ابوالہدی کے دنیا سے جانے کے بعد بھی مشرق وسطی میں ان کے چاہنے والے اوران کی تعلیمات سے بہرہ ور ہونے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔شیخ عبدالقادر، کی منتخب کردہ شخصیات میں ایک قدر مشترک پائی جاتی ہے کہ یہ سب سادہ شعار تھے، زندگی اور وقت کے تقاضوں کو سمجھتے تھے۔اپنی ذات کو اہم نہیں جانتے تھے، اس اعلیٰ وارفع مقصد اور عزم کو اہمیت دیتے تھے جس کی تکمیل ان کے پیش نظر ہوتی تھی۔شیخ صاحب اپنے ان رہنماؤں کا شعوری یا غیر شعوری طور پر تتبع کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔شیخ صاحب مذہبی،لسانی، علاقائی تعصّبات سے مبرا اشخصیت تھے، ان کی ان چھ پسندیدہ شخصیات میں سے تین کا تعلق دیگر مذاہب، ہندومت، پارسی اور عیسائیت سے تھا لیکن ان کی فرض شناسی، کام سے وفاداری، ان تھک محنت، وقت کی قدرو قیمت سے آگاہی، بےلوث خدمات اور ہندوستان کے لئے ذمہ دار بننے کی عادت کے سبب وہ انہیں عظیم ہستیوں میں شمار کرتے ہیں۔

محمد حنیف شاہد کے مرتبہ مقالات عبد القادر ۱۹۸۶ء تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ خودنوشت سوانحی خاکوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے طویل حصے میں اپنے عہد کے اکابرین کا تذکرہ ہے جن کے اوج کمال نے انہیں متاثر کیا۔تیسرے حصے میں مضامین کا انتخاب شامل کیا گیا۔

انہوں نے فن تحقید، نئے ادبی رجحانات اور اہم کتابوں پر لکھے گئے ان کے تجزیاتی مضامین پر مشتمل ہے۔نظم آزاد، حیات جاوید، حالی اور غزل، شعرا نجم کلیات اکبر، دیوان سید محمد کاظم،

حبیب، جنگ روس و جاپان پر ایک تنقیدی نظر، مغرب کا اثر ادب اردو پر ہماری شاعری کا ایک نیا میلان (اشاریت اور ابہام) ان مضامین میں شعر وادب کے جمالیاتی پہلو اور معاصراتی زاویوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔خود

نوشت سوانحی خاکے شباب سے پہلے کا ایک اقتباس

پیش کرتے ہوئے محمد حنیف شاہد نے اس شوخی ظرافت اور صفائی کا مرقع کہا ہے۔ پطرس نے ایک دفعہ لاہور کا جغرافیہ لکھا تھا اور طنز یہ کہا تھا کہ جغرافیہ

،لاہور میں آب وہوا

کا باب نہیں، کیونکہ لاہور میں آب وہوا ہی نہیں ہے۔اس طرح میرے بچپن کی تاریخ انوکھی ہے۔اس میں بچپن کا باب ہی نہیں ملتا۔راقمہ کے نزدیک یہ جملہ”میرے بچپن کی تاریخ انوکھی ہے۔اس میں بچپن کا باب ہی نہیں ملتا ایک محرومی اور کسک لئے ہوئے ہے۔اس جملے کی وضاحت خود شیخ صاحب یوں کرتے ہیں کہ میں اپنے ماں باپ کو بڑھاپے کی اولاد تھا گھر میں سب بڑے تھے میں اکیلا بچہ تھا، گھر میں والدین کے علاوہ دو بڑی بیاہی بہنیں تھیں۔شیخ صاحب کا یہ سوانحی خاکہ ان کی زندگی کے ابتدائی دور کی ایک واضح جھلک دکھاتا ہے۔ جب آتش جواں تھا میں انہوں نے ماضی کے حوالے سے ان سہولتوں اور آسائشوں کا ذکر کیا ہے جن سے اب سے پچاس سال پہلے کے جو ان محروم تھے۔کالج سے فراغت کے بعد ایک انگریزی اخبار کی ادارت تھی محدود آمدنی کے سبب ہی حالات تھے کہ یاراں فراموش کروند عشق، ایسے میں شاعری، اپنی نہیں دوسروں کی، پڑھنا انہیں اچھا لگتا، دوست بھی فرمائش کر کے ان سے شعر سنا کرتے کہ وہ جلسے میں غزل خوانی کیا کرتے۔اس زمانے میں ایک شوق تھیٹر کا بھی تھا۔امرتسر میں ایک کھیل کا بڑا چرچا تھا لاہور سے کافی شائقین روزانہ امرتسر جاتے۔شیخ صاحب بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ امرتسر تھیٹر دیکھنے گئے اور صبح کی پہلی گاڑی سے لاہور واپس ہوئے۔اسٹیشن پر چند لوگوں نے پہچان کر آواز کسا۔لیڈران قوم کہاں سے تشریف لا رہے ہیں” شیخ صاحب نے برجستہ جواب دیا، لیڈر یہ دیکھنے گئے تھے کہ قوم دوسرے شہر کیا کرنے گئی تھی۔ جوانی کی یادوں میں سب سے حسین یاد علامہ اقبال کی قربت تھی کہ جب وہ کالج میں پروفیسر ہوئے تو انہوں نے شیخ صاحب کی ہمسائیگی اختیار کی، اب روزانہ ملاقات ہونے لگی۔ پھر مخزن کا اجرا بھی ایک اہم واقعہ تھا جو انہیں دونوں ہوا۔حصول تعلیم کے لئے انگلستان کا سفر بھی جب آتش جوان تھا کا ایک دل خوش کن مرحلہ رہا۔ اولی زندگی کا آغاز آزاد کی قصص ہند“ کے مطالعے سے ہوا اور جب سے ہی

مولانا سے ملاقات کا شوق تھا جو پورا ہوا۔آزاد اس وقت گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔افسوس چند سال بعد ان کی دماغی حالت بدل گئی اور دنیا ان کی ادبی خدمات سے محروم ہو گئی۔مولانا حالی، اکبر الہ آبادی، سر سید احمد خان، اقبال، شاد، جگر، امتیاز علی تاج، حکیم احمد شجاع،

جوش اور حفیظ وغیرہ جیسی عہد آفرین شخصیات سے ملاقات، محبت اور فیض یاب ہونے کا شرف حاصل ہوا۔مغرب کا اثر ادب اردو پر آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے انگریزی زبان میں ایک کتاب بعنوان”موڈرن انڈیا اینڈ دی ایسٹ شائع کی ہے جس کا ایک باب ادبیات اردو، شیخ صاحب نے تحریر کیا

37

اوراس کا ترجمہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے کیا ہے۔شیخ صاحب نے اس مضمون میں اردوادب ہی نہیں اردو زبان کے آغاز پر بھی مفصل ومربوط بحث کرتے اور اس کے عہد بہ عہد ارتقا کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔اردوادب کی تاریخ کوئی بہت قدیم نہیں،

حقیقت تو یہ ہے کہ بیسویں صدی سے پہلے تو نثر میں چند مدہی کتابچے ہی دستیاب تھے انیسویں صدی کے وسط میں فسانہ عجائب اور باغ و بہاراور دیگر کتب،فورٹ ولیم کالج کے ڈاکٹر جان گلکر اکسٹ کی اردو زبان سے محبت یا وقت کے تقاضوں کے تحت لکھوائی گئیں۔جدید معیاری نثر کا آغاز مرزا غالب کے خطوط سے ہوتا ہے۔بےنظیر اسلوب بیان نے اس کی وقعت میں اضافہ کیا ہے۔شیخ صاحب سر سید اوران کے رفقا کی ادبی خدمات کا تفصیلی تعارف پیش کرتے ہوئے اردوادب کے فروغ میں ان کے کردار کو سراہتے تو ہیں۔ہادی رسوا نے اردو ناول نگاری کو ایک معتبر مقام عطا کیا۔اردو زبان میں مغربی ادب پاروں کے تراجم کے

سلسلے نے بھی بار پایا۔مغرب کے زیر اثر صحافت نے بھی فروغ پایا۔ اخبارات کے علاوہ ادبی رسائل، دلگداز، معارف مخزن، زمانہ، ادیب، نگار، ادبی دنیا، نیرنگ خیال، ہمایوں اور شاہکار

کے ساتھ ساتھ بچوں اور عورتوں کے لئے نکلنے والے رسالوں نے زبان وادب کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔طنز وظرافت سے بھی اردو شعروادب کا دامن تھی نہیں۔اردوادب، بلکہ بین الاقوامی ادب بھی جس پر رشک کرسکتا ہے وہ ہستی علامہ اقبال کے نام سے اپنے حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات ونظریات سے شعری افق پر نمایاں ہوتی ہے۔اقبال نے انگریزی علم وادب ہی کا غائر مطالعہ نہ کیا تھا بلکہ وہ جرمن زبان ادب سے نہ صرف آگاہ تھے بلکہ متاثر بھی تھے،ان کے افکار ونظریات پر برگساں ونطشے کا اثر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی وہ بنیادی طور پر صوفی تھے اسلامی تصوف اور فقر وطریقت ان کے اہم موضوعات تھے اور مغرب کی مادہ پرست زندگی پر انہوں نے کڑی تنقید کی۔جدید شاعری اور شاعروں کے تذکرے میں وہ لکھتے ہیں۔یہ وہ دور ہے کہ جب حفیظ جالندھری اور جوش ملیح آبادی اہم شاعر کی حیثیت سے اردو شاعری کے منظر نامے میں اپنی شناخت قائم کر رہے ہیں اور وہ خاص طرزوں کی نمائندگی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔حفیظ جالندھری کی شاعری میں بند کی معاشرتی وسیاسی زندگی کی تصویر نہایت سادہ الفاظ میں کھینچی گئی ہیں موسیقیت، روانی اور ترنم ان کا خاص وصف ہے۔جوش ملیح آبادی وطن دوست اور وطن پرور کے روپ میں سامنے آتے ہیں استعمار ہملوکیت اور سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔شیخ صاحب اردو ڈراما کی مختصر تاریخ وتعریف کے بعد نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اردو ڈرامے نے غنائی تمثیل (اوپرا) کے طرز پر ترقی کی ہے۔قدیم نثری ڈراموں میں بھی کردار مقفی ومسجع گفتگو کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اوپر میں بھی نفسگی کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔جدید ڈراما کی ترقی یافتہ شکل سینما ہے،جس میں کہانی کے معیار پر زور دیا جارہا ہے۔

ماہنامہ نگار کے شمارہ جنوری فروری ۱۹۵۰ء میں شائع ہونے والے مضمون "ہماری شاعری کا ایک نیا میلان، اشاریت اور ابہام میں شاخ صاحب کی عالمی شعری افق پر نمودار ہونے والی تحریکوں اور ان کے اردو شاعری پر اثرات کا احاطہ کرتا ہے۔اشاریت اور ابہام اردو شاعری کے قدیم ترین رویوں میں سے ایک شعر کی اس خوبی کا اعتراف بھی کہ وہ ہمیں مطالعے کے بعد غور وفکر کی دعوت دے۔

فرانسیسی، جرمن، روسی اور انگریزی ادب کے تخلیق کار اس بات پر متفق ہوتے گئے کہ آرٹ ایک انفرادی مشغلہ ہے۔دوسروں کے لئے نہیں، اردوادب بھی اس تحریک سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور گذشتہ چند برسوں سے ایسی لا تعداد نظمیں شائع ہوکر قارئین کے لئے چیستان کا سماں پیدا کر رہی ہیں۔شیخ صاحب بہت دھیمے لہجے میں یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ شاعری یا نثر صرف جذبہ واحساس کے اظہار کا نام نہیں بلکہ وہ قاری

سے مخاطب ہونے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔کہانی، کہانی اس لئے ہے کہ دوسروں کو سنائی جاسکے اوراس سے حظ اٹھایا جا سکے لیکن اگر وہ مقصد براری یا تفریح کا کوئی پہلو پورا نہیں کر رہی تو اس کی تخلیق کا کیا جواز ہے۔تخیل کی کارگزاری بے شک شعر کی تخلیق میں لازمی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔جو اس کے حسن و خوبی میں اضافے کا سبب بھی بنتی ہے غالب کے اس شعر میں تین مختلف تصور پیش کئے ہیں اور اس کے بعد شاعر نے اپنے مقصد کو ظاہر کیا ہے۔یوں ایک مکمل تصویر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔

بوئے گل نالہ دل چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اس مضمون میں شیخ صاحب نے مغربی مفکرین وشعرا کے اشاریت اور ابہام سے متعلق تمام نظریات کے مدلل جواب دینے کی کوشش کی ہے، ملارمے نے کہا کہ کسی چیز کو واضح بیان کردینے سے اس کا تین چوتھائی لطف غارت ہو جاتا ہے، شیخ صاحب کہتے ہیں اگر ان کے اس اصول پر عمل کیا جائے تو آرٹ کا مقصد یعنی ابلاغ ہی فوت ہو جاتا ہے۔اس مکمل ومبسوط مضمون میں شیخ صاحب نے کالنگ وڈ، ایڈمنڈ ولسن، شیکسپئر، پیٹھیں اور ٹی ایس ایلیٹ وغیرہ کی تخلیقات کو موضوع بحث بناتے ہوئے اردو کی کلاسیکی و جدید شاعری کا جائزہ لیا ہے اور نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نئی شاعری کا یہ تجرباتی دور ہے، ابھی منزل سے دور ہے اور اس تجرباتی دور میں خوبیوں اور خامیوں کا تعین کر کے نقادان فن کی رہنمائی اس سے شاعری کو نقائص سے پاک

کیا جا سکتا ہے۔دنیا کی دلچسپیاں دنیا کی کلفتوں، آزمائشوں اور فرائض کے انبار میں اگر انسان اپنے لئے کچھ مشغلے، چند دلچسپیاں منتخب کر کے اپنی زندگی کو قابل قبول بلکہ خوشگوار بنانا چاہتا ہے تو شیخ صاحب اس عمل کو سراہتے ہیں۔

ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

38

ان دلچسپیوں اور مشاغل میں سرفہرست پرندوں اور پالتو جانوروں سے لگاؤ ہے یہ پرندے اور جانور کس کس طرح اپنے مالکان کا دل جیتے ہیں کہ بسا اوقات انسان سے ان کا تعلق اتنا مضبوط انہیں رہتا، جتنا معصوموں سے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو وافر مقدار میں اپنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ ان کی فراوانی کے سبب انسان ان کی قدر و اہمیتسے لاتعلق سا رہتا ہے۔ موسم کے بدلتے رنگ، آب و ہوا کی متنوع کیفیات، ذائقے دار پھلوں کی موجودگی، پھولوں کا حسن اور خوشبو بھی دلچسپی اور شوق کے خزینے اسے جینے پر آمادہ کرتے ہیں۔

شیخ صاحب نے اس مضمون میں ہر نعمت، ہر دلچسپی کا ذکر اس پیرائے میں کیا ہے کہ یہ نعمتیں، آسائش اور سہولتیں اللہ تعالیٰ نے صرف طبقہ امرا کے لئے ہی نہیں اتاریں بلکہ غریب بھی ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ امیر، ہر نعمت کے بعد مزید" کا نعرہ بلند کرتا ہے اور غریب دل کی گہرائیوں سے شکر ادا کرتا ہے۔ شیخ صاحب مضمون کا اختتام بڑے متوازن انداز میں کرتے ہیں کہ زندگی مجموعہ اضداد ہے اگر انسان کا شعور و ادراک وسیع اور عمیق ہو تو وہ ہر منفی پہلو میں کوئی نہ کوئی مثبت زاویہ

تلاش کر لیتا ہے اور داغ مرحوم سے اتفاق کرتا ہے کہ دنیا بھی ایک بہشت ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی نظریات

فرح ناز

بہار

مولانا ابوالکلام آزاد کا مار نابغہ روزگار ہستیوں میں ہوتا ہے۔ ان کی ہشت پہلو شخصیت اور ہمہ جہت تاریخ ساز علمی، ادبی تعلیمی، صحافتی، مذہبی، قومی اور سیاسی خدمات محتاج تعارف نہیں۔ وہ محض بے مثل عالم، با کمال مفسر، روشن خیال مفکر، جادو صفت مقرر، ہوش مند مدتر، بلند پایہ صحافی اور صاحب طرز ادیب ہی نہ تھے لائق فخر قومی رہنما بھی تھے۔ ملک کی آزادی اور قوم کی خدمت، ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ آزادی وطن کے لیے انھوں نے عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ یعنی دس سال سے زیادہ عرصہ قید خانوں کے اذیت ناک ماحول میں بسر کیا اور ساری زندگی ملک وقوم نیز علم وادب کی خدمت میں صرف کردی۔ وہ نعروں کے بجائے عمل میں یقین رکھتے تھے۔ اعلیٰ عہدوں کا حصول ان کا منصب نہ تھا چنانچہ آزادی کے بعد جب انھیں ملک کے سب سے بڑے عہدہ جلیلہ پر متمکن کرانے کی پیش کش کی گئی تو انھوں نے یہ کہہ کر اسے قبول کرنے سے صاف انکار کردیا:

میں کوئی ایسا منصب نہیں چاہتا جس میں صرف نام ہو، کام نہ ہو۔

مولانا آزاد جانتے تھے کہ ملک وقوم کی تعمیر وترقی اور خوشحالی واستحکام کے لیے تعلیم اہم جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے دیگر کسی منصب کے وزیر تعلیم بننے کو ترجیح دی۔ مولانا آزاد اگرچہ ماہر تعلیم نہ تھے لیکن تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کے پیش نظر ابتدا ہی سے ان کے خطبات اور تحریروں میں تعلیم سے متعلق خیالات ونظریات کا اظہار ملتا ہے۔ آزادی سے قبل لکھے گئے ان کے مقالوں میں زیادہ تر توجہ مسلمانوں کی تعلیمی پالیسی اور ان کے تعلیمی اداروں کے مختلف مسائل پر مرکوز رہی ہے۔" مسلمانان ہند اور گورنمنٹ کی۔ تعلیمی پالیسی ان کا قابل توجہ مقالہ تھا جس میں انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال اور انگریز حکومت کی تعلیمی پالیسی پر سخت تنقید کرتے ہوئے یوروپ کے معیار تعلیم کی روشنی میں ہندوستان کی جامعات کے معیار تعلیم کے تئیں اہم تجاویز پیش کی تھیں۔ ۲ مئی ۱۹۱۳ء کو جب حکومتِ ہند نے مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں قدرے گمراہ کن نام نہاد اصلاحی سرکلر جاری کیا تو مولانا نے دلائل کے ساتھ اس کی سخت مخالفت کی۔ انھوں نے یوروپ کی بیسویں صدی کے

طریقۂ تعلیم کا تجزیہ کر کے یہ ثابت کرنا چاہا کہ یوروپ میں علم النفس کے اصولوں پر جس نوع کی تعلیم کا رواج ہے اس کے تحت انسانی خیالات کو علمی صورت میں لا کر درس گاہ عمل کا ایک جزو بنایا جائے۔ جب یوروپ کی تعلیمی پالیسی میں تبدیلی واقع ہوئی اور اس کا مدعا محض نفع رسائی کی حد تک محدود ہو گیا تو مولانا نے اس نئی تعلیمی پالیسی کا بھی ذکر کیا اور اسے ہندوستان میں رائج کیے جانے کی وکالت کرتے ہوئے انھوں نے سخت محنت کی۔

مولانا آزاد نے اگرچہ مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی اور روایتی انداز کی تعلیم حاصل کی لیکن فکر و فلسفہ اور نئے علوم سے دلچسپی، استدلال اور تشخص و تلاش کے حامل ان کے مزاج نے ان میں وسیع النظری اور وسیع المشربی پیدا کر دی تھی۔ سیاست ہو یا مذہب، تعلیم ہو یا تمدن یہ عصر ان کے یہاں ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا خیال قابلِ غور ہے: ہم اپنی مادی دولت اور ساز و سامان کو جغرافیائی حد بندیوں میں قید کر سکتے ہیں لیکن علم و تہذیب کی دولت پر مہر نہیں لگا سکتے، وہ تو تمام انسانوں کی میراث ہیں۔ تہذیب کے میدان میں تنگ نظری سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں اور قوموں کی ترقی میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ ہے"۔

(بحوالہ ماہنامہ آجکل دہلی۔ اپریل ۱۹۵۹ ص: ۵) یہی وہ ابتدائی افکار تھے جن کی بنیاد پر مولانا آزاد نے ہمہ گیر قومی تعلیمی پالیسی کی بنیاد رکھی۔ انگریزی زبان اور سائنسی علوم کی تعلیم کے حصول پر انھوں نے خاص توجہ صرف کی ہے۔ وہ سائنس کے تعمیری پہلوؤں کے قائل تھے۔ سائنس کے مضر اثرات اور اس کے غلط استعمال سے بچنے کے لیے انھوں نے سائنس کو تہذیبی اور مذہبی کنٹرول میں رکھنے کی تلقین کی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہماری تعلیم کی بنیاد مشرقی اور ہندوستانی تہذیب پر استوار ہوتا کہ جدید تعلیم کے سبب ہم اپنی قومی میراث سے بے بہرہ نہ ہو جائیں۔ مولانا آزاد سائنس سے امن و آشتی اور انسان دوستی کی توقعات رکھتے تھے۔ وہ اس ایٹمک طاقت بننے کے خواہاں نہ تھے جو کہ انسانیت کے لیے سم قاتل ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی کی تشکیل کے لیے مولانا آزاد مشرقی علوم کے ساتھ مغربی علوم کی شمولیت کو بھی لازمی تصور کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا خیال تھا:

"

ہم اس طرز تعلیم کی افادیت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ اس تعلیم سے ہندوستانیوں کو بے اندازہ فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ اسی تعلیم کا صدقہ ہے کہ سائنس اور جدید فنونِ لطیفہ نے ہمارا دامن ہیروں سے بھر دیا ہے۔ اس تعلیم نے ہمارے اندر شعور ارتقاء کے سوئے ہوئے جذبات بیدار کے اور ہر معیار تعلیم اتنا بلند کر دیا کہ آج ہم اپنے گرد و پیش پر فخر کے ساتھ نظر ڈال سکتے ہیں" لے مولانا آزاد مشرق اور مغرب دونوں کے فلسفہ تعلیم کے مفید پہلوؤں اور اچھے مقاصد کے قائل تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جس

4

طرح مغربی فلسفہ تعلیم کے بغیر سائنسی ترقیات ناممکن ہیں اسی طرح مشرقی علوم کے بغیر باطنی یا روحانی ترقی ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے مشرق و مغرب میں یگانگت پیدا کرنے کی سعی کی اور دونوں کی ہم آہنگی سے ایسا نظام تعلیم وضع کیا جس سے انسان میں صحیح اور غلط یا اچھے اور برے کی تمیز پیدا غلط یا ہو سکے اور جنگ یا نفرت کے صحرا میں امن اور خیر سگالی کا نخلستان وجود میں آ سکے۔ دینی مدارس کو، جدید تقاضوں سے جوڑنے کے لیے انھوں نے لکھنو میں تمام دار العلوم کے سربراہوں کی کانفرنس کا اہتمام کر کے اس امر پر توجہ دی کہ دینی مدارس کے نصاب کو جدید طرز کا حامل بنایا جائے اور اس میں سائنس اور ٹکنالوجی کے ساتھ فلسفہ اور سماجی علوم کو بھی شامل کیا جائے جس سے طلباء محض برسرروزگار ہی نہ ہو سکیں بلکہ انھیں فکری آزادی کے مواقع میسر آئیں اور ان کی تعمیر نو ہو سکے۔ مولانا آزاد کے اس منصوبے کا واضح اظہار ان کے اس طویل دیباچہ سے بھی ہوتا ہے جسے انھوں نے رادھا کرشنن کی کتاب History Eastern and Western:of"philosophy کے لیے قلم بند کیا تھا۔

ہندوستان کثیر آبادی والا ایک جمہوری ملک ہے جہاں ناخواندہ افراد کی تعداد بہت زیادہ ہے لہذا جمہوریت کی جڑوں کو مستحکم کرنے، ملک کو خوشحال بنانے اور ناخواندگی کے اندھیروں کو مٹانے کے لیے انھوں نے تعلیم نسواں اور "تعلیم بالغاں" کے منصوبے کو وسعت دینے کی مقدور بھر کوششیں کیں۔ ہندوستانی ثقافت و کلچر اور یہاں کے مروجہ فنون کی بازیابی اور تحفظ کے لیے انھوں نے جو اقدامات کیسے وہ ساہتیہ اکادمی، للت کلا اکادمی اور سنگیت نامیہ اکادمی کی صورت میں
ہمارے سامنے ہیں۔

اعلیٰ تعلیمات کے شعبے کو آزادانہ کام کرنے، اسے با اختیار بنانے اور حکومت کی براہِ راست دخل اندازی سے محفوظ رکھنے کے لیے انھوں نے یو نیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC) جیسا اہم ادارہ قائم کیا جو اپنی کارکردگی کے سبب آج بھی اپنی علاحدہ شناخت رکھتا ہے۔ تعلیم کے معیار کو بلند اور بہتر بنانے کے لیے انھوں نے اس نوع کے اہم مشورے پیش کیے:

مولانا ابوالکلام آزاد نے تعلیم سے متعلق وضع کردہ منصوبوں کے عمل درآمد کے لیے جو ادارے قائم کیے تھے ان میں سے بیشتر کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ مولانا آزاد کی سعی پیہم سے، مشہور سائنس داں شانتی سروپ بھٹناگر کی سر براہی میں سائنسی اور ایٹمی ترقی کے ادارے کے علاوہ انڈین کاؤنسل فار ایگریکلچر اینڈ سائنٹفک ریسرچ، انڈین کاؤنسل فار میڈیکل ریسرچ، انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز، ساہتیہ اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی اور للت کلا اکادمی کا قیام اور عربی مجلہ ”ثقافت الہند“ کے اجراء کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ادارہ علوم مشرقیہ اور عثمانیہ یونیورسٹی میں ”ادارہ علوم اسلامی کا قیام مولانا آزاد کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے جس شعبے میں قدم رکھا وہاں ان کے نقش قدم آج بھی جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ ملک کی تقسیم نے انھیں وقتی طور پر دل برداشتہ ضرور کر دیا تھا لیکن وہ ہمت ہارنے والے انسان نہیں تھے۔ آزادی کے بعد ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی وضع کردہ قومی تعلیمی پالیسی ہے جس کے تحت ہندوستان میں ہزاروں اسکول، ڈیڑھ سو سے زیادہ یونیورسٹیاں، سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق تحقیقی ادارے اور متعدد ادبی وثقافتی اکادمیاں قائم ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق یہ خیال کہ وہ ماہر تعلیم نہیں تھے، اس وجہ سے درست نہیں ہے کہ وہ مذہب، فلسفہ اور سیاسیات کبھی پر گہری نظر رکھتے تھے اور انھیں ماضی کی صالح روایات کے ساتھ ساتھ زندگی کی نئی قدروں اور سمتوں کا بخوبی احساس تھا۔ وہ ماضی کی شاندار روایات سے باخبر، حال کے تقاضوں سے آشنا اور مستقبل کے امکانات کے رمزے میں تھے۔ ان کی عمر عزیز کا بیشتر حصہ علمی جدوجہد یعنی دلوں اور ذہنوں کی تعمیر میں بسر
مولانا زمینی اصلیت اور اس سے مضبوط وابستگی کے قائل تھے۔ تعلیم کے ذریعے دنیوی ترقی ان کا صحیح نظر، قومی تشخص اور انسان دوستی ان کا بنیادی مقصد تھا۔

توبہ وہ متحدہ قومیت اور سیکولرزم کے حال ایسے سانج کی تعمیر کرنا چاہتے تھے جو حق وانصاف اور باہمی محبت اور رواداری سے مزین ہو اور جس کے افراد بلند نظری، خوداعتمادی اور
دیانت داری کی اعلیٰ مثال بن جائیں۔ مولانا آزاد اس مکتب خیال کے حامی تھے جسے ہندوستانی قومیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور جس کی تعمیر و تشکیل میں امیر خسرو، کبیر داس تلسی داس، گرونانک، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خان خاناں، میر تقی میر، نظیر اکبرآبادی، مرزا غالب، مہاتما گاندھی اور رابندر ناتھ ٹیگور جیسے دانشوروں نے اپنے فکروفن کے چراغ روشن کر کے اس خاکداں کو ہمدوش آسماں بنا دیا تھا۔ یہی وہ طرز فکر ہے جس کے سبب اجنتا، ایلورا، سانچی، لال قلعہ اور تاج محل کے پرشکوہ حسن و جمال کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ مذہبی نظریات کی بوقلمونی، تہذیب وثقافت کی رنگارنگی اور کثیر لسانیاتی ملک ہندوستان کے لیے کسی ایسے مشترکہ اور صحت مند زاویہ نگاہ کو پیش کرنا جو سب کے لیے قابل قبول ہو، یقیناً جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ لیکن مولانا آزاد نے اپنی تبحر علمی اور دوراندیشی سے آزاد کی اس مشکل کام کو آسان بنا لیا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک بالغ نظر مفکر تھے۔ ان کی نظر میں زندگی محض یک گونہ بےخودی کا نام نہیں تھا بلکہ وہ علامہ اقبال کے الفاظ میں ”شمشیر و سناں اول“ اور ”طاؤس و رباب آخر کے قائل تھے۔ انھوں نے ایسا نظام تعلیم وضع کیا جو تعلیم کو تمدن کا تابع بناتا ہے، جو نہ صرف فطرت کے عام اصولوں کے مطابق ہے بلکہ آنے والی زندگی کا ساتھ دینے والا ہے اور جس کی تعمیر میں یہ لوظ رکھا گیا ہے کہ انسان ترقی ضرور کرے لیکن ستاروں کی تلاش میں اس کے پاؤں زمین سے نہ اکھڑ جائیں۔ مولانا زمینی اصلیت اور اس سے مضبوط وابستگی کے قائل تھے۔ تعلیم کے ذریعے دنیوی ترقی ان کا صحیح نظر، قومی تشخص اور انسان دوستی ان کا بنیادی مقصد تھا۔

41

اردو ڈرامے کا فنی جائزہ

نگراں

ڈاکٹر محمد بدرالدین انصاری

محمد مظہر سراج

ریسرچ اسکالر

ایل۔این۔ایم۔یو

دربھنگہ

ڈراما نگاری ایک قدیم فن ہے۔ادب کی تمام صنفوں میں ڈرامے کو غیر معمولی اہمیت حاصلہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس کی اہمیت بہت ہی دلکش انداز میں واضح کی ہے۔وہ کہتے ہیں:۔

ادب نے دنیا میں بڑے بڑے کام کئے ہیں ہنستوں کو رلانا
اور روتوں کو ہنسا دینا، دشمن کو دوست
بنانا اس کا ادبی کرشمہ ہے بگڑی بات کو، سنوارنا اور صاف
اور سیدھی باتوں کو بگاڑنا ایک کھیل ہے۔ایک ذراسی بات
میں ہزاروں سر کٹوادینا اور لاکھوں کا خون بہادینا، اور لمحہ میں
دو مخالفوں اور جانی دشمنوں میں جھٹ پٹ صلح کرادینا اس
کیلئے کوئی مشکل ہی نہیں۔وہ تلوار کا تقابلہ زبان سے اور نیزوں کا مقابلہ قلم

سے کرتا ہے دنیا کے دوسرے بڑے ادیبوں اور دانشوروں نے بھی ڈراما کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ اور اسے دیگر اصناف ادب کے مقابلے میں انسانی خیالات کے اظہار کا موثر ترین ذریعہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے مایہ ناز ڈراما نگار آغا حشر کاشمیری نے ڈراما کی اہمیت کو یوں بیان کیا ہے ناٹک بھی سوئے ہوئے لوگوں کو جگانے اور گرے ہوؤں
کو اٹھانے کا ایک زبروست ذریعہ ہے جو ترقی کا جوش اورا
صلاح کا جذبہ سیکڑوں وعظ اور ہزاروں لیکچر سُن کر برسوں
میں پیدا نہیں ہوتا۔وہ جوش اور جذبہ انسان کے اندر بہتر
طور پر ناٹک ایک رات ہیں پیدا کردیتا ہے،،

اس لئے دنیا کی تمام زبانوں کے ادب میں ڈراما بہت ہی مقبول ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عالمی ح پر اد کے آغاز وارتقاء میں ڈرامے کا بہت ہی اہم رول رہا۔ ہر فنکار کی طرح ڈراما نگار بھی کسی نہ کسی مقصد کی ترجمانی کیلئے ڈراما کی تخلیق کرتا ہے اور اپنے مقصد کی وفیاتم کیلئے زندگی کے مختلف حالات وحادثات سے چند واقعات کو چھین کرامے کی شکل میں پیش کردیتا ہے۔اس لئے بعض ناقدین ادب کا خیال ہے کہ ڈراما وہ فن جس میں زندگی کے حقائق کو منعکس کیا جاتا ہے۔

تیم وجدید ڈراموں کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ڈراما کے اجزائے ترکیبی کم وبیش مندرجہ ذیل ہیں۔

اپلاٹ: ڈرامے میں جو واقعہ پیش کیا جاتا ہے اس کی ایک خاص ترتیب ہوتی ہے جس کو اصطلاح نہیں پلاٹ کہتے ہیں۔ڈرامے کے پلاٹ میں ایک ایسے واضح تسلسل کا پتہ چلتا ہے جس کو ڈرامائی خط کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں اس ڈرامائی خط میں عام طور پر پانچ ایسے نقطوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جو پلاٹ کے تسلسل کے پانچ مراحل کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ مراحل مندرجہ ذیل ہیں۔(الف) آغاز (ب) ارتقا مر یا روئیدگی (ج) عروج (د)

تنزل یا تقابل عروج (ہ) انجام

رات مراحل کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی

(الف) آغاز:

قوت سامعہ کے ساتھ ساتھ قوت باصرہ بھی متاثر ہوتی ہے۔

ڈراما کے اقسام

مجموعی طور پر ڈرامے کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ڈرامے مختلف قسم کے پلاٹ پر بنی ہوتے ہیں بعض ڈراموں کے پلاٹ سنجیدہ اور غمگین ہوتے ہیں تو بعض کے پلاٹ مسرت افزا و شگفتہ ہوتے ہیں ان ڈراموں کو اصطلاح میں علی الترتیب المیہ اور طربیہ کا نام دیا جاتا ہے لیکن بعض ڈرامے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی کہانی بیک وقت ان خواہم اور مسرت و شادمانی کے جذبات سے مملو ہوتی ہے۔ایسے ڈراموں کو المناک طربیہ یا طرب ناک المیہ کا نام دیا جاتا ہے۔ایسے ڈراموں کو کہتے ہیں جن کے قصے کا انجام المناک ہوتا ہے عموماً ڈرامے میں غم والم کی کیفیتوں کو مندرجہ ذیل طریقوں پر پیش کیا جاتا بعض ڈرامے ایسے ہوتے ہیں جن کے آغاز میں طربیہ کیفیت ہوتی ہے۔

میں غم کی کیفیت ہوتی ہے اور انجام بھی غم ناک ہوتا ہے۔بعض ڈرامے میں ابتدای مرحلے سے درمیانی مرحلہ تک طربیہ کیے کیفیت رہتی ہے لیکن انجام غم ناک ہوتا ہے۔بعض المیہ ڈرامے میں شروع سے آخری مرحلے تک طربیہ کی کیفیت برقرار رہتی ہے لیکن صرف انجام غم ناک ہوتا ہے۔

42

طربیہ الطربیہ ایسے ڈرامے کو کہتے ہیں جس میں قصے کا انجام وانبساط پر ہوتا ہے قدیم وجدید دور میں طربیہ ڈرامے بہ کثرت ملتے ہیں۔ ان میں نیکی و بدی کی جنگ ہوتی ہے۔ شروع میں ایسا لگتا ہے کہ نیکی پر بدی حاوی ہو لیکن انجام ایسا نہیں ہوتا ہے بلکہ ڈرامے کے اختتام عظیم نیکی بدی کو شکست دے دیتی ہے اور قارین کے دل و بارے میں خوشی اور انبساط کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ المناک طربیہ المناک طربیہ ایسے ڈرامے کو کہتے ہیں جس میں قصے کا انجام المناک ہوتا ہے۔ ارسطو نے المناک طربیہ کو خاص اہمیت دی ہے یونانی ڈراموں میں اس قسم کے ڈرامے ملتے ہیں۔ المناک طربیہ ڈراما لکھنے کیلئے بہت ہی احتیاط اور تجربے کی ضرورت ہے۔ المیہ اور طربیہ کی آمیزش سے ڈرامے کی دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے۔ جدید دور میں اس طرح کے ڈرامے زیادہ لکھے جارہے ہیں۔ میلوڈرا کا یہ المیہ اور طربیہ سے ملتی جلتی ڈرامے کی ایک الگ ہے۔ میلیو ایک یونانی لفظ ہے۔ جس کے معنی گیت کے ہیں اس میں گیتوں اور نغموں کی کثرت ہوتی ہے۔ اردو میں بھی میلوڈرامے لکھے گئے ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ اردو اسٹیج او پیرا ہی سے شروع ہوا تو زیاد صحیح بات ہوگی۔ چنانچہ واجد علی شاہ اختر نے اپنے او پیرے کارہ" رکھا جو ہندوستان کے کونے کونے میں مشہور ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ اس قسم کے ڈراموں ٹیر کا فقدان ہوتا ہے۔ خیر فنی اعتبار سے اس قسم کے ڈراموں کی اہمیت کم ہوتی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایجاد نے ڈراموں کی ہیئت میں کچھ ترمیم ضرور کی ہے۔ لیکن آج ڈرامے کے فروغ میں ریڈیو کا بہت ہی اہم رول ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے ڈراما نگار جو ریڈیو اور ٹیلی ویژن مور سے لکھ رہے ہیں انھیں خاص مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ دوسرے ڈرامے مثلاً انجام اور دوسری شام بھی قابل ذکر ہیں لیکن حبہ خاتون کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ دنیا کے تمام ادب اور فن پر سائنسی ترقی کا اثر پڑا جس کی بنا پر نئی نئی چیزوں کی ایجاد ہوئی ادب بھی اس سے متاثر ہوا سینما، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایجاد کی۔ دنیا کے فنکار بھی اپنے فن کی تبدیلی پر مجبور ہوئے۔ یوں تو اردو اصناف ادب میں شادی افسانہ ناول نے جدید تبدیلی کو فوری طور پر قبول کیا۔ دیر سے ہی سہی لیکن اردو ڈراما نگاری بھی اس تبدیلی سے متاثر ضرور ہوئی اور اردو ڈراموں میں ریڈیائی ڈراما، ایک ایکٹ کا ڈراما یعنی یک بابی ڈراما، ٹیلی ڈراما وغیرہ اسی کا نتیجہ ہے۔ اردو کے چوٹی کے فنکار خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، مہندر ناتھ سعادت حسن منٹو، اختر الایمان، ساغر سرحدی، جاں نثار اختر عصمت چغتائی، کیفی اعظمی، ڈاکٹر محمد حسن، پطرس بخاری، اسلام، راجہ مہدی علی خاں، رفعت سروش کمار پاشی اسد بھوپائی، کیف بھوپالی، اظہ افسر، ابراہیم یوسف احبیب تنویر، اور سلیم جاوید وغیرہ نے اسٹیج کے علاوہ فلموں کیلئے بھی جاوید ڈرامے اور مکالمے لکھتے ہیں۔ بہار میں منشی کیشو رام بٹ، مولوی سید محمد نواب، منشی خواجہ محسن علی مونگیری، معاشی زوار حسین اختر اور ینوی، سہیل عظیم آبادی، سمیع الحق، طارق جمیلی شفیع مشہوری سید ظہیر احسن، شین مظفر پوری، از کی انور، وہاب اشرفی شمیر فاروقی، اور سید مظفر اقبال وغیرہ نے دور قدیم اور دور جدید میں مکمل اور یک بابی مختصر ڈرامے تحریر کئے ہیں۔

43

غالب کی شاعری اور موجودہ صورتحال

شاذیہ بینش

بہار

ابتدائے آفرینش سے تا حال، نابغہ روزگار فنکاروں کے ورود مسعود کا سلسلہ جاری ہے۔ ہندوستان کے فنکاروں میں کالی داس، کبیر، امیر خسرو، میر تقی میر، ٹیگور اور اقبال کے ساتھ سب سے اہم اور نمایاں نام نجم الدولہ، دبیر الملک، مرزا نوشہ اسداللہ خاں غالب کا ہے جنھوں نے شعروادب میں اجتہاد کر کے اپنا نام تاریخ ادب میں نہ صرف محفوظ کر لیا ہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کی معنویت اور اثر انگیزی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ کلام غالب کی معنویت اور انثر انگیزی پر اظہار خیال کرتے ہوئے سہا مجددی لکھتے ہیں:

وہی غالب جس نے اب سے تقریباً ایک صدی پیشتر اردو شاعری میں، اپنی ندرت تخیل ومضامین، اپنی جدت اسلوب وادا، اپنی نزہت تشبیہات و استعارات اور شوکت تراکیب والفاظ سے ایک ایسا باب کھول دیا جس میں گویا ایک نئی دنیا نظر آنے لگی۔ یہ ارتقائے شعر کی ایسی کڑی تھی، جو اس وقت تک آخری کبھی جا رہی ہے۔ ایسے کلام کی اشاعت کا قدرتی نتیجہ اس طرح ظاہر ہوا کہ اہل نقد نے تنقیدی نگاہیں ڈالیں۔ سطح آشنا آنکھیں مطالب کی گہرائیوں
تک کام نہ کر سکیں۔ انھوں نے جدت کو مجہول مضمون آفرینی کو، کوہ کندن و برآوردن، تراکیب بلیغ کو گورکھ دھندا، شوکت الفاظ کو اخلاق کہہ کر پکارا۔ لیکن امتداد خیلی اذہان ہے، چنانچہ ایک مدت کے بعد ایک بڑا طبقہ ایسا پیدا ہو گیا
جس نے تعمیق فکر سے کام لیا اور دنیائے اردو اس کلام کی تحسین و داد کی آوازوں سے معمور ہو گئی اور خال ہے کہ اردو کا ذوق شعر جس قدر بلند ہوتا جائے گا غالب کی شاعری کے محسن زیادہ نمایاں اور حسوس ہوتے جائیں گے۔ غالب کا عہد سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے شدید بحرانی دور تھا جس میں پرانی روایات دم توڑ رہی تھیں اور نئی اقدار کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ غالب نے آنے والے نئے نظام کے قدموں کی آہٹ محسوس کر لی تھی اس لیے تبدیل شدہ حالات میں خود کو ڈھالنے میں انھیں دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ پرانے نظام کے پروردہ اور اس کے زوال کے تماشائی تھے اور ابھرتے ہوئے نئے نظام کے ناظر بھی۔ انھیں پرانی روایات سے لگاؤ تھا اور اس کی شکست وریخت کا شدید ملال بھی، جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے:

ہندوستان مایۂ گل پائے تخت تھا
جاہ وجلال عہد ووصال بتاں نہ پوچھ
اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دتی میں رہیں کھادیں گے کیا

حالات کی نامساعدت اور ستم ظریفی کے سبب ان کی کیفیت اگرچہ رقص نیم نمل کی سی تھی لیکن مزاج کی رجائیت، شوخی اور روشن خیالی کے باعث اس نوع کے حوصلہ افزا
اشعار کلام میں نئی معنویت اور بصیرت پیدا کر دیتے ہیں:

منظر ایک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

غم نہیں ہوتا ہے آزاروں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

ان آبلوں سکے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر
عشرت قتل گہہ اہل تمنامت پوچھ۔
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

یہ وہ اشعار میں جو اتی غم کے حامل ہونے کے باوجود آفاقی حیثیت اختیار کر لیتے
ہیں۔ شاہ کا ماہرہ قاری کا تجربہ بن جاتا ہے اور محسوس کرنے لگا ہے کہ:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

44

میں نے یہ جانا کہ گو یا یہ بھی میرے دل میں ہے
اگر چہ غالب کو سائنس سے کوئی مناسبت نہ تھی لیکن غور وفکر کی عادت اور ذہن رسا
کے سبب معرض وجود میں آنے والا ان کا یہ شعر:

ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جاتا

سائنس کی Evaporation Theory کا عکاس بن جاتا ہے۔کلام غالب میں ایسے کئی اشعار مل جاتے ہیں جنھیں ان کی تفس طبیعت اور نئے علوم کے تئیں ان کی دلچسپی
کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔مثلاً:

سبزہ وگل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے
ہے کائنات کو حرکت ترے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے
5
ہے رنگ لالہ وگل ونسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

فکر وفلسفہ اور علوم جدیدہ سے متعلق اشعار اردو شاعری میں سب سے پہلے غالب
کے یہاں ہی نظر آتے ہیں۔

کلام غالب کا وہ عصر جو نئی نسل کو بطورِ خاص متاثر کرتا ہے، ان کی صاف گوئی، جرات رندانہ اور ان کا وہ نشاطیہ آہنگ ہے جس کی زد میں خود ان کی ذات بھی محفوظ
نہیں رہتی۔مثلاً:

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے ونغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں
نہ گل نغمہ ہوں، نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
مارا زمانے نے اسداللہ خاں! تمھیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

: غالب کے مزاج کی شوخی ، ذہانت اور رجائیت ، ان کی مقبولیت، اور عظمت کا سبب ہی نہیں بلکہ کلام کی معنویت میں اضافے کا باعث بھی ہے۔غالب نے اپنی فکر وبصیرت سے اختراع واکتساب کے میدان میں نئے امکانات اور نئی سمتوں کا احساس دلا کر نئی نسلوں کو متاثر کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر عہد کا جدید ذہن غالب کو اپنا ہمدم اور ہم خیال تصور کرتا رہا ہے اور مستقبل قریب وبعید میں بھی اس سلسلے کے اسی طرح جاری رہنے کا امکان ہے۔

45

علقمہ شبلی کی نظمیہ شاعری

تحسین زاہد

Research scholar
L.n.m.u Darbhanga
supervisor
Dr Md Nasimuddin

ایک ذہین فن کار اپنے فن پارے کی تخلیق کے دوران ان باتوں کا خاص خیال رکھتا ہے، جو صحیح معنوں میں اس کے بچے فن کار ہونے کا ثبوت تو پیش کرتی ہی ہیں، ساتھ ہی ساتھ موضوعات کی پیشکش کے دوران آفاقی قدروں کی نمائندگی بھی کرتی ہیں۔ علقمہ شبلی کی نظموں کا مطالعہ کرنے پر واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے نظموں کی تخلیق کے دوران آفاقی قدروں کی شمولیت کو بہ طور خاص اہمیت دی ہے۔ یعنی ان کی نظمیں ایک خاص علاقے تک محدود ہونے کے باوجود اپنے اندر امکانات کی وسعتیں رکھتی ہیں۔ علاقائی موضوعات اور پس منظر سے متعلق ہونے کے باوجود وہ نظمیں آفاقیت کی سرحدوں میں داخل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ مثلاً شہر کلکتہ، اس کی زندگی اور اس کے متعدد مسائل کو انہوں نے اپنی بعض نظموں میں اس طرح پیش کیا ہے کہ وہاں کی زندگی کا درد، وہاں کی گھٹن، تاپ، بے چارگی، اور افسردگی کا احساس شدت کے ساتھ ہمیں تڑپانے لگتا ہے، اور ذہن کے پردے پر سارا منظر واضح ہوتا چلا جاتا ہے، اور ہم اس دردو کرب میں برابر کے شریک ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن غور کیا جائے تو اس نوعیت کی نظموں کا پوشیدہ پہلو بھی ہماری نگاہوں کے سامنے روشن

ہے

جاتا ہے، اور وہ پوشیدہ پہلو یہ ہے کہ ہم ایسی نظموں کے آئینے میں کسی بھی بڑے شہر کی تباہ ہوتی ہوئی زندگی، اور وہاں کے مصنوعی ماحول میں قدروں کی شکست وریخت کا المیہ بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔ علقمہ منیکی نے اپنی نظموں میں کلکتہ کی زندگی کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ایسی نظموں کے تجزیے میں علاقائیت کا محدود پیمانہ محاسبے کے لیے کسی بھی طرح قابل قبول نہیں رہ جاتا۔ ایسی نظموں میں کلکتہ یا کوئی اور شہر کلیدی استعارے کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے اور اس طرح حقیقت ایک نئے تناظر میں جلوہ کشا ہوتی چلی جاتی ہے، ایسی نظموں میں علقمہ شبلی نے کلکتہ کی زندگی کو بنیاد بنایا ہے۔ وہاں کے رہن سہن اور طور طریقے کو نئے زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھنے کی سعی کی ہے:

رات کے اندھیرے میں
چاند منہ چھپائے جب
نیند کے بچھونے پر
اونگھ اونگھ جاتا ہے
کہکشاں کی ڈولی سے
بار اور ہوٹل میں
روشنی اترتی ہے
جام پھر کھنکتے ہیں
کیبرے بھی ہوتا ہے
آدمی بہکتا ہے
زندگی سکتی ہے
کول تار کی سڑکیں
ہانپتی ہیں یوں جیسے
گھٹ رہا ہے دم ان کا
ہر نظر پھلتی ہے
ہر قدم پھلتا ہے
بھیڑ میں جلوسوں کی
کھو گیا ہر اک چہرہ
شورشوں میں نعروں کی
سو گئی صدائے دل
پرچموں کے سائے میں
زندگی سوالی ہے
انقلاب آئے گا
انقلاب زندہ باد

(نظم کلکتہ)

شہر جاں کی گزرگاہیں برسوں رہیں میری جولان گہر
میں گزرتا رہا
پاشکت کبھی سر برہنہ بھی

46

دل گرفتہ کبھی
شہرجاں کی گزرگاہیں برسوں رہیں میری جولان گہر
پھر بھی میں اجنبی ہی رہا
زندگی سے تو کیا
آپ اپنے سے بھی موقع ہم کلامی نہ مجھ کو ملا
شہر کرفیوزدہ
گھر صداؤں کا اک مقبرہ

(نظم شہرجاں)

روزن ودر میں تالے پڑے
لال، پیلی، ہری روشنی
ذہن کو تیرہ تر کرگئی
اک قیامت برپا یوں سحر کرگئی
ہے یہ معلوم
صبحیں کبھی نغمہ برلب یہاں جاگتی تھیں
صبا موج درموج آتی تھی
اور گدگداتی تھی کلیوں کو بھی
بستیوں میں اترتی تھیں شامیں بھی ساغر بکف
روشنی گنگناتی تھی
رقصاں تھی ہر گام پر زندگی۔
اب نہ میں میں نغمہ بلب اب
نہ شامیں ہیں جام طرب
آگ وخون اور بارود کی بو ہے چاروں طرف

(نظم شہر کرفیوزدہ)

یہ اس شہر کی مختلف تصویریں ہیں، جہاں ملازمت کی غرض سے علاقہ میل کا آنا ہوا اور پھر وای شہر کے ہوکر رہ گئے۔لیکن ان نظموں میں صرف کلکتہ یا کسی مخصوص شہر کا ہی نوحہ بیان نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے آئینے میں پورے ملک کا انتشار دیکھ سکتے ہیں۔تمام بڑے شہروں کی روتی بلکتی زندگی ہماری نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔

مغربی بنگال کی مختلف النوع تہذیب علقمہ شبلی کی نظموں میں روپ بدل بدل کر سامنے آتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ سچا فن کا اپنے تخلیقی فرائض کو کبھی فراموش نہیں کرتا، سماج اور معاشرے کا حصہ ہوتے ہوئے فن کار اپنے گرد وپیش کا محاسبہ جب فن کار کی آنکھوں سے کرتا ہے تو زندگی کی ایک مختلف شعبیہ سامنے آتی ہے۔ وہ شیبہ جو ایک عام انسان کی نگاہوں سے تو محور بنتی ہے لیکن فن کار کی دوررس اور باریک میں نگاہیں اس مخفی شبیبہ کو کسی طرح تلاش کر رہی لیتی ہیں۔علقمہ شبلی نے اپنی نظموں کی تخلیق کے دوران اپنے اطراف و جوانب کی زندگی کو پہلے تو ایک عام انسان کی نگاہ سے دیکھا ہے، اور پھر ایک فن کار کی نگاہوں سے اس زندگی کا تجزیہ کرنیکی کوشش کی ہے۔ایسی صورت میں زندگی کا

6

جو منظر نامہ ہمارے سامنے آتا ہے، وہ احساس کے تاروں کو چھیڑنے میں کوئی کسر نہیں
چھوڑتا:

دشت دل میں آج کون
فیل بے زنجیر کی مانند پھر
سر اٹھائے بے دھڑک
آ رہے ہیں تیز تر
اپنی سونڈوں میں
لیے زہراب مکرو دشمنی
تا کہ ڈھائیں کعبہ دل
ذائقہ مجھ کو چکھائیں موت کا
ہے تمنا آج زخمی
آرزو کے لب پہ ہے مہر سکوت
اے ابابیلو، کہاں ہو آج تم
سنگریزوں کی کرو بارش کہ پھر
صورت خاشاک وخس
پارہ پارہ جس سے ہو جائیں یہ فیل

(نظم" بارش سنگ)

آرزو تھی مرے وجود کو بھی
کاش مل جائے لمحہ تکمیل

7

تپ کے بھٹی میں وقت کی پیہم
مثل کندن ہوا اس کی بھی تجلیل
دیکھتے دیکھتے رگ وپے میں زہر ہی

47

زہر گھل گیا لیکن
لٹ گئی ہر متاعِ در
دمری رہ گیا خواب لمحہ تحمیل

(نظم الحیر تحمیل)

چلو اچھا ہوا، کوئی صدا بھی اب نہیں آتی
صبا بھی کوئی پیغام طرب افزا نہیں لاتی
چٹکتی ہے کلی کوئی
نہ پتی کوئی بہتی ہے
در دل پر کوئی دستک نہیں ہوتی
نہ مشرق میں، نہ مغرب میں
کہیں بھی اب نہیں جائے اماں کوئی
یہی مٹی
مری مٹی متاع بے بہا مجھ کو
اسی مٹی کی خوشبو سے
مشام جاں معطر ہے
اسی مٹی کو میرے خوں نے سینچا ہے
گل خنداں اگا یا ہے یہی گلیاں
مری گلیاں
نشاط وشوق کا ساماں
انہیں گلیوں میں اب بھی میرا بچپن مسکراتا ہے
بہ این گرد حوادث بھی
دمکتا ہے مرا چہرہ
یہی محسوس ہوتا ہے
مرے قدموں میں جنت ہے

(نظم مئی)

علقمہ شبلی کی نظمیں سماج اور معاشرے کے ایک عام انسان کے جذبات واحساسات کا احاطہ کرتی ہیں۔ وہ عام انسان جسے بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ سماج اور معاشرے نے حاشیے پر رکھ دیا ہے۔ وہ عام انسان جو سماج اور معاشرے کی ترقی کے لیے ایک وسیلے کے طور پر بے دردی کے ساتھ استعمال تو کیا جاتا ہے، لیکن سماج کی تعمیر، تشکیل اور ترقی میں اس کے وجود سے صاف انکار کیا جاتا ہے۔ اسے ہر قدم پر نظر انداز کیا جاتا ہے، جیسے زندگی کے منظر نامے پر اس کے برائے نام وجود کا احساس بھی اجاگر ہو جائے تو یہ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو جائے گا۔

48

ابونصر غزالی کی شخصیت میری نظر میں

ڈاکٹر شفیع الرحمٰن

اردو ادب کی تاریخ کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات ہم پر آشکار ہوتی ہے کہ ہر عہد میں چند ایسے باکمال اور برگزیدہ ادیب وشاعر پائے جاتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اردو زبان وادب کی خدمت میں صرف کر دیا لیکن ان کی غیر معمولی خدمات کا اعتراف تب ہی کیا جاتا ہے، جب وہ ہمارے درمیان سے اٹھ جاتے ہیں، حالانکہ اگر ان کی زندگی میں ان کے کارناموں کی قدر شناسی کی جائے تو کم از کم انہیں یہ تسکین بخش احساس ضرور ہوگا کہ انہوں نے اپنی زندگی کو یوں ہی نہیں صرف کیا تھا۔ گویا کہ ابونصر غزالی اپنے وقت کے اردو دانش وری کی آبرو ہیں۔ وہ ادبی انتقادیات کے امیر، درس وتدریس کے رمز شناس، اساتذہ کے رہبر اور بصیرتوں کے حامل انسان تھے۔ ان کے اجداد کو پیشہ تدریس میسر تھی، ان کو بھی پیشۂ تدریس راس آیا۔ متن کی تدریس یا خطابت میں ان کی ساحری سے کلاس روم اور مذاکرے کی نشستیں زیر وزبر ہوتیں، سامعین بھی دم بخود ہوتے، نجی محفلوں میں ایسی خیال افروز گفتگو کرنے والا بھی مشاہدے میں کم کم ہے۔

ان کی ادبی اور تنقیدی خدمات کا اگر جائزہ لیا جائے تو ایک جہانِ دیگر نظر آئے گا۔ ان کی تنقیدی بصیرت اور ادبی تفہیم ہماری دانش وبینش کو نور ونظر بخشنے کا سامان فراہم کرتی ہے اور تخلیقی انبساط سے سرشار کرتی ہے۔ وہ غور وفکر کے روشن دریچوں تک رسائی میں معاون ہوتی ہے۔ تخلیق سے براہ راست تعلق قائم کرنے کا شوق پیدا کرتی ہے۔ وہ قاری کے مطالعے کو مہمیز یا مائل کرنے کا جوہر رکھتی ہے۔ ان کی تنقید ذہنی خلجان میں مبتلا نہ کر کے اقدار واحساس کو آسودگی بخشتی ہے اس لیے وہ بہت پسند کی جاتی ہے۔

ابونصر غزالی صاحب کی شایان شان میں کچھ کہنا یقیناً میرے لیے چھوٹا منہ بڑی بات کے مثل ہے مگر اس کے باوجود ان کی شخصیت نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ کسے معلوم تھا کہ میر غیاث چک میں پیدا ہونے والا یہ قلم کار ایک روز اپنے علم کی روشنی سے پوری ادبی دنیا کو منور کرے گا۔ نصر غزالی کی شخصیت ہمہ گیر ہے، جو بیک وقت شاعر وادیب کے ساتھ ساتھ اچھے نثر نگار اور اعلیٰ پایہ کے ناقد کے ساتھ ساتھ ایک لائق استاد بھی تھے۔

یہ میری خوش بختی ہے کہ میں اپنی زندگی کا کچھ حصہ ان کی شاگردی میں صرف کیا۔ موصوف اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی نباہنے والوں میں سے ایک تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو صرف خلوص کے ساتھ پڑھاتے ہی نہیں تھے بلکہ اپنے شاگردوں کے اندر چھپے ہوئے جوہر کو ڈھونڈ نکالتے تھے اور اس کی خوبیوں کو خوب سراہتے پھر انہیں اپنے خراد پر چڑھا کر نگینہ بنا دیتے تھے۔ ان کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے یہاں نام گنوانا مقصود نہیں۔

میری پہلی ملاقات ان سے 1994ء میں مولانا آزاد کالج میں ہوئی جب میں اس درس گاہ کے کلاس روم میں بحیثیت ایک طالب علم بیٹھا تھا، ان کے آتے ہی سارے طلباء احتراماً کھڑے ہو گئے سبھوں کو آپ نے بیٹھنے کو کہا پھر فرداً فرداً تعارف ہوا۔ میں نے اس سے پہلے ایسی پروقار شخصیت نہیں دیکھی تھی، جن کی آواز گداز او شیریں تھی جو اپنی طرف کھینچے بغیر نہیں رہتی تھی۔ وہ متن کو اس طرح پڑھاتے کہ ان کی ہر باتیں دل میں گھر کر جاتی تھیں۔ بقول پروفیسر عبدالمنان ان باتوں کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''مختصر یہ کہ ابونصر غزالی ایک
> کامیاب استاد، ایک خوش فکر
> شاعر، ایک اچھے نثر نگار اور ایک
> با اخلاق وباتمیز انسان کا نام ہے
> ۔ انہوں نے اپنے مرتبے ومقام
> کا لحاظ رکھا اور کوچۂ رقیب میں
> بھی سر کے بل جانے کی کوشش
> کی۔ ایسے شخص کے لیے درازئ
> عمر کی دعا ہونٹوں پر مچلتی ہے۔''

نصر غزالی کی شخصیت ان ہی خوبیوں کی مالک ہیں جن کی ذات خود ایک آئینہ خانہ ہے۔ ان کی شخصیت علم وعرفان کا روشن چراغ کے مثل ہے۔ وہ سچائیوں کا نقیب اور خلوص ومحبت کی جیتی جاگتی تصویر ہیں جو خال خال ہے۔ نصر غزالی میں ایک خوبی اور تھی جو بہت کم لوگوں کو معلوم ہے یا بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ سر اپنے شاگردوں سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ اگر کوئی شاگرد کسی پریشانیوں سے دوچار ہوتا تو اس کی پہلی فرصت میں مدد کرتے تھے۔ چاہے علم سکھانے میں مدد کرنی ہو یا کسی طرح کی ذاتی ضروریاتِ زندگی ہو یا پھر مالی مشکلات کا سامنا ہو یا رہائشی معاملہ ہو۔ سر سے جہاں تک ممکن ہوتا مدد کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بقول سید حسن

ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

49

ان باتوں کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''غزالی صاحب کی شخصیت
کئی طرح سے کامیاب ثابت
ہوئی مدرس کے نقطۂ نظر سے
جائزہ لیں چاہے بامروّت
انسان کے زاویے سے
پرکھیں۔ ان کے دونوں گوشے
انتہائی مکمل ہیں۔''

ابونصر غزالی صاحب کا نام بنگال ہی نہیں بلکہ پورے ہندستان اور برصغیر میں نمایاں ہے۔ ان کی فکری کاوشیں کسی سے پوشیدہ نہیں، اردو ادب میں ان کا نام نہایت ہی ادب کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اردو ادب کے گیسو سنوارنے میں وقف کر دیا۔ پختہ گو شاعر وادیب تھے یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ کوئی شاعر و ادیب کسی ایک قصبہ، شہر، صوبہ یا ملک کا نہیں ہوتا یعنی اس کی تخلیق کسی فردِ واحد کے لیے نہیں ہوتی بلکہ ہر عام وخواص کے لیے ہوتی ہے اس کے دل میں جو دکھ درد ہوتا ہے وہ کلِ کائنات کے انسان کا دکھ درد ہوتا ہے۔ شاعر وادیب یا فنکار کسی مخصوص رنگ ونسل کا پرستار نہیں ہوتا چنانچہ استاد محترم نصر غزالی صاحب کا بھی دل رنگ ونسل، ذات پات کی کدورت سے پاک تھا۔ ان کا دل ایک آئینہ کی مانند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ صدق گوئی سے کام لیتے تھے۔ ان کے اشعار فطری ہوتے ہیں جو پڑھنے اور سننے والے کے ذہن میں آسانی سے نقش کر جاتے ہیں غرض کہ نثر اور نظم دونوں اصناف پر ان کی گرفت تھی۔ یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ شاعر وادیب وہی نہیں بیان کرتا ہے جو اس کے دل پر گزرتی ہے بلکہ وہ اس کو بھی بیان کرتا ہے جسے وہ محسوس کرتا ہے، ان کے اس احساسات کو ہم ان کے شعری مجموعے ''لہو کا درد'' اور ''اونچائیوں سے اترتی صدا'' میں دیکھ سکتے ہیں۔

ابونصر غزالی مولانا عبدالجبار کے فرزند تھے اور ان کی والدہ کا نام عائشہ خاتون تھا۔ آپ کی پیدائش 4/ اکتوبر 1938ء کو ضلع نالندہ کے میر غیاث چک میں ہوئی۔ سرزمین کلکتہ میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ 1961ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انہوں نے ایم-اے کے امتحان میں نمایاں نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ درس وتدریس سے انہیں اس قدر دلچسپی تھی کہ انہوں نے معلمی کے پیشے کو اختیار کر لیا۔

1961ء جون سے اکتوبر 1969ء تک پرولیا ضلع اسکول میں وہ بحیثیت اسسٹنٹ ماسٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ درس وتدریس کا سلسلہ اسکولی سطح تک ہی محدود نہیں رہ جاتا ہے بلکہ یہ تشنگی انہیں پروفیسر کے مقام تک پہنچاتی ہے۔ 1969ء سے 1998ء تک مولانا آزاد کالج کلکتہ کے شعبۂ اردو سے منسلک ہوجاتے ہیں اور یہیں سے ان کی ادبی زندگی کو پروان چڑھنے کا موقع ملتا ہے اور یکے بعد دیگرے ان کی کئی تخلیقات منظر عام پر آئیں جیسے ان کے شعری مجموعے ''لہو کا درد'' (1982ء)، ''اونچائیوں سے اترتی صدا'' (2001ء) اور ''دور ایک پیڑ'' (2005ء) وغیرہ۔ اس کے علاوہ 1986 میں مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے ان کی ایک تالیف ''بنگالی شعراء'' شائع کی جو بہت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ اس مجموعہ میں 26/ قدیم وجدید بنگالی شعرا کے حالات اور ان کی نظموں کا ترجمہ ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے صلے میں مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ سے نوازا۔ اس کے علاوہ وہ کئی دیگر اعزازات سے بھی سرفراز ہوتے رہے۔ ان کے شاہکار تخلیقی کارنامے ''لہو کا درد'' پر بہار اردو اکاڈمی نے بھی اعزاز سے نوازا۔ ان کے اس احساسات کو ہم ان کے شعری مجموعے ''لہو کا درد'' میں محسوس کر سکتے ہیں۔ ''لہو کا درد'' سے کچھ اشعار ملاحظہ کریں:

ہیں کن لمحات کے ہم لوگ زائیدہ
کہ رشتوں میں بھی کاروبار رکھتے ہیں
لہو نے رنگ کچھ اس طرح آج بدلا ہے
کہ ادھ کھلا بھی کہیں کوئی در نہیں ملتا
زیست کے شہر میں یہ کیسی اذیت ناکی
پل دو پل کے لئے تو درد کا در بند رہے
مرے وجود کے خانے میں سب کا سب رکھ دو
لہو اُگلتا ہوا دن سلگتی شب رکھ دو
بے سبب احساس اپنی بے وجودی کا نہیں تھا
روز وشب کے پاٹ میں پستا مقدر سامنے تھا
نام پر خوش منظری کے یہ تہی نظارگی
آس پاس آنکھوں کے کچھ تو خواب سا باقی ہے

نصر غزالی کی شخصیت خوشامدی سے کوسوں دور تھی وہ خوشامد پسندی کو اپنے آس پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتے تھے وہ خوشامد پسندوں سے بہت گریز کرتے تھے۔ نہ خود جھکتے تھے اور نہ کسی دوسرے کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کرتے تھے، الغرض وہ اپنی انا کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اپنے اصولوں سے مصالحت کرنا ان کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔ موصوف

50

کی ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے اور ان کا خلا کبھی پُر نہیں ہو سکتا ہے۔ وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہو کر بھی رخصت نہیں ہوئے ہیں، کیوں کہ وہ ادبی دنیا میں اپنی تخلیقات کے ساتھ ہمیشہ موجود رہیں گے۔

ہم ان کی ایثار اور قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے یہ تو دنیا کا دستور ہے کہ لوگ ملتے ہیں اور پھر بچھڑ جاتے ہیں مگر یادیں اور کارنامے، بچھڑنے والے کی ہمیشہ یاد دلاتے رہتے ہیں۔ المختصر ہم ان کے کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے ان کی یادیں ہمارے ذہن میں خوشبو کی طرح معطر رہے گی، وہ اپنے اصول کے پکے تھے۔ انہیں اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی احساس تھا۔ وہ شروع سے آخر تک اپنے تمام فرائض کو بحسن وخوبی انجام تک پہنچاتے رہے۔ بقول پروفیسر ڈاکٹر عبدالمنان ان باتوں کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''افکار کی نئی و بامعنی جہتوں سے
آشنا ہونا اور نیک نیتی کے ساتھ
لوٹانا، شیشہ گری کا عمل ہے جس
میں محنت زیادہ لگتی ہے۔ میرے
اور ان کے درمیان کا رشتہ مولانا
آزاد کالج سے قائم ہوا اور آج
تک قائم ہے۔ اس درمیان بادِ
سموم کے جھونکے نے خیمۂ دوستی
کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی،
استاد شاگرد کے رشتے کے
آبگینے میں ٹھیس لگانے کی
کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ملی۔
کامیابی تو جب ملتی کہ میں یا وہ
اپنے مقام سے اُترنے اور کان
دھرنے میں فیاضی دکھاتے۔''

کلی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ابونصر غزالی کی شخصیت بڑی جامع ومتنوع ہے انہوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اسے بخوبی انجام تک پہنچایا ہے۔ گویا کہ جب ہم ان کی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم پر ان کی فکری وفنی بصیرت اور ان کے غور وفکر کے روشن دریچے ہم پر وا ہوتے ہیں اور ہم ان کے فکر وفن کے قائل ہو جاتے ہیں، ان کی شخصیت کثیر الجہات تھی، ایک اچھے انسان کی صفات ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں، موصوف ایک شفیق استاد، معتبر شاعر وادیب تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیت کی بنا پر ملک گیر پیمانے پر مشہور ومقبول ہیں اور ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہیں گے۔ میں اپنی بات اعزاز افضل کے قطعہ پر ختم کرتا ہوں۔ قطعہ ملاحظہ کریں:

درس گاہوں کو ضرورت ایسے استاد کی ہے
جو کریں انصاف اپنے عہدۂ عالی کے ساتھ
یاد آتا ہے ہمیں کالج کا وہ زرّیں دور
کام کرنے کا مزہ تھا نصر غزالی کے ساتھ

☆☆☆

Dr. Shafiur Rahman
Deptt. of Urdu
Matiaburj College
R-55, Garden Reach Road
Kolkata - 700 024
Mobile : 9831245920
Email : shafiurrahman04@gmail.com

تصدیق نامہ:
میں ڈاکٹر شفیع الرحمن آپ کے رسالے کے لئے ایک غیر طبع شدہ مضمون ''استادِ محترم ابونصر غزالی صاحب کی شخصیت میری نظر میں'' ارسال کر رہا ہوں۔ اسے شائع کر کے شکریہ کا موقع عنایت کریں۔

نوٹ: مقالہ اغلاط کی خامیوں سے پاک ہے۔ پروف کر دی گئی ہے۔

51

شیخ العالمؒ اور ماحولیاتی تحفُظ

ڈاکٹر عاشق حسین میر

تلخیص:

ماہرِ ماحولیات ہونے کی حیثیت سے شیخ العالمؒ اس کے تحفُظ کے لئے ہر ممکنہ کوشش کرتے رہے، جو ان کی تحریک ریشیت کے منشور سے عیاں ہے کہ ریشیانِ کشمیر دِل وجان سے ماحول کے تحفظ اور بقا کے لئے اپنا تن من لُٹانے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ وہ ماحول کی صفائی کا حق ادا کرنے میں کوئی قصر نہیں چھوڑتے۔ وہ نئے نئے پیڑ اُگانے سے ایک رُوحانی اور وجدانی لذّت حاصِل کرتے، جن کے نیچے راہ گیر چلتے پھرتے آرام سے ٹھہرتے، مگر جب لوگوں نے غفلت کی وجہ سے ان کی بے قدری کی، تو شیخ العالمؒ نے اُنہیں بروقت مُتنبیہ کیا۔

ژٹن یارِتہ※ گن※ ڈن وارے
وون ہا کھس※ ژل تہ※ کر※م
پن※ گہ※ل※ کھرِتہ※ گُرس نارے
کھی※ نہِ زن ب※ ہنس ین
پ※ن※ ز※ بتہ※ تہ※ وان※ دردارے
یہ چُھے کان※ جل ہُن※ ڈُے زم

یہ لوگ جنگل کے قریب دیہات میں رہنے والے ''کایِر'' جیسے جنگلی اور شاندار درختوں کو بے تحاشا کاٹنے پر تُلے ہیں۔ اس کے بعد اس جگہ کاشتکاری کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کے بدلے ''ساگ'' اور ''کدم'' جیسی کم تر سبزی اُگاتے ہیں، مگر یہ زمین ان سبزیوں کے لئے مُناسب نہیں۔ اس طرح یہ دونوں طرف نقصان میں ہیں۔ ان کی جنگل کی صفائی کا حاصل '''پنگہ'' اور 'چھاج'' جو بندروں کی غذا ہیں۔ عوام الناس کا قدرت کے ان بڑے ذخائر کا کاٹنا درختوں کی کمی کے عمل کو پروان چڑھاتا ہیں، یعنی درخت کاٹنے سے سارے کا سارا ماحولیاتی توازُن بگڑ جاتا ہیں، جس کے اثرات انسانوں اور جانوروں کے لئے مضر بن جاتے ہیں۔ آکسیجن گیس جیسی نعمت کے تناسُب میں کمی واقع ہوتی ہے کہ انسان کو سانس لینا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔ جس کے فوری نتائج لوگوں کا مختلف کی قسم کی بیماریوں میں بتلا ہونا۔ شیخ العالمؒ اس شرک میں واضح کرنا چاہتے ہے کہ بالائی علاقوں کے لوگوں نے اپنی معاشی ضرورتوں کو جنگلوں پر منحصر کیا ہیں جس کے نتیجے میں وہ ان درختوں کا کاٹنے کے ساتھ وہاں چمن بناتے ہیں۔ ''وارِ'' سے مُراد لوگوں کا وہاں خورد ونوش کی ضروت کی چیزوں کا اُگانا ہیں۔ ان درختوں کی جگہ لوگ ہا کھ، س※ ژل اور کر※م وغیرہ جیسی سبزیاں اُگاتے ہیں۔ غرض، جہاں سبزیاں اُگائی تھی وہاں مکان تعمیر کئے اور جہاں درخت لگانے تھے وہاں سبزیاں اُگائی، جس کے سیدھے اثرات جنگلوں پر پڑے۔ بڑھتی آبادی کے تناسُب نے لوگوں کو ایک طرف مختلف قسم کی مصیبتوں میں گرفتار کیا ہیں اور دوسری طرف ''صنعتی انقلاب'' کی وجہ سے انہوں نے جنگلوں کا رُخ کیا، جس کے واضح اثرات ماحول پر پڑیں ہیں۔ یہ ایک المیہ ہے کہ میدانوں میں سبزیاں اُگانی تھی اور پہاڑوں پر پیڑ اُگانے تھے، مگر بد قسمتی سے لوگوں نے اُلٹا کیا ہیں! صنعتی دور کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو یہاں مشینوں اور کارخانوں کو فروغ دینے میں قدرتی وسائل کا قلع قمع مراد ہیں۔ شیخ العالمؒ یہ تاثر دینا چاہتے ہے کہ جب انسان قدرت سے ہی منھ پھیر کر اپنے اغراض کے پیچھے پڑے، تب قدرت بھی انسان سے متنفر ہو جاتی ہیں۔

ی※ تہِ و※ ژار کر عالمس
تَتہِ نو※ن※ دِس برم※ کلیو
پُوشس تہ※ پان※ ژن کرؤ دس نہ※ کامس
وُچھتہ※ خامس مے※ کو※ت ژو※ لو

ماحول انسانی جانوں کی سلامتی کے لئے ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کا توازُن بِگڑنے سے ماحول وہ کِردار ادا نہیں کر پاتا جس کا تقاضہ لوگ اس سے کرتے ہیں، جس کا ذِمہ دار دورِ جدید کا مفاد پرست انسان ہے! جو اپنے وقتی مفادوں کے لئے قدرت سے محاذ آرائی پر تُلا ہے۔ جس میں ہوا، پانی، زمین اور معدنیات وغیرہ کو شدید نقصان کے خطرے رہتے ہیں۔ ہوا جس پر ہر زندگی کا دارمدار ہے، وہی ہوا اگر کچھ لمحوں کے لئے بند کی جائے، تو کُل مخلوق زندگی جیسی عظیم نعمت سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ اسی طرح پانی کی اہمیت انسان کے جسم میں خون کے مترادف ہے، جو گردش کر کے انسانی اعضا میں پہنچ کر جسم کو صحیح سلامت رکھتا ہیں۔ زمین جو روح کی مانند ہے جس پر سارا منحصر ہے اگر یہیں زمین آلودہ ہوجائے، تو کھیت سے کس پیداوار کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح جنگلات کا ہونا بھی اپنی اہمیت آپ ہیں:

ان پوشہِ تی※ لہِ یِ※ لہِ ون پوشہِ

شیخ العالمؒ جنگلوں کی بے تہاشا تباہی کی طرف اشارہ کرتے ہے کہ لوگ جب اپنی معاشی کفالت کے لئے درختوں کی بیخ کنی کریں، تب ان کی معیشت کیا بلکہ وہ دو وقت کے کھانے سے بھی محروم ہوں گے۔ اس لئے انسانوں کی بھلائی اسی میں ہیں کہ وہ ''اَن'' کھانے کی دستیابی کے لئے ''ون'' کو تحفُظ دینا ہوگا۔ جب جنگل سلامت ہوں گے تب انسانی جانیں بھی سلامت رہیں گی۔

کنجن چھوان زوراوا※ ری
کھ※ ستِھ کھسان ون وُچھو
ہ※ تھوسان ڈڈبا※ ری

52

کنجِہ گامن بگہ ※ ژھ ※و ※

کنڈی گاؤں کے لوگ یوں تو جنگل کی سیر کرنے جاتے ہیں، مگر واپسی پر آ کے اپنے لکڑی کی گھٹریاں لاتے ہیں۔اس غیر معمول حرکت کی وجہ سے یہ عقل سے عاری ہیں۔

د※ نن تہ ※ وتہِ نِشہِ لنجے ژٹن
کیاژ ※ ٹِتھ لبکھ ہچن پھل
کند یوموزُ کھڈ بن تہ ※ د※ رچن
د※ ن کونہ ※ بر یاتھ زچن تل
شیطا※ن ※ اتھ ※و ※ تھرے ژچن
مگر حساب ہی ※ نکھ پچن تل

(جنگلی درختوں کی جھاڑوں کو یہ لوگ اس طرح جھاڑتے ہیں کہ شاخ ہی توڑ دیتے، ارے اس خشک لکڑی سے کیا فصل آئے گی (ماسوائی خدائی قہر کے)۔اس جنگل کو کاٹ کر تو نے ایوان اور دردریچے بنائے۔اس لئے بہتر یہی ہوتا کہ اگر تو نے خرقہ پوشی اختیار کی ہوتی، یعنی جتنی ان کی معیاری زندگی بہتر ہوتی ہیں، اُسی قدر لوگ فطرت کے حُسن کو پامال کر کے ماحول کو درہم برہم کرتے ہیں۔اس جھوٹے معیاری زندگی سے بہتر سادگی ہے۔غلام نبی گوہر قمطراز ہے:

''نوروز ریشی کے تذکرے میں دیکھا گیا کہ نیکی ریشی کے محض ایک جملہ سے اُس کی تقدیر بدل گئی۔اور اسی تذکرہ سے واضح ہے۔نیکی ریشی باضابطہ جنگلی درندوں کو پالتے تھے اور اپنے اولادوں کی طرح انہیں کھلاتے تھے۔ جو ریشی خود گوشت کھانے سے اجتناب کرتے تھے، وہی، شیر، گیدڑھ، ریچھ وغیرہ کو اپنے ہاتھوں سے بوٹیاں کھلاتا ہے۔'' ۱؎

کارخانوں اور فیکٹریوں وغیرہ سے خارج شُدہ مواد ماحول کو شدید نقصان پہنچاتا ہیں، جو ریشی منہج کے بالکل خلاف ہیں۔ریشی مسلک کی بُنیاد تو ماحولیات کے تحفُظ کو یقینی بنانا تھا۔ماحول کا تحفظ ان کی اوّلین ترجیعات میں شامل ہیں۔ریشی دن رات ایک کر کے سڑک کے کناروں پر چھوٹے بڑے پودے لگا کر اُن خدشات کا قلع قمع کرنے پر کمر بستہ تھے، جن کے نتائج ہمیں آج بھگتنے پڑتے ہیں۔اس حوالے سے ایک اور قابلِ غور بات ہے کہ ''برن'' مسجد اور ''بُرم ※ ج'' آستانوں کے صحن کی زینت ہوتی ہیں۔اس عمل کا مشاہدہ ہمیں کشمیر کے ہر خطعے میں دیکھنے کو ملتا ہیں۔غلام نبی گوہر قمطراز ہے:

''حضرت شیخ العالمؒ اور ان کے اکثر خلفاء جنگل سے استادہ سبز درخت کاٹنے پر ناراضگی کا ردِ عمل فوراً ظاہر کرتے تھے ''کنجہ گامن بگہ ※ ژ ※ ھوئے'' نظم میں آپ کنڈی علاقوں میں رہنے والے لوگوں پر طنز کرتے ہوئے ان کی گوشمالی کرتے ہیں کہ وہ چراگاہوں میں اپنے چوپایوں کو نمک کھلانے جاتے ہیں، تو واپسی پر بلا ضرورت کوئی نہ کوئی سبز جنگلی درخت کاٹ کر ماحول کو نقصان پہنچاتے ہیں۔اس منفی ردِ عمل پر ان کا ردِ عمل سنگین تھا، مگر عملاً گاؤں کے اردگرد راستوں پر اور خالی کھیتوں میں سایہ دار درخت خود اپنے ہاتھوں سے نصب کرتے تھے۔ان درختوں کی خاص کر چناروں کی گڈائی اور رکھوالی تب تک کرتے رہتے تھے، جب تک وہ مضبوطی سے جڑیں پکڑتی تھی۔اس عمل اور ردِ عمل سے یہ واضح ہیں کہ ریشی تحریک کے اغراض و مقاصد میں ایک اہم مقصد کشمیر کے ماحول کا نہ صرف تحفظ کرنا شامل تھا بلکہ شدت کے ساتھ اس بارے میں تاکید رہی تھی کہ جنگلات کو بڑھاوا دیا جائے اور جنگلی جانوروں کی نسل کو بھی بڑھایا جائے۔'' ۲؎

اختتام:

یہ بات تو پہلے ہی طے شُدہ ہے کہ شیخ العالمؒ کس حد تک ماحول کے تحفُظ کے شیدائی تھے۔شیخ العالمؒ کے مشن کا پہلا دستور راستوں کے دوطرف سایہ دار پیڑ لگانا، جس سے راہ گیر گرمی میں ٹھنڈک اور بارش میں سایہِ حاصل کرتا۔زندگی کا کچھ عرصہ خلوت میں گذارنا، جس میں یہ لوگ رات دن قدرتی وسائل کے تحفُظ کے حوالے مختلف اقدام کرتے تھے۔راستوں کے علاوہ شیخ العالمؒ نے ریشی طرزِ فکر میں قبرستانوں، مساجد اور مندروں وغیرہ کا حُسن بڑھانے کے لئے درخت اُگانے کی مُہم کا آغاز کیا تھا۔اس حوالے سے چنار کا درخت ان کی عبادت کے چھوٹے وقتی مرکز ہوتے تھے۔ جہاں کچھ عرصہ عبادت الٰہی میں مصروف ہوجاتے۔جنگلوں میں پُرانے درختوں کے تحفُظ کے ساتھ نئے پودوں کے بیج بھی اُگاتے نظر آتے۔

☆☆☆

حوالے اور حاشیہ:

۱۔گوہر ،غلام نبی۔عرفانِ کشمیر موسوم بہ کاروانِ عرفان (ریشیت اور ریشیان کشمیر)۔شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجرانِ کُتب، سرینگر:۲۰۱۶ء،ص۔۱۷۳

۲۔ایضا،ص۔۱۷۳

53

محمود الٰہی کی شخصیت وخدمات: ایک جائزہ

ڈاکٹر غزالہ فردوسی

اردو ادب میں محمود الٰہی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، وہ ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، انہوں نے تحقیقی وتنقیدی میدان میں بے مثل خدمات انجام دیں، ان کی پیدائش ۲ رستمبر ۱۹۳۰ء کو ٹانڈہ ضلع فیض آباد یوپی میں ہوئی، ان کے والد مولانا علیم اللہ ٹانڈہ کے مدرسہ کنز العلوم کے بانی واستاذ تھے، وہ نہایت خداترس اور دیندار انسان تھے، ان کی والدہ ماجدہ بھی بہت نیک اور عبادت گذار خاتون تھیں، ان کا گھرانا ایک خوشحال اور دیندار تھا، والدین کے حسن اخلاق کا ان کی شخصیت پر گہرا اثر تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت سراپا علم وفضل تھی، وہ روشن دماغ، پاک نفس مرد مومن تھے۔

محمود الٰہی کے پانچ سال کی عمر میں تعلیمی سلسلے کا آغاز ہوا، انہوں نے مدرسہ کنز العلوم سے مولوی، عالم اور فاضل کی ڈگریاں حاصل کیں، مقامی اسکول سے میٹرک امتیازی نمبروں سے پاس کیا، اس کے بعد انٹر کی ڈگری بھی لی، اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے آگرہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا، بی-اے اور ایم-اے کی اعلیٰ ڈگریاں امتیازی نمبروں سے حاصل کیں، انہوں نے اردو کے مشہور نقاد، ادیب اور استاد پروفیسر محمد حسن سے قربت حاصل کی اور ان کی ہی نگرانی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی-ایچ-ڈی کی ڈگری حاصل کی، حصول تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تعلیم وتعلّم سے وابستہ ہوگئے، گورکھپور یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر ہوئے، کچھ دنوں کے لئے اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔

محمود الٰہی نہایت منکسر المزاج تھے، ان کے عادات وفضائل کو ان کی کامیابی میں بڑا دخل ہے، انہوں نے اپنے والدین کی زندگی اور عمل کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا، وہ منفرد شخصیت کے مالک تھے، انہوں نے اپنی آمدنی کا ایک حصہ اپنے شاگردوں کے لئے وقف کردیا تھا، مہمان نوازی اور خاطر تواضع کرکے انہیں دلی مسرت ہوتی تھی، ان کا ماننا تھا کہ اصل چیز انسان کے ذاتی اوصاف ہیں۔

محمود الٰہی ایک ذی علم شخص کا نام ہے، جو بیک وقت تخلیق وتدوین کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں، انہوں نے ایک کامیاب زندگی گذاری اور اردو ادب کی گرانقدر خدمات انجام دیں، ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے ۱۹۸۸ء میں ''غالب انعام'' سے نوازا، ان کی خدمات کسی اعزاز اور ایوارڈ سے بالاتر ہیں، کیوں کہ تحقیق پر مبنی ان کی تصنیفات اس بات کا آئینہ ہیں کہ اس میدان میں انہوں نے نمایاں کارنامے انجام دیئے ہیں، جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، مثلاً ''اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ'' اس کتاب نے محمود الٰہی کی شہرت ومقبولیت میں مزید اضافہ کیا، اس سلسلے میں پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''محمود الٰہی نے بطور خاص اردو میں قصیدہ نگاری پر توجہ کی اور اس کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا، اپنے موضوع پر یہ ایک اہم کتاب ہے''

(تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ص: ۱۰۵۱)

محمود الٰہی نے ''فسانۂ عجائب کا بنیادی متن'' پیش کرکے اپنی تحقیقی کاوش کا بین ثبوت دیا ہے، اردو فکشن میں اس داستان کا درجہ نہایت بلند ہے، بہت زمانے کے بعد محمود الٰہی کو فسانۂ عجائب کا ایک خطی نسخہ ملا، جسے انہوں نے از سر نو تحقیق کی اور کافی تفتیش اور تصحیح کے بعد اس متن کو شائع کیا اور ''فسانۂ عجائب کا بنیادی متن'' نام رکھا، ۲۲۸ رصفحات پر مشتمل یہ کتاب اشاعت پذیر ہوئی، اس سلسلے میں محمود الٰہی لکھتے ہیں:

''فسانۂ عجائب بنیادی طور پر آسان زبان میں لکھی گئی اس پر یہ بھی دلیل ہے کہ جس شخص کے کہنے پر رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب تحریر کیا، اس کا مطالبہ بھی آسان زبان میں تحریر کرنے کا تھا، محمود الٰہی نے جن ثبوتوں کو پیش کرکے اپنی ترتیب کردہ نسخے کے متن کو اصل متن کہا ہے ان دلائل کو دیکھنے کے بعد یہ بات قابل قبول معلوم ہوتی ہے کہ یہی نسخہ اصل نسخہ ہے اور فسانۂ عجائب کا بنیادی متن بھی یہی ہے''

(مقدمہ، فسانۂ عجائب کا بنیادی متن، از محمود الٰہی)

محمود الٰہی کا ایک کارنامہ میر تقی میر کی نکات الشعرا کی ترتیب و تدوین بھی ہے، انہوں نے اپنے بنائے ہوئے طریقۂ کار پر تذکرہ نکات الشعرا کو ترتیب دے کر اصل متن پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے اس طرح کی کوشش دوسروں کے یہاں نہیں ملتی، اس کی اصل شکل پیش کرکے اہم کام انجام دیا ہے۔

محمود الٰہی کی ایک اور تحقیقی کاوش ''بازیافت'' ہے، یہ تحقیقی وتنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۶۵ء میں دانش محل لکھنو سے شائع ہوا، یہ ان کی تنقیدی بصیرت کا نمونہ ہے، یہ مجموعہ تحقیقی اور تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔

پروفیسر محمود الٰہی نے ممتاز انشاء پرداز مہدی افادی کے خطوط کے مجموعہ کو صحیفۂ محبت کے نام سے ترتیب دے کر ۱۹۶۴ء میں ادارۂ فروغ لکھنو سے شائع کیا، ''صحیفۂ محبت'' میں مہدی افادی کے وہ خطوط شامل ہیں، جو انہوں نے دوران ملازمت ادبی لیاقت رکھنے والی اپنی تیسری بیوی عزیز النساء کے نام تحریر کیا تھا، چونکہ مہدی افادی نے اپنی بیگم کو تحریر کردہ خطوط کو صحیفۂ محبت کا نام دیا تھا، اس لئے مہدی افادی نے بھی ان کے خطوط کے مجموعہ کو ''صحیفۂ محبت'' کا ہی نام دیا اس سے مہدی افادی کی ادبی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے اس کے علاوہ انہوں نے خانقاہ رشیدیا جونپور سے ''تذکرہ شورش'' کا قدیمی نسخہ تلاش کرکے ۱۹۸۴ء میں اترپردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ سے شائع کیا۔

پروفیسر محمود الٰہی نے الہلال والبلاغ کو ترتیب دے کر اردو ادب میں بلکہ صحافت میں گرانقدر اضافہ کیا ہے اور ثابت کردیا کہ ترتیب وتدوین میں

54

یدطولیٰ حاصل ہے، ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا، ادب کی مختلف اصناف پر ان کی گرفت تھی، اس لئے انہوں نے جو بھی پیش لفظ لکھے خواہ وہ مختصر ہوں یا طویل ان کی ایک ادبی حیثیت ہے، مولانا آزاد کی سرپرستی میں ہفتہ وار ''پیغام'' نکالا۔

اکثر محققین نذیر احمد کی ناول ''مراۃ العروس'' کو اردو کا پہلا ناول مانتے ہیں، جبکہ محمود الٰہی مولوی کریم الدین احمد پانی پتی کی تصنیف، خط تقدیر کو تمام شواہد کی بنا پر اردو کا پہلا ناول قرار دیتے ہیں، ۱۹۶۵ء میں انہوں نے اردو اکادمی کا پہلا ناول ''خط تقدیر'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا، جس پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اپنی بہت سی خامیوں کے باوجود ہمارے افسانوی ادب کے سلسلہ تاریخ کی ایک اہم کڑی ہے، اس لئے ۱۰۰/سال کی طویل مدت کے بعد اس متن کو پھر شائع کیا جا رہا ہے، ممکن ہے اس کی اشاعت سے افسانوی ادب پر تحقیق کرنے والوں کو کچھ نئے گوشے نظر آئیں اور وہ اس کے سلسلۂ تاریخ کو زیادہ سے زیادہ واضح کر سکیں''

(اردو کا پہلا ناول، خط تقدیر: ڈاکٹر محمود الٰہی، ص:۷)

جب محمود الٰہی نے ''خط تقدیر'' کو مرتب کیا تو رشید احمد صدیقی کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور فرمایا:

''ڈاکٹر محمود الٰہی اردو کے ان اہل قلم کی صف میں داخل ہو چکے ہیں، جن کو ہماری یونیورسٹیوں میں تصنیفی وتنقیدی صلاحیتوں کے اعتبار سے ممتاز درجہ حاصل ہوا، انہوں نے کتاب کا مقدمہ جس شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے، وہ قابل تعریف ہے، مصنف کتاب، ان کے زمانے اور موجودہ عہد کے تصنیفی اور تنقیدی تقاضوں کو بڑے سلیقے اور رقت نظر سے پیش کیا ہے''

(بازیافت، مرتبہ: محمد الٰہی، ص: ۲۳۳)

''خط تقدیر'' کے تعلق سے پروفیسر ایم عظیم اللہ نے اپنی قیمتی آراء سے نوازا ہے، ملاحظہ ہو:

''خط تقدیر پر داستانوں کا آب ورنگ حاوی ہے، لیکن مستقبل قریب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے آثار یہاں آتے ہیں، کریم الدین داستانوں کے طلسم آفریں فضا کی جگہ ''مضامین حقیقہ'' کی جستجو کرتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ انہوں نے روایتی قصہ کے ذہنی اُفق کو وسیع کیا، اس کی موضوعاتی سطح کو رفعت وکشادگی عطا کی اور اسے فکر کی گرمی بخشی، لیکن ان کی قصہ نگاری اُسلوب کے اعتبار سے روایتی ڈگر پر ہی چلتی رہی، قصے کا کوئی نیا طرز وہ ایجاد نہ کر سکے، زبان کے اصلاحی پہلو پر بھی انہوں نے شعوری طور پر توجہ کی، لیکن اس کے باوجود ان کی زبان پھیکی اور بے کشش معلوم ہوتی ہے، اُسلوب تمثیلی اور ساخت بیانیہ اور داستانوی ہے، بہر حال ''خط تقدیر'' کو ایک اہم موڑ تسلیم کیا جا سکتا ہے، جہاں سے قصہ نگاری کی روایت ناول کا راستہ اختیار کرتی ہے۔''

(اردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات، ایم عظیم اللہ، ص:۱۷)

تحریک آزادئ ہند میں متعدد اخبارات نے اپنے اپنے طور پر حصہ لیا، جس میں 'الہلال والبلاغ' کے علاوہ ہمدرد، مدینہ اور زمیندار کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے، خاص طور سے مدینہ اخبار سے پروفیسر محمود الٰہی کو والہانہ محبت تھی، ان اخبارات کی دستاویزی حیثیت اپنی جگہ مسلّم ہے، ڈاکٹر محمود الٰہی کے مطابق

''ان اخبارات کی فائلوں کو نظر انداز کر کے تحریک آزادی کی جو تاریخ برصغیر میں لکھی جارہی ہے یا آئندہ لکھی جائے گی، ان کی ثقاہت ہمیشہ متنازع رہے گی''

(انتخاب ہمدرد، صباح الدین عمر، ص:۵)

پروفیسر محمود الٰہی کی اخبارات پر بھی گہری نظر تھی، انہوں نے فروری ۱۹۸۱ء میں اردو اکادمی اتر پردیش کے چیرمین شپ کا پہلی بار عہدہ سنبھالا تو ماہنامہ خبرنامہ میں مستقل ایک طنزیہ کالم لکھنا شروع کیا تھا۔

''انتخاب منظومات'' بھی محمود الٰہی کی تحقیقی وتنقیدی شعور کی عمدہ مثال ہے، انہوں نے ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑ وتحریک سے متاثر ہو کر اردو شاعری کا آغاز کیا، اردو اکادمی لکھنؤ نے نظم اور نثر کے دو انتخابات شائع کئے، انہوں نے غزلوں کا بھی انتخاب کیا جو 'منتخب غزلیں'' کے نام سے شائع ہوا۔

سطور بالا میں پروفیسر محمود الٰہی کے جس تحقیقی وتنقیدی کارناموں کا میں نے ذکر کیا اس کے علاوہ بھی ان کے بے شمار ایسے کارنامے ہیں جس کو احاطہ تحریر میں لانے کے لئے کتنے دفتروں کی ضرورت پیش آئے گی۔

پروفیسر محمود الٰہی تمام زندگی درس وتدریس اور تحقیق وتنقید میں مشغول رہے، انہوں نے بہت سی گم شدہ چیزوں کو انتہائی تحقیق کے بعد ارباب ادب کے سامنے پیش کیا، انہوں نے جتنے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں، اس لحاظ سے دوسرے معاصرین کے مقابلے میں ان کی وہ پذیرائی نہیں ہوسکی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔

پروفیسر محمود الٰہی آخری دنوں میں بیمار رہنے لگے تھے، آخر کار ۱۹/مارچ ۲۰۱۴ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے، اس طرح ایک عہد ساز شخصیت اس دنیا سے رخصت ہوگئی، لیکن وہ اپنے کارناموں کی بدولت ہمیشہ ہمارے درمیان زندہ ہیں اور رہیں گے۔

Dr. Ghazala Firdausi
Vill & P.O. Hussainabad, Sheikhpura
(BIhar)
Mob-7667963065

روہیل کھنڈ میں اردو غزل کا ارتقاء

مظہر علی، مظہرؔ رام پوری
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، روہیل کھنڈ یونیورسٹی، بریلی
موبائل نمبر : 9927103914

روہیل کھنڈ میں اردو غزل کا ارتقا کے عنوان پر مُجھے اپنے خیالات آپ کی سماعتوں کے حوالے کرنا اور اپنے احساسات کو سپردِ قلم کرنا ہے ذہن پس وپیش میں ہے کہ کس نام سے ابتداء کروں اور کس پر اختتام کروں کیوں کہ ایک سے بڑھ کر ایک نام ہے جس نے اردو غزل کی آبیاری میں اپنی عمر صرف کردی۔جن کی فکر وفن اسلوب و آہنگ اور فن شاعری کا احاطہ دو چار صفحات پر مشتمل مقالے میں کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔اس لئے کہ دوسو سالہ ادبی خدمات کو 200 یا 500 صفحات پر مشتمل کردینا فن ہوسکتا ہے نہ کمال فن کیونکہ اتنی ضخیم ادبی تاریخ میں بہت سی عظیم شخصیات، فن کاروں اوران شعرا وادباء کی نگارشات اکثر سہواً یا مصلحتاً چھوٹ ہی جاتی ہیں یا چھوڑنا پڑ جاتی ہیں۔ بہرحال دہلی اور لکھنؤ کی طرح خطہ روہیل کھنڈ میں بھی اردو شاعری کی ابتداء سے لیکر آج تک صدہا شعراء کرام نے طبع آزمائی کی ہے اور جب بات اردو غزل کی ہوتی ہے تو اردو ادب کی تاریخ روہیل کھنڈ کی شعری وادبی حوالے کے بغیر مکمل ہی نہیں سمجھی جاسکتی کیوں کہ اسی خطے کی ایک چھوٹی سی ریاست رام پور بھی رہ چکا ہے جو کہ اردو ادب کی تاریخ میں تیسرے اسکول کی حیثیت سے اپنا مُقام قائم کر کے باذوق ذہنوں میں مقبولیت بھی حاصل کر چکا ہے۔ خطہ روہیل کھنڈ میں ہزاروں شعراء کرام کے نام اردو غزل کے حوالے سے قابل ذکر سمجھے جاتے ہیں۔ان میں 300 سے زیادہ شعراء کرام تو دبستان رام پور ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ امروہہ، بدایوں، مرادآباد، بجنور، آئنولا، سمبھل، اس کے نواحی علاقے ہیں۔دہلی اور لکھنؤ کے اُجڑنے کے بعد روہیل کھنڈ میں شعراء کرام کے ذریعے اردو غزل کو بہت فروغ ہوا۔اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اسی روہیل کھنڈ میں ایک خودمختار ریاست "رام پور" بھی ہے جو دہلی اور لکھنؤ کے شعراء کی سرپرستی و دستگیری فرما رہی تھی۔ روہیل کھنڈ میں اردو غزل کو فروغ دینے والے شعراء میں امیر مینائی، غلام ہمدانی مصحفی، فانی بدایونی، شکیل بدایونی، خالد ندیم بدایونی، جگر مرادآبادی، دل شاہ جہاں پوری، عابد مینائی، ساغر وارثی شاہجہاں پوری، وسیم مینائی، راشد حسین راہی، حمید خظر شاہجہاں پوری، جون ایلیا امروہوی وغیرہ کی شعری خدمات کے علاوہ دبستان رام پور میں محشر عنایتی، شاد عارفی، جلیل نمانی، اظہر عنایتی، واحدی القادری، منظر واحدی، ہوش نمانی، آزر نمانی، حسان آفندی، فرید شمسی، پروفیسر ظہیر رحمتی، طاہر فراز، شہزادہ گلریز، نعیم نجمی، ڈاکٹر عبدالوہاب سخن، عبداللہ خالد، ڈاکٹر عدنان ضیائی کے علاوہ دوسرے شعراء نے بھی طبع آزمائی کی ہے اور اردو غزل کے گیسوؤں کو اپنے انفرادی اسلوب سے سنوار رہے ہیں۔ روہیل کھنڈ اور دبستان رام پور کے حوالے سے خود خاکسار کا نام بھی شامل فہرست ہے جس کے ذریعے روہیل کھنڈ میں اردو غزل مسلسل اپنے ارتقائی منازل طے کر رہی اور مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ روہیل کھنڈ کی غزل گوئی کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب تو یہاں کی سلاست وفصاحت لب ولیجے کا تیکھا پن اور بانکپن ہمہ وقت خوشی کا اظہار طنز کی آمیزش مگر شائستہ انداز میں اس کے علاوہ کلاسیکی شعری میں روایات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ اسلوب میں ندرت اور دلنشیں کیفیات روہیل کھنڈ کی غزل گو شعراء کا نمایاں وصف ہے۔

ہم اور اکثر محققین حضرات اپنی تحقیقات کے ذریعہ اس بات کا انکشاف کر چکے اور کرتے رہیں ہیں کہنے کو تو روہیل کھنڈ آٹھ نو اضلاع پر مشتمل ایک چھوٹا سا ادب خیز خطہ ہے مگر ادبی نکتہ نظر سے آج بھی بہت اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ روہیل کھنڈ کے ضلعوں میں شاہ جہاں پور، بریلی، بدایوں، مُرادآباد، امروہا اور رام پور خاص قابل ذکر ہیں ان اضلاع میں رام پور ایک خودمختار ریاست اور اردو کے تیسرے اسکول کے لئے دنیائے اردو ادب میں مشہور ہے جس کے لب ولیجے کی دھاک فلم انڈسٹری بمبئی تک رسائی رکھتی ہے۔

ڈاکٹر فہمیدہ خان صدر شعبہ اردو گرلس ڈگری کالج مُرادآباد نے اپنی کتاب "شعرائے مُرادآباد کی ادبی خدمات قمر مُرادآبادی کے خصوصی حوالے سے" میں مدلل وضاحت کے ساتھ مرادآباد کے شعراء کی غزل گوئی پر قابل تحسین تحریر پیش کی ہے وہ لکھتی ہیں کہ

"اردو شعر وادب مرادآباد میں بھی پروان چڑھتا رہا مُرادآباد کسی ریاست کا پایہ تخت تو نہ بن سکا کہ ہر طرف سے شعراء و ادبا یہاں کھنچے چلے آتے اور بعض دوسرے شہروں کی طرح یہ بھی ادب کا ایک دبستان بن جاتا۔لیکن خود اس سرزمین سے ابھرنے والے شعراء کرام کی ایک بڑی تعداد پائی جاتی ہے جنہوں نے اپنے پر بہار نغموں سے اردو کے شعری ادب میں وقیع اضافے کئے یوں تو ہندوستان کو ادبی نقشے پر باقاعدہ جگہ دلانے کا کام جگر مرادآبادی نے ہی کیا ہے لیکن جگر سے پہلے بھی مرادآباد کی شعری روایت کو فروغ دینے میں کئی محترم اسمائے گرامی ہیں جن میں لالہ نول رآئے وفا مرادآبادی، محمد یار خان اسیر، غلام علی خاں وحشت اور میر عارف علی خاں عارف کے نام خاص قابل ذکر ہیں"

عارف کے اشعار ملاحظہ فرمائیں

ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

56

ہاتھوں کو چاک جیب تلک دسترس نہیں
میں کس کے بس میں ہوں کہ میرا کچھ ہی بس نہیں
کیا قافلے یاروں کے آگے کبھی ٹھہرے ہیں
آوازِ جرس کم ہے یا کچھ ہمیں بہرے ہیں"

مذکورہ شعراء کرام کے بعد با قاعدہ جگر مرادآبادی کے نام سے مرادآباد اردو شعر وادب میں اپنے انفرادی حیثیت کے لیے جانا جاتا ہے اس لئے کہ ناقدین اور محققین کے مطابق انیسویں صدی کا رئیس الغزل حضرت جگر مرادآبادی کو ہی تسلیم کیا گیا ہے۔ جگر کی شاعری میں تصوف کے ساتھ حقیقت اور مجاز کا ایسا رشتہ رکھتے ہیں کہ اس میں فرق وامتیاز قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جگر کی شاعری سے ہی اس کی دلچسپ مثال ملاحظہ کیجیے:

یہ حسن کیا ہے کس کو ہے خبر اس کی لیکن
بے جام ظہور بادہ نہیں بے بادہ فروغِ جام نہیں
بے تاب تھے جو نزع میں دردِ نہاں سے ہم
کچھ دور آگے بڑھ گئے عمرِ رواں سے ہم

مذکورہ بالا شعر کو جگر کی عشقیہ شاعری اور صوفیانہ شاعری دونوں ہی کے ذیل میں پیش کیا جا سکتا ہے اور دونوں ہی جگہوں پر موزوں بھی ہے مثلاً :

نکاتِ عشق حل کرتی ہے ہر جنبش نگاہوں کی
زبانِ آگہی سمجھو سکوت اہلِ عرفاں کو
دل دھڑکتا ہے تو جاگ اٹھتا ہے احساس وفا
درد بڑھتا ہے تو جان آتی ہے ارمانوں میں
اُس بزم میں شریک تو جایا نہ جائے گا
میں جاؤں گا گر میرا سایہ نہ جائے گا

مورخین و محققین کی تحقیقات کے مطابق روہیلکھنڈ کا تاریخی وادبی شہر امروہہ بھی بہت ادب خیز خطہ سمجھا جاتا ہے۔ سرزمینِ امروہہ نے ایک سے بڑھ کر ایک صاحب علم وحکمت کو پیدا کیا۔ جنہوں نے اردو زبان وتہذیب کے فروغ وزندگی میں غیر معمولی رول ادا کیا ہے۔ جو دنیائے اردو وادب کے لئے ناقابل فراموش ہے۔ سرزمین امروہہ نے ہی اردو ادب کو غلام ہمدانی مصحفی جیسا مائیہ ناز شاعر عطا کیا اس کے علاوہ بھی متعدد شعراء وادباء اور کاملینِ علم ودانش افق امروہہ پر طلوع ہوئے جن کی کرنوں سے اردو کا ایوان ہمیشہ جگمگاتا رہیگا۔ اسی سرزمین امروہہ کا ایک معروف نام جون ایلیا بھی ہے۔ جو کہ سن 1941 کو ایک باوقار علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔

جون کے والد سید شفیق حسن ایلیا امروہہ کے سادات گھرانے کے فرزند تھے سید شفیق حسن ایلیا اپنے دور کے ممتاز عالم، ادیب، شاعر تھے۔ جون کے بڑے بھائی رئیس امروہوی صحافی، کالم نگار، ادیب اور شاعر کی حیثیت سے مشہورِ زمانہ ہوئے۔ اردو شعر وشاعری کا ذوق جون کو اپنے خاندان سے ورثے میں ملا تھا۔ اثنا عشری سادات گھرانوں میں مرثیہ گوئی کے حوالے سے شعر وسخن کا ذوق عام طور امروہہ میں آج بھی رائج ہے۔ جون نے اسی فضا میں ہوش سمبھالا۔ لہذا بہت کم عمری میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔ تصوف فلسفہ اور ادبیات کے گہرے مطالعے اور فطری صلاحیت نے جون کے ذہن کو وسعت بخشی اور عہدِ شباب تک پہنچتے پہنچتے جون ایک خوش فکر شاعر کی حیثیت سے خود کو منوانے میں کامیاب ثابت ہوئے۔ جون ایلیا کی شاعری کے حوالے سے پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں کہ:

''میں جون ایلیا کی شاعری پڑھ کر اور سن کر اکثر سوچا کرتا ہوں آخر وہ کہاں کھڑا ہے؟ کس بلندی کے کس زاوے سے کائنات کو دیکھ رہا ہے۔ آفاق کے کس منطقے سے اس کو آواز آ رہی ہے۔ آواز جو اجنبی ہے۔ اداس ہے بہت تیکھی ہے۔ بہت گہری ہے۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ جون اس مقام پر ہے جہاں اس کے ارد گرد کوئی دکھائی نہیں دیتا کوئی معاصر اس کا ہم آواز نہیں''

(ماہنامہ نیادور جون ۲۰۲۳ ص ۱۲)

یہ ہے اک جبر اتفاق نہیں
جون ہونا کوئی مزاق نہیں
جون ہم زندگی کی راہوں میں
اپنی تنہا روی کے مارے ہیں
طنز کیا جائے ہر ایک طعنہ دیا جائے
کچھ بھی ہو پر اب حدِ ادب میں رہا نہ جائے
تاریخ نے قوموں کو دیا ہے یہی پیغام
حق مانگنا توہین ہے حق چھین لیا جائے
یہ تیرے خط تیری خشبو یہ تیرے خواب وخیال
متاعِ جاں ہیں تیرے قول اور قسم کی طرح
گذشتہ سال انہیں میں نے گن کے رکھا تھا
کسی غریب کی جوڑی ہوئی رقم کی طرح

روہیل کھنڈ کا ایک بہت ادب خیز علاقہ بدایوں بھی ہے۔ جس کو مدینۃ العلم اور قبلہ اسلام کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اکثر محققین ومورخین لکھتے ہیں کہ بدایوں مہاتما گوتم بدھ کا بسایا ہوا شہر ہے۔ پروفیسر گیان چندجین کی تحقیق یہ ہے کہ ''ویدموتھ'' کہتے اور بتاتے ہیں کہ بدایوں شہر کسی زمانے میں ویدوں کی تعلیم کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ بدایوں کا نام ''بدھ مئو'' ہے تو پھر اس شہر کے یعنی

57

یہ شہر مہاتمہ گوتم بدھ کے زمانے کا بسایا ہوا ہے۔ بہر حال بھارت کی تاریخ میں بدایوں کو علمی وتہذیبی وادبی لحاظ سے صدیوں سے بلند مقام حاصل رہا ہے۔ اس طرح اردو شعر وادب میں بھی بدایوں اپنا مقام آپ ہے۔ فانی بدایونی، شکیل بدایونی، خالد ندیم بدایونی کی شعری وادبی خدمات قابل ذکر ہیں۔ شوکت علی خان فانی بدایونی کا نام اردو شعر و ادب میں محتاج تعارف نہیں۔ میر تقی میر کے بعد غم وحسرت اور یاس کی شاعری کرنے والے اس شاعر کو اردو دنیا فانی بدایونی کے نام سے یاد کرتی ہے۔ فانی کی پیدائش 1879 کو روہیلکھنڈ کے ضلع بدایوں میں ہوئی اور انتقال 1941 کو حیدر آباد میں ہوا۔ فانی بدایونی کے اسلوب سخن کو روہیلکھنڈ اور دبستان رامپور کے منفرد لب ولہجے کے زیر اثر دیکھ جاسکتا ہے۔

تھام لے موت کا دامن کے رہ الفت میں
زندگی مشورہ دیتی ہے بھٹک جانے کا
ہر ایک رنگ میں کاٹیں گے ہم سزا ہی سہی
یہ زندگی کسی مفلس کی بد دعا ہی سہی
نہ اس کو بھول کہ میں نے تجھے کیا تخلیق
یہ اور بات ہے تو وقت کا خدا ہی سہی
یہی بہت ہے کہ مجھ پر تری توجہ ہے
تری نگاہ کا انداز دوسرا ہی سہی

امیر مینائی اسکول کا روشن ستارہ شاہ جہاں پور کے ادبی اُفق پر ایک درخشندہ نام مرحوم ساغر وارثی کی شعری خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ ساغر وارثی کے تلامذہ فہیم بسمل کی ترتیب شدہ کتاب ''ایک شخص گھنیری چھاوں سا'' میں فرمان چودھری ساغر وارثی کے لیے لکھے گئے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ :

''مغل بادشاہ شاہ جہاں کے دور حکومت میں آباد اتر پردیش کا ضلع شاہ جہاں پور ابتداء سے ہی علم ادب کے نقطہ نظر سے زرخیز رہا ہے اس کی شعری روایت کو فارسی کے مستند استاد شاعر نواب حسین خاں حسین، حسین احمد میاں بے باک، نواب ناظم علی خاں ہجر، محمد علی میاں خیال، سید مجتبی حسین، دل شاہ جہاں پوری، عابد مینائی، عابد مینائی کے شاگرد حضرت ساغر وارثی کے ساتھ ساتھ اردو کے معروف محقق رشید حسن خاں، نقاد پروفیسر قمر رئیس اور رباب رشیدی جیسے ادیب اور شعرا کرام نے ادبی اُفق پر اپنی بے مثال موجودگی درج کی ہے۔ جس کو اردو ادب کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔''

ساغر وارثی کا شعری اسلوب ملاحظہ کیجئے

آسماں سے کوئی بجلی ہی تڑپ کر گرتی
میرے آنگن میں کبھی یوں ہی اُجالا ہوتا
نہ جانے کتنے اُجالوں کا راز داں ہوگا
وہ اک چراغ جو بُجھتا دیکھائی دیتا ہے
عافیت تو آج بھی گوشہ نشینی ہی میں ہے
دل جو گھبرایا تیری بستی کا پھیرا کرلیا
مختلف پرچھائیاں جب ذہن کوڈسنے لگیں
میں نے جلتی شمع گل کر کے اندھیرا کرلیا
عمر بھر ہم تم رہے شیر وشکر ہو کر تو کیا
جب بھی بہکا یا انا نے میرا تیرا کرلیا

سرزمین شاہجہاں پور سے طنزیہ ومزاحیہ ادب کے تخلیقار ڈاکٹر یوسف گوہر کے فرزند راشد حسین راہی کا نام بھی ساغر وارثی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہے۔ راشد حسین راہی اردو شعر وادب میں استادی وشاگردی کی مستحکم روایت کو قائم رکھتے ہوئے نئے اسلوب وآہنگ سے گیسوئے غزل کو سنوارنے کی سعی پیہم کر رہیں اور سہ ماہی رسالا ''اُفق نو'' کی ادارت بھی فرما رہے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے راشد راہی کا اسلوبِ سخن :

آجائے نہ اس کے ہی مقابل مری قسمت
یوں بھی وہ مجھے خود کو بدلنے نہیں دیتا
آج اک خط ملا ایسا کہ لکھا ہے جس میں
خب تلک سانس رہی آپ کا رستہ دیکھا
مت لگائیں قہقہے بزم طرب میں سب کے ساتھ
دیکھ کر دشمن جلیں گے شادمانی آپ کی
بادل پھٹے تو کتنی ہی جانیں چلی گئیں
برسوں نہ بھول پائیں گے اس حادثے کو لوگ

بات روہیل کھنڈ کی ہو اور اس میں واقع ایک چھوٹے سے شہر رام پور پر گفتگو نہ ہو تو روہیل کھنڈ کی ادبی تاریخ نامکمل سی لگتی ہے۔ رام پور جس کو اردو کا تیسرا اسکول کہا جاتا ہے۔ صاحب زادہ تجمل علی خان علیگ اپنی کتاب ''اردو شاعری کا تیسرا اسکول'' میں لکھتے ہیں کہ جس شخص نے رام پور اسکول کا سب سے پہلے لفظ استعمال کیا ہے وہ رام بابو سکسینہ ہے۔

''رام پور ایک نئ اردو معلیٰ کا بانی ہے۔ رام پور کی اردو میں فحش لوچ و لچک ہے نہ بیگماتی نزاکت، رام پور کی اردو میں نہ محاورات کا بیجا ہجوم ہے نہ ضمیر کی کُھلی کھلی عریانیت، رام پور کی زبان کھلی ہوئی سپاہیانہ زبان ہے جس پر ہمیشہ اس کو فخر رہے گا۔''

پروفیسر نجم الدین نقوی سابق صدر شعبہ اردو رضا پوسٹ گریجویٹ کالج رام پور محشر عنایتی کی رُباعیات کے مجموعے ''دیہات رس'' میں محشر عنایتی کے لئے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ محشر نے جب شاعری کی ابتداء کی تو رام پور کا شعری میعار اتنا بلند ہو چکا تھا کہ اس کا مقابلہ کسی بھی ادبی اسکول سے کیا جا سکتا تھا۔ (اگر چہ میں اردو شاعری میں کسی

ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

58

اسکول کے وجود کا قائل نہیں ہوں) لیکن یہ ضرور ہے کہ دہلی اور لکھنؤ میں اُس دور میں جیسے شعر کہے جا رہے تھے رام پور والوں کے اشعار کسی طرح بھی ان سے کم مرتبہ نہیں تھے مثلاً محشر عنایتی کہتے ہیں کہ:

ستم پر بھی اُسے دنیا دعا دے
خدا کی دین ہے جس کو خدا دے

حد نظر کی ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے
ہم نے سوچا تھا کہ تا حدِ نظر ہم بھی چلیں

دبستانِ رام پور کے شعراِ اکرام کی شعری اور ادبی خدمات کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جس میں دورِ اول 1774ء ہے۔ اس دور میں قدرت اللہ شوق، غلام ہمدانی مصحفی کی شعری خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ دوسرا دور 1857ء کا ہے۔ اس دور میں یوسف علی خاں ناظم، نظام رام پوری، امیر مینائی اور داغ دہلوی وغیرہ کی شعری و ادبی خدمات اردو ادب میں بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ جو کہ ہمارے یو. جی. سی. نصاب کا حصّہ ہیں۔

تیسرا دور یعنی بیسویں صدی میں محمد علی جوہر، محشر عنایتی، شاد عارفی، سحر رام پوری کے نام اردو شعر و ادب کے حوالے سے لائقِ افتخار سمجھے جاتے ہیں۔ 1960 کے بعد اظہر عنایتی، سعید رامش، طالب رام پوری، رئیس رام پوری، واحد القادری، شہزادہ گلریز، منظر واحدی، حسان آفندی، پروفیسر ظہیر رحمتی کے نام دبستانِ رام پور کے افق پر درخشندہ ہیں۔ ان شعرائے کرام میں اکثر کئی شعرا کے مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ دبستان رام پور کے شعراء کرام کی فہرست میں 1980 کے بعد اردو شاعری کے حوالے سے جو نام ابھر کر سامنے آئے ہیں ان میں عبداللہ خالد، خلیل واحدی، ڈاکٹر عدنان ضیائی، ہیومن آزاد اور جہانِ شعر میں سب سے کم تر ہوتے ہوئے خود خاک سار کا نام دبستانِ رام پور کے منفرد اسلوب کی نمائندگی فرما رہے ہیں۔ رام پوری شعری اسلوب کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

نہیں پالا پڑا غافل تجھے ہم سخت جانو سے ذرا ہم
بھی تو دیکھیں تیری جلادی کہاں تک ہے
(محمد علی جوہرؔ)

تعریف کے پردے میں تذلیل کا پہلو ہے
جو آپ نے برتا ہے وہ آپ نہیں تو ہے
(شادؔ عارفی)

بھیک امیرِ شہر کے دینے کا انداز
سکّہ ایسے پھینکا کا نسہ ٹوٹ گیا (منظرؔ واحدی)

خدا جانے کہ ہو تعمیر کیسی
غلط ہاتھوں میں نقشے جا رہے ہیں (خلیل واحدی)

میری اسی شکست میں ہے نصرتِ عظیم
دل پھول کی طرح ہے کہ ٹوٹا تو سر چڑھا (ظہیرؔ رحمتی)

لوگ خوش ہوتے ہیں اب روشنی کو گل کر کے
جشن شمعوں کو بجھانے کے لیے ہوتا ہے (ظہیر رحمتی)

شائد کہ یہ زمانہ انہیں پوجنے لگے
کچھ لوگ اس خیال سے پتھر کے ہو گئے (عبدالوہاب سخن)

کتنے سستے میں لٹاتا ہے وہ اپنی کائنات دل کے
بدلے جو بھی چاہے لے لے جنت دوست کی (ہیومن آزاد)

اب گردشِ حیات کے چکر میں آ گیا پچھتا رہا ہوں
گیسوئے دل بر سنوار کے (مظہرؔ رام پوری)

الغرض مذکورہ شعری امثال کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری اردو غزل نے جہاں دکن اور بیجا پور کے دبستانوں سے ہوتے ہوئے شمالی ہند کے دبستانوں میں اپنے ارتقاء کی میراج کا سفر کیا تو وہیں روہیل کھنڈ میں بھی اردو غزل گو شعرا نے اپنی گراں قدر خدمات سے سنہری تاریخ رقم کی ہے۔

حواشی :

۱۔ رام پور کا دبستانِ شاعری
۲۔ تاریخِ شعرائے مراد آباد
۳۔ تاریخِ روہیل کھنڈ
۴۔ کلیاتِ جون ایلیا، ص 95،
۵۔ مختلف اخبارات و رسائل
۶۔ ریختہ اور انٹرنیٹ وغیرہ سے ماخوذ

مظہر علی، مظہرؔ رام پوری
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، روہیل کھنڈ یونیورسٹی، بریلی
موبائل نمبر : 9927103914

نوم چامسکی کا فطری نظریہ
(Nativist Theory)
اور
اردو زبان کی تدریس

ڈاکٹر ترانہ یزدانی
مرادآباد، اتر پردیش
ای۔میل:yazdanisalam@gmail.com

زبان سیکھنے سے متعلق کئی اہم نظریات وقت کے ساتھ ساتھ وجود میں آئے ہیں جنہوں نے زبان کی تدریس اور سیکھنے کے عمل کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مثلاً: بی ایف اسکنر کا روایتی نظریہ(Behaviorist Theory)۔اس نظریے کے مطابق" زبان سیکھنا ایک عادت سازی(habit formation) کا عمل ہے۔ بچے زبان ماحول سے سنتے ہیں، نقل کرتے ہیں، اور انعام یا سزا کے ذریعے درست یا غلط زبان سیکھتے ہیں"۔ لیوو ویگوٹسکی (Lev Vygotsky) کا سماجی تعاملاتی نظریہ(Social Interactionist Theory) کے نظریے کے مطابق" زبان سیکھنے میں معاشرتی ماحول اور سماجی تعامل(interaction) اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے ZPD(Zone of Proximal Development) کا تصور بھی دیا (بچہ دوسرے افراد کی مدد سے اپنی صلاحیتوں سے آگے سیکھ سکتا ہے)۔ جین پیاجے نے وقوفی نظریہ (Cognitive Theory)، کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی کہ" زبان سیکھنا ذہنی نشوونما کا حصہ ہے، یعنی جیسے جیسے بچے کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے، ویسے ویسے وہ زبان سیکھتا ہے اور زبان ذہنی عمل کا عکس ہے"۔ معلوماتی عمل کے نظریے(Information Processing Theory) کے مطابق" زبان سیکھنے کا عمل کمپیوٹر کی طرح معلومات کو حاصل کرنے، ذخیرہ کرنے، اور استعمال کرنے پر مشتمل ہے۔ سیکھنے والے کا ذہن زبان کو مختلف سطحوں پر تجزیہ کرتا ہے، جیسے آوازیں، الفاظ، اور معنی"۔ مادری زبان منتقلی کے نظریہ(Theory of Language Transfer) کے مطابق" ثانوی زبان سیکھنے میں مادری زبان کے اصولوں اور ساخت کا اثر ہوتا ہے، جو کبھی مثبت اور کبھی منفی ہوسکتا ہے"۔
سیکھنے کے عمل میں یہ تمام نظریات یکساں طور پر اہمیت کے حامل ہیں، لیکن زبان سیکھنے کے تعلق سے سب سے اہم کام مشہور ماہر لسانیات ومفکر نوم چامسکی نے انجام دیا۔ انہوں نے زبان سیکھنے کے تعلق سے " فطری نظریہ"(Nativist Theory) پیش کیا۔ فطری نظریہ زبان سیکھنے کا وہ تصور پیش کرتا ہے جس کے مطابق انسان زبان سیکھنے کی ایک فطری اور پیدائشی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس نظریے نے زبان سیکھنے کے برتاوی نظریہ (Behaviorist Theory) کی مخالفت کی اور اسے ایک پیچیدہ ذہنی عمل قرار دیا، جو صرف نقل اور انعام کے ذریعے نہیں سمجھا جا سکتا۔
ان کی مشہور کتاب (Syntactic Structures 1957) ہے ،جس نے جدید لسانیات کی بنیاد رکھی۔ یہ کتاب زبان کی ساخت سمجھنے کے لئے ایک رسمی اور سائنسی طریقہ متعارف کراتی ہے۔ چامسکی نے پہلی بار" تخلیقی صرف و نحو"(Generative Grammar) کا نظریہ پیش کیا، جو یہ بتاتا ہے کہ محدود قواعد کے ذریعے لامحدود جملے تخلیق کئے جاسکتے ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف لسانیات بلکہ نفسیات، کمپیوٹر سائنس اور فلسفہ میں بھی ایک بنیادی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس نے زبان کے مطالعے کو یکسر بدل دیا۔ چامسکی کی اس کتاب نے زبان کو ایک ذہنی صلاحیت کے طور پر دیکھا اور لسانی نظریات کو سائنسی بنیادوں پر استوار کیا۔

چامسکی کے زبان دانی کے بنیادی نظریات

زبان سیکھنے کا فطری نظریہ(Innateness Hypothesis)

چامسکی کا ماننا ہے کہ ہر انسان میں زبان سیکھنے کی ایک فطری صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ بچے پیدائشی طور پر زبان کے بنیادی اصولوں سے واقف ہوتے ہیں اور جیسے ہی انہیں زبان کا ماحول ملتا ہے، وہ خودبخود زبان سیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اردو زبان کی تدریس میں اس نظریے کو اپنانے کا مطلب یہ ہے کہ اساتذہ کو طلبا کے اندر پہلے سے موجود زبان سیکھنے کی صلاحیت کو ابھارنا ہوگا، بجائے اس کے کہ وہ انہیں محض رٹے ی پر مجبور کریں۔

آفاقی قواعد(UG-Universal Grammar)

چامسکی کے مطابق تمام زبانوں میں کچھ بنیادی قواعد مشترک ہوتے ہیں۔ مثلاً جملوں کی ساخت، فاعل اور فعل کے اصول، اور دیگر نحوی (syntactic) خصوصیات۔ اردو زبان کی تدریس میں اس اصول کو بروئے کار لاتے ہوئے، اساتذہ طلبا کو مختلف زبانوں کے درمیان موجود مماثلتیں سمجھا سکتے ہیں تاکہ سیکھنے کا عمل آسان بنایا جا سکے۔

تحریک اور ان پٹ(MotivationInput Hypothesis)

چامسکی یہ بھی کہتے ہیں کہ زبان سیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کو معیاری ان پٹ (Input) فراہم کیا جائے۔ اگر اردو زبان کے اساتذہ طلبا کو ایسا تعلیمی ماحول فراہم کریں، جہاں انہیں زبان کے درست نمونے سننے اور پڑھنے کو ملیں، تو وہ زیادہ مؤثر طریقے سے سیکھ سکیں گے۔

تخلیقی تشکیل (Creative Construction)

چامسکی کا کہنا ہے کہ بچے صرف رٹے رٹائے جملے دہرانے کے بجائے زبان کے اصولوں کو سمجھ کر نئے جملے خود تخلیق کرتے ہیں۔ اردو زبان کی تدریس میں اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے، اساتذہ کو ایسی سرگرمیوں کا انعقاد کرنا چاہیے جو طلبا کو آزادانہ طور پر جملے بنانے اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں مدد دیں۔ اس کے لئے نہ صرف الفاظ سے معنی اخذ کرائے جاسکتے ہیں بلکہ ان الفاظ سے متعلق روزمرہ

زندگی میں استعمال کی مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔

چامسکی کے نظریات کی روشنی میں اردو زبان کی تدریس

زبان کسی بھی معاشرے کی بنیادی ضرورت اور پہچان ہوتی ہے۔ تدریسِ زبان کے مختلف نظریات اور طریقہ ہائے تدریس وقت کے ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ نوم چامسکی (Noam Chomsky) نے زبان دانی کے میدان میں جو نظریات پیش کیے، وہ زبان سیکھنے کی فطری صلاحیت (Innateness) پر زور دیتے ہیں۔ ان کے مطابق، انسان پیدائشی طور پر زبان سیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، جسے وہ
U
" m a
(آفاقی قواعد) کا نام دیتے ہیں۔ چامسکی کے ان نظریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو زبان کی تدریس کو جدید اور مؤثر بنایا جاسکتا ہے۔

اردو زبان کی تدریس میں چامسکی کے نظریات کا اطلاق

بامعنی تدریسی سرگرمیاں

اردو زبان کی تدریس میں ایسی سرگرمیوں کو شامل کیا جانا چاہیے جو طلبا کی زبان سیکھنے کی فطری صلاحیت کو اجاگر کریں، مثلاً: کردار ادا کرنے (Role Play) کی سرگرمیاں، کہانی نویسی اور کہانی سنانے کی مشقیں، مکالمہ بازی (Dialogue Practice)، مباحثے اور سوال و جواب کی مشقیں تاکہ طلبا کی فعال شراکت کو یقینی بنایا جاسکے اور وہ نئے نئے جملوں کی تخلیق میں فطری صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرسکیں۔

آئی سی ٹی (ICT) کا استعمال

جدید تدریسی طریقوں میں انفارمیشن اینڈ کمیونیکیشن ٹیکنالوجی (ICT) کا استعمال زبان سیکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ چامسکی کے نظریے کے مطابق، اگر طلبا کو معیاری زبان ان پٹ فراہم کیا جائے تو وہ بہتر سیکھ سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے درج ذیل طریقے اپنائے جاسکتے ہیں:

آڈیو اور ویڈیو مواد (مثلاً اردو کہانیاں، ڈرامے، اور مکالمے)

انٹرایکٹو ایپلیکیشنز اور گیمز

آن لائن فورمز اور بلاگز جہاں طلبا اپنی تحریری مہارت کا اظہار کرسکیں

قواعد کے بجائے تخلیقی صلاحیت پر زور

چامسکی کے نظریے کے مطابق، زبان کی تدریس میں گرامر کو بنا سمجھے رٹنے کے بجائے طلبا کو زبان کے استعمال کے مواقع فراہم کرنا زیادہ ضروری ہے۔ اردو کی تدریس میں، اگر طلبا کو اساتذہ کی رہنمائی میں ایسے مواقع دیے جائیں جہاں وہ خود جملے بناسکیں اور خیالات کا اظہار کرسکیں، تو وہ زیادہ بہتر طریقے سے زبان سیکھ سکیں گے۔

روایتی طریقہ تدریس سے گریز

اردو زبان کی تدریس میں اکثر بنا سمجھے رٹنے پر زور دیا جاتا ہے، جو چامسکی کے نظریے کے بالکل برعکس ہے۔ اس کے بجائے، عملی تجربات کے ذریعے سیکھنے کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں، جیسے: ڈرامائی تشکیل (Dramatization)، حقیقی زندگی کے موضوعات پر گفتگو، گروپ پروجیکٹس اور پریزنٹیشنز وغیرہ۔

چامسکی کے نظریات کی روشنی میں جدید تدریسی طریقے اور حکمت عملیاں

نوم چامسکی کا زبان سیکھنے کا نظریہ آفاقی قواعد (Universal Grammar) اور فطری صلاحیت (Innateness) پر مبنی ہے۔ اس کے مطابق، انسان پیدائشی طور پر زبان سیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسے محض مناسب ان پٹ (Input) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نظریے کو مدنظر رکھتے ہوئے، زبان کی تدریس کے لیے درج ذیل جدید تدریسی طریقے اور حکمت عملیاں اپنائی جاسکتی ہیں:

1. انکوائری بیسڈ لرننگ (Inquiry-Based Learning)

یہ طریقہ تدریس طلبا کی فطری زبان سیکھنے کی صلاحیت کو ابھارتا ہے، جہاں وہ خود سوالات کرتے ہیں اور زبان کے اصول دریافت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

استاد اردو کے مختلف جملے طلبا کے سامنے رکھے، جیسے:

احمد کتاب پڑھ رہا ہے۔"

زینب باغ میں کھیل رہی ہے۔"

پھر طلبا سے سوال کرے:

پہلے جملے میں رہا" اور دوسرے جملے میں رہی" کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایسا کیوں؟"

اس سے طلبا استاد کی رہنمائی میں خود ان اصولوں کو دریافت کرسکیں گے۔

یہ طریقہ چامسکی کے نظریے سے مطابقت رکھتا ہے کیونکہ طلبا زبان کے قواعد کو خود سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، بجائے اس کے کہ وہ انہیں بغیر سمجھے زبانی یاد کریں۔

2. باہمی رابطے پر مبنی ابلاغی طریقہ کار (Interactive Communicative Approach)

چامسکی کے نظریے کے مطابق، زبان سیکھنے کے لیے ماحول بہت اہم ہوتا ہے۔ اگر طلبا کو ایسا ماحول ملے جہاں وہ زبان کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں، تو وہ جلدی سیکھیں گے۔ مثال کے طور پر:

رول پلے (Role Play):

استاد کمرہ جماعت میں "بازار میں خریداری" کا منظر ترتیب دیتا ہے، جہاں کچھ طلبا خریدار اور کچھ دکاندار بنتے ہیں۔

وہ آپس میں تبادلہ خیال کرتے ہیں اور حقیقی زندگی کے جملے استعمال کرتے ہیں، جیسے:

یہ سیب کتنے کا ہے؟"

مجھے آدھا کلو چینی چاہیے۔"

اس طرح، طلبا زبان کو عملی طور پر استعمال کرتے ہیں اور خود بخود زبان کے اصول سیکھتے ہیں۔

یہ طریقہ زبان کے فطری سیکھنے کے اصول سے مطابقت رکھتا ہے کیونکہ اس میں طلبا زبان کو بغیر سمجھے رٹے کے بجائے حقیقی سیاق و سباق میں استعمال کرتے ہیں۔

3. قواعد کی تدریس کا استقرائی طریقہ (Inductive Grammar Teaching)

 61

چامسکی کے مطابق، زبان سیکھنے کا عمل بغیر سمجھے قواعد رٹنے کے روایتی طریقے کے بجائے، قدرتی مشاہدے اور سمجھ پر منحصر ہوتا ہے۔ انڈکٹیو گرامر تدریس میں استاد قواعد کو پہلے واضح نہیں کرتا، بلکہ طلبا کو مثالوں کے ذریعے اصول خود دریافت کرنے دیتا ہے۔ مثال کے طور پر:

استاد درج ذیل جملے لکھتا ہے:

احمد اسکول جا رہا ہے۔"

علی اور فاطمہ پارک میں کھیل رہے ہیں۔"

میں کھانا کھا رہا ہوں۔"

استاد طلبا سے پوچھتا ہے:" پہلے جملے میں رہا ہے ※، دوسرے جملے میں رہے ہیں ※ اور تیسرے جملے میں رہا ہوں کا استعمال ہوا ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس کا استعمال کب اور کیوں ہوتا ہے؟"

طلبا جملوں میں فرق کو محسوس کرتے ہیں اور خود اصول بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ طریقہ طلبا کی تخلیقی صلاحیت کو بڑھاتا ہے اور انہیں فطری طریقے سے زبان کے قواعد سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

4.ٹاسک بیسڈ لرننگ(TBL–Task-Based Learning)

چامسکی کے نظریے کے مطابق، زبان کو سیکھنے کے لیے اس کا قدرتی استعمال ضروری ہے۔ ٹاسک بیسڈ لرننگ میں طلبا کو ایسی سرگرمیاں دی جاتی ہیں جن میں انہیں زبان کو حقیقی معنوں میں استعمال کرنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر:

گروپ پروجیکٹ: طلبا کو ایک مشترکہ منصوبہ دیا جائے، جیسے "میرا پسندیدہ مقام" پر ایک پریزنٹیشن تیار کرنا۔

گروپ میں ہر طالب علم کو کچھ ذمہ داریاں دی جائیں، جیسے معلومات جمع کرنا، معلومات کو ترتیب دینا، جملے بنانا، اور پریزنٹیشن دینا۔

اس دوران، وہ ایک دوسرے سے بات چیت کریں گے، جملے بنائیں گے، اور زبان کو عملی طور پر استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔

یہ طریقہ زبان سیکھنے کے فطری عمل کی حمایت کرتا ہے، کیونکہ اس میں طلبا زبان کے اصولوں کو سمجھتے ہوئے نئے نئے جملوں کی تخلیق کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔

5.آئی سی ٹی (ICT) کا استعمال

چامسکی کے نظریے کے مطابق، اگر طلبا کو معیاری ان پٹ فراہم کیا جائے تو وہ بہتر سیکھ سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے آئی سی ٹی کا استعمال بہت مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر:

آڈیو ویژول لرننگ: استاد طلبا کو اردو کہانیوں پر مبنی ویڈیوز دکھا سکتا ہے اور پھر ان سے کہانی سے متعلق سوالات کر سکتا ہے۔

آن لائن لینگویج گیمز: جیسے "کون بنے گا اردو چیمپئن" یا "اردو کا سلطان کون"، جس میں طلبا کو درست جملے بنانے پر پوائنٹس ملتے ہیں۔

ورچوئل کلاس رومز: جہاں طلبا آڈیو/ ویڈیو کانفرنسنگ، آن لائن چیٹ اور ویڈیو کال کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ اردو میں تبادلہ خیال کرتے ہیں۔

یہ تمام تدریسی طریقے زبان سیکھنے کے فطری عمل کو سہولت فراہم کرتے ہیں اور چامسکی کے نظریے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس طرح چامسکی کے نظریات کی روشنی میں اردو زبان کی تدریس کو مزید فطری، تخلیقی، باہم مربوط اور فعال بنایا جا سکتا ہے۔

چامسکی کا نظریہ زبان سیکھنے کو ایک فطری عمل قرار دیتا ہے۔ اگر اساتذہ اردو زبان کی تدریس میں اس نظریے کو اپنائیں تو اس کے مثبت اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ زبان سیکھنے کے لیے ایک سازگار ماحول، معیاری ان پٹ، اور تخلیقی سرگرمیوں (مکالمہ نویسی، خاکہ نگاری، اخباری سرخیوں پر تبصرہ، رول پلے، مضمون نویسی، بحث ومباحثہ، بیت بازی اور قصہ گوئی وغیرہ) کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا، اردو زبان کے اساتذہ کو جدید تدریسی حکمت عملیاں اپنانے کی ضرورت ہے، تاکہ طلبا نہ صرف زبان سیکھ سکیں بلکہ اسے تخلیقی اور مؤثر انداز میں استعمال بھی کر سکیں۔

چامسکی کے نظریے کی روشنی میں زبان کی تدریس میں رٹےم کے بجائے فطری صلاحیتوں کو ابھارنے پر زور دیا جانا چاہیے۔ انکوائری بیسڈ لرننگ، انٹرایکٹو سرگرمیاں، انڈکٹیو گرامر ٹیچنگ، ٹاسک بیسڈ لرننگ، اور آئی سی ٹی جیسے جدید تدریسی طریقے اپنانے سے طلبا زبان کو بہتر اور مؤثر انداز میں سیکھ سکتے ہیں۔ اردو زبان کی تدریس میں ان طریقوں کو شامل کر کے اسے زیادہ دلچسپ اور کارآمد بنایا جا سکتا ہے۔

:References

Principles of language .(2007). D. H,Brown
Pearson .(.(5th edlearning and teaching
Education
Aspects of the theory of .(1965). N,Chomsky
. MIT Press.syntax
.(.(3rd edLanguage and mind.(2006). N,Chomsky
.Cambridge University Press
Its :Knowledge of Language.(1986). N,Chomsky
. Praeger.Nature Origin and Use
Chomsky's .(2014). M,Newson ※※ V,Cook
.(.(3rd ed An Introduction:Universal Grammar
.Routledge
Task-based language learning and .(2003). R,Ellis
. Oxford University Press.teaching
How .(2021). N,Spada ※※ P.M,Lightbown
Oxford .(.(5th edLanguages are Learned
.University Press
.(2011). M,Anderson ※※ D,Larsen-Freeman
Techniques and principles in language teaching
.Oxford University Press.(.(3rd ed
.(2014). S. T,Rodgers ※※ C. J,Richards
Approaches and methods in language teaching
.Cambridge University Press.(.(3rd ed
(2nd Ideas and Ideals:Chomsky.(2004). N,Smith
.Cambridge University Press.(.ed

 62

کشور ناہید کی ترجمہ نگاری:

عورت ایک نفسیاتی مطالعہ کے حوالے سے

شگفتہ خانم

رسرچ سکالر ایم۔ جے۔ پی روہیلکھنڈ یونی ورسٹی

پیلی بھیت بائی پاس روڈ بریلی

نگراں: پروفیسر ڈاکٹر شیو یہ ترپاٹھی

شعبہ اردو بریلی کالج بریلی

کشور ناہید اردو ادب کی مشہور و معروف ہستی ہیں۔ عام طور پر ان کی پہچان تانیثی شاعرہ کے روپ میں ہوتی ہے، لیکن نثر میں بھی انہوں نے نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔ نثر میں مضامین، ترجمے، کالم، ہ خودنوشت وغیرہ لکھی ہیں۔

کشور ناہید نے بہت سارے غیر ملکی شعراء اور ادباء کا کلام اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جس
میں پابلو نرودا، وزنی سینکی، کینتھ بچن، لیوپولڈ، سیداد سینگھور، فروغ فرخ زاد، رابرٹ فراسٹ جان مشکزئی زئی اور ہرا کی کے کلام کا ترجمہ کیا ہے۔ نثر میں سیمون دی بوار کی کتاب ''Second Sex The'' کی تلخیص' بپسی سدھوا کے ناول کا ترجمہ' لیلا خالد کی آپ بیتی کا ترجمہ کیا ہے۔ مغربی ادیبوں کے مضامین کو ترجمہ کرا کر ایک کتاب ''باقی ماندہ خواب'' کے نام سے ترتیب دی ہے۔

1982ء میں کشور ناہید نے پیرس کی مشہور مصنفہ سیمون دی بوار کی کتاب Second Sex کا ترجمہ اور تلخیص کی ہے۔ سیمون دی بوار کی یہ کتاب 1950ء میں فرانس میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ Facts and Myths کے نام سے ہے اور دوسرے حصے کا نام "Women's Life Today" ہے۔ کشور ناہید نے دوسرے حصے کا ترجمہ کیا ہے۔ تلخیص کرتے وقت کشور ناہید نے اس میں پاکستانی کلچر اور صورتحال کی مثال مثالیں اپنی طرف سے پیش کر دی ہیں۔

سیمون دی بوار کی کتاب کے دوسرے حصے کا نام Women'sLife Today ہے۔ اس حصے کو بھی چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب The Formative Years کے نام سے ہے۔ جس کے اندر چار عنوان ہیں۔ Childhood (2) Young Girl (3) Sexual Initation (4) The Lesbian-

کشور ناہید نے ترجمہ کرتے وقت اس کتاب کا نام عورت ایک نفسیاتی مطالعہ رکھا ہے انہوں نے پہلے باب کا ترجمہ کرتے وقت وہی عنوان لیے ہیں۔

پہلے باب کا عنوان بچپن ہے۔ اس باب میں انہوں نے عورت کی پیدائش سے نوجوان ہونے تک کے حالات بتائے ہیں۔ کتاب کی شروعات میں لکھا ہے کہ عورت اس طرح نہیں پیدا ہوتی جس طرح بنا دی جاتی ہے۔ ماں کے پیٹ سے پیدائش تک کا عمل یکساں ہوتا ہے لیکن بعد میں گھر میں معاشرے میں فرق ہونے لگتا ہے۔ سیمون دی بوار نے بھی اس کی شروعات ان الفاظ میں کی ہے۔

One is not born one is not born but rather become, a women No biological or economical fate determines the figure that the human female present in society. it is civilization as a whole that produces this creature intermediate between male and eunch, which is discribe as famine.

(page number 273, Semon the buior, The Second Sex)

اس پورے حصے میں سیمون دی بوار نے عورت کی بچپن سے لے کر جوانی تک کی نفسیاتی کیفیات بیان کی ہیں۔ کشور ناہید نے ان سب خیالات کو آسان زبان میں بیان کیا ہے۔ ایک چھوٹی بچی سے لے کر جوان ہونے تک کی نفسیاتی کشمکش کو سیمون دی بوار نے بہت ساری مثالوں کے ذریعے سمجھایا ہے۔ کشور ناہید نے ان میں سے چند اہم مثالیں بھی ترجمہ کی ہیں۔

اس باب کا دوسرا عنوان (The Young Girl) نوجوان لڑکی کے نام سے ہے۔ اس حصے میں لڑکی کی نوجوانی کی کیفیات کو بیان کیا ہے۔ ایک طرف لڑکی کے ذہن میں بچپن سے یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ

63

مرد ہی اس کا محافظ ہے وہ اس کو اپنا محافظ بھی سمجھتی ہے۔ کہیں نہ کہیں اس سے برابری کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے لیکن معاشرے میں مرد کی برابری کرنے والی لڑکی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ کچھ لڑکیاں برابری کرنے کے چکر میں اتنا آگے نکل جاتی ہے کہ وہ مردوں کی طرح گالی گلوچ اور مار پیٹ کرنے پر اتر آتی ہیں۔ یہ حالات صرف بچپن سے لڑکا اور لڑکی کے مابین فرق کرنے کے نتیجے میں نظر آتے ہیں۔

سیمون دی بوار نے بھی اپنی کتاب میں بہت ساری مثالیں دے کر لڑکی اور لڑکے کے درمیان فرق کو کو واضح کیا ہے۔ انہوں نے ایک لڑکی کی مثال دی ہے جو لڑکوں کی طرح پلی بڑھی تھی۔ سڑک پر کسی خاتون کے ساتھ بدتمیزی ہوتے دیکھ مار پیٹ کر کے ان کو بچا بھی لیتی ہے لیکن ایک بار مردوں کو گالی گلوچ کرتے دیکھ اس کو لگا وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ تب سے وہ اپنا اعتماد کھونے لگی۔ ان ساری گرہوں کو کھولنے کا ایک ہی مقصد ہے کہ بچپن سے ہی لڑکوں کو طاقتور اور لڑکی کو کمزور نہیں باور کرانا چاہیے بلکہ دونوں کو ہی اپنی اہمیت کا احساس کرانا چاہیے تاکہ وہ خود اعتماد بنیں۔

اس باب کا تیسرا عنوان ''عورت زمانہ جوان جوانی میں'' ہے سیمون دی بوار نے اس کا نام Sexual Initiation رکھا ہے۔ اس عنوان کے تحت انہوں نے عورت کی نفسیاتی خواہشات کا بیان کیا ہے۔ مرد کی طرح عورت میں بھی جنسی خواہش بچپن میں ہی بیدار ہو جاتی ہے۔ مرد اس خواہش کو حاکم کی طرح، عورت محکوم کی طرح استعمال کرتی ہے۔ عورت کو اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے مرد کی خواہش ہر لمحہ ماننا پڑتی ہے۔ اگر عورت کی طرف سے پہل ہو جائے تو وہ فحش مانی جاتی ہے۔

اس باب کا چوتھا اور آخری عنوان لیز بین نام سے ہے لیز بین سے مشابہت ہم جنس کا شکار عورتوں کو لیز بین کہا جاتا ہے۔ مردوں سے متنفر ہونے کے بعد عورتیں ہم جنسیت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس باب میں مصنف نے بتایا ہے کہ لڑکیاں عام طور پر اپنے سے بڑی عمر کی عورتوں کی طرف راغب ہوتیں ہیں۔ ایسا شاید ان کو ماں کے پیار کی محرومی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

لزبین کی انہوں نے دو اقسام بتائی ہیں۔ پہلی وہ جو مرد سے خوفزدہ ہو کر عورت میں مدغم ہوتی ہیں دوسری جو مرد کی نقل کرتی ہیں۔ ہم جنسیت کے غیر قدرتی کام ہے جس کا انجام تباہی اور بربادی ہی ہوتا ہے۔ مصنفہ نے والدین کو اولاد کی تربیت کرنے کے کچھ سجھاؤ دیے ہیں لڑکیوں کو نہ پوری طرح مردانہ اعتبار سے رکھنا چاہیے نہ ہی ان کے ساتھ تفریق کرنا چاہیے۔

اس کتاب کے دوسرے باب کا پہلا عنوان ''شادی شدہ عورت ہے'' معاشرے میں شادی شدہ عورت کو زیادہ عزت دی جاتی ہے۔ شادی مرد اور عورت دونوں کے لیے الگ چیز ہوتی ہے۔ عورت کو صرف بچے پیدا کرنے اور مرد کا گھر سنبھالنے کے لیے شادی کی جاتی ہے۔ جبکہ مرد کو صرف عورت کے اخراجات پورا کرنے ہوتے ہیں۔ ماؤں کے بچے شادی کے بعد سارے کام اپنی بیویوں سے کرانا پسند کرتے ہیں ان کو لگتا ہے کہ زندگی بھر اپنے کام کے لیے پریشان رہے اب اطمینان سے ان کے سارے کام ہونے چاہیے۔ ہاں اگر مرد عورت کی تعلیم مساوی ہو تو وہ بیوی کے کام میں ہاتھ بٹا دیتا ہے۔ اس باب میں انہوں نے مرد عورت کی شادی شدہ زندگی کے مختلف سطحوں پر اتار چڑھاؤ کو بیان کیا ہے۔

سیمون دی بوار نے ان اتار چڑھاؤ کو الگ الگ مثالیں دے کر سمجھایا ہے۔ مرد اور عورت دونوں ایک ہی وقت میں شادی کرتے ہیں لیکن دونوں کے لیے اس کا مطلب الگ الگ ہوتا ہے۔ لڑکی کی ماں اس کو ہر حال میں شادی قائم رکھنے کی اور مرد کے آگے جھکنے کی نصیحتیں کرتی رہتی ہے۔ ایک مرد اپنی سات شادیاں برباد کر کے آٹھویں شادی کرنا چاہتا ہے لڑکی اس کے ہاتھوں ہو کر اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی لیکن ماں اس کے پیسے اور رتبے کا لالچ دے کر اپنی بیٹی کو اس سے شادی پر راضی کر لیتی ہے۔

شادی شدہ زندگی میں نہ صرف مرد کیا آگے جھکنا سکھایا جاتا ہے بلکہ شوہر کو قابو میں کرنے کے گر بھی سکھائے جاتے ہیں شادی شدہ زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے کشور ناہید لکھتی ہیں:۔

''شادی کا المیہ یہ نہیں کہ وہ عورت کو خوشیاں اور خوابناک خوشیاں دینے میں ناکام رہتی ہے اعتبار زندگی میں خوشی کی کی ایک بہت بڑی قدر ہے یہی زندگی سے نابود ہو جاتا ہے عورت کی زندگی کے ابتدائی 20 شادی شدہ سال بہت مطمئن اور پرسکون ہوتے ہیں اس وقت اسے دنیا اور اپنی منزل دونوں واضح اور اطمینان بخش معلوم ہوتے ہیں مگر پھر احساس ہوتا ہے کہ ایک ہی مرد کی خدمت تواضع دلداری اور بچوں کی آیا گیری کیا یہ زندگی کا اغاز اور معراج ہے کبھی کبھی اس کی خدمات کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے مگر یہ سب کچھ اسے مذحقہ خیز معلوم ہوتا ہے بلکہ مرد کو بھی اس عمر میں اگر اس لطف لطف مسلسل سے وحشت ہی ہونے لگتی ہے۔ آزادی کا بہر حال مطلب کمزوری یا بے راہ روی نہیں ہوتا جذبات اسی وقت بامعنی ہوتے ہیں جب وہ حکم اور خوف سے مبرہ زندگی میں عملی شکل

64

اختیار کرتے ہیں۔ ورنہ ہر قسم کے منافقت اور جھوٹ کو جنم بھی یہی جذبات دیتے ہیں''

(عورت ایک نفسیاتی

مطالعہ صفحہ نمبر 81)

آخر میں انہوں نے لکھا ہے کہ شادی کی ناکامی کی ذمہ داری صرف ایک مرد پر نہیں ڈال سکتے کسی بھی لڑکی کو ماں یا بیوی بننے سے پہلے ایک فرد بن کر جینے کا سلیقہ آنا چاہیے۔ عورت کو پوری طرح مرد پر منحصر نہیں ہونا چاہیے۔ معاشرے میں عورت کے لیے شادی ہی سب کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اس سوچ کو بدلنے سے ہی عورت کے حالات میں تبدیلی آ سکتی ہے۔ دوسرا باب کا دوسرا عنوان ماں کے نام سے ہے۔ ماں بننا عورت کے لیے سب سے خوبصورت مرحلہ ہوتا ہے اس باغ میں ماں بننے سے لے کر بچوں کی پرورش تک کے حالات کو بیان کیا ہے۔ لڑکے اور لڑکی کی پرورش میں تضاد کرتی ہے یہی تضاد آگے چل کر لڑکے اور لڑکی دونوں کو باغی بنا دیتا ہے۔ کچھ باتیں اپنی محرومیوں کا ازالہ کرنے کے لیے اپنی بیٹیوں کو حد سے زیادہ محبت اور توجہ دیتی ہے انہیں ہر وقت اپنے ساتھ باندھ کر رکھتی ہیں یہ توجہ بھی لڑکی کو قید معلوم ہوتی ہے۔ کشور ناہید لکھتی ہیں ''اگر عورت کو معاشرے اور گھر میں سکون اور عزت مل رہی ہوگی تو وہ اولاد کے ساتھ کبھی بھی سختی اور حاکمیت کا رویہ اختیار نہیں کرے گی'' (صفحہ نمبر 101)

مرد کو اپنی حاکمیت قائم کرنے کے لیے کبھی بھی عورت کو کمتر ثابت نہیں کرنا چاہیے آج کے دور میں ہر عورت بطور بیوی بطور ماں اور بطور خاتون ہر سطح عزت اور برابری کے حقوق چاہتی ہے۔ اس باب کا تیسرا عنوان سماجی زندگی ہے۔ میاں بیوی سماج میں جو رول ادا کرتے ہیں اس کا احوال روز مرہ کی مثالوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ ایک خاندان معاشرے میں بہت سارے اتار چڑھاؤ کا سامنا کرتا ہے۔ شوہر کی خوشنودی کے لیے بیوی کو سجی سنوری گڑیا کی طرح مہمانوں کے سامنے پیش ہونا پڑتا ہے نئے کپڑوں اور جیولری کی نمائش کے لیے فضول دعوتیں بھی کرنا پڑتی ہیں۔ عورتیں اپنی نمائش کرنے کے لیے آرام دہ کپڑے جوتے استعمال کرنے کے بجائے فیشن ایبل کپڑے جوتے استعمال کرتی ہیں۔ جس سے وہ دوسروں کو اپنی جانب متوجہ کر سکیں۔ کچھ خواتین اپنی عمر کو کم ظاہر کرنے کے لیے کھانے پینے کا بہت پرہیز کرتی ہیں۔ طرح طرح کی ورزش کرتی ہیں۔ شوہر کی محبت اور توجہ حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو ہر طرح سے خوبصورت بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔

کشور ناہید نے لکھا ہے:۔

''ایک محبت کرنے والے شوہر کے لیے تو عورت چاہے کسی بھی لباس میں ہو۔ لائق محبت اور قابل تعریف معلوم ہوگی لباس مرد کے قریب تر ہونے کا ایک طریقہ ہو سکتا ہے مگر کل نہیں۔ عمر کے گزرنے کے ساتھ جذبات اور محسوسات جسمانی قرب کی لذت سے معمول کی جانب سفر کرتے ہیں''

(صفحہ 107)

سیمون دی بوار کے الفاظ میں:۔

A Loving Husband or an ardent lover will often be indeffewrent to a women's cloths. If they love her intesely in the nude, even the most becoming costumes do no more than conceal her; and she will be as dear to them when poorly dressed or tired out as when dazzling. If they no longers love her the most flattering cloths will not do any good dress can be weapon of conquest, but not a defensive werapons, its art is to creat mirages, it present an imagenary object to the yes but in the carnal embrace, as in the familialirty of every day life, all mirages fade from veiw; conjugal sentiment, like phsycal love, exist on the plan of reality.

(Page No 514)

کبھی کبھی مرد کی بے رخی اور حاکمیت سے تنگ آ کر خواتین باہر کی دنیا میں دوسرے مردوں میں سکون تلاش کرنے لگتی ہیں۔ جو انہیں صرف بربادی کی طرف لے جاتا ہے بہت کم جگہوں پر شوہر بیویوں کو برابر کا درجہ دیتے ہیں۔ ورنہ ہر جگہ بیوی کو شوہر سے کمتر مخلوق سمجھا جاتا ہے جب تک ساری دنیا میں عورت اور مرد کی برابری کو تسلیم نہیں کیا جاتا' رشتوں کی ناہمواریوں کا سلسلہ چلتا رہے گا۔

دوسرے باپ کا چوتھا عنوان ''طوائف اور اور مشبوحہ کے نام سے'' ہے سیمون دی بوار شادی کا تعلق طوائفیت سے بتاتی ہیں ان کی نظر میں سماج میں بیوی اور طوائف کو ایک برابر سمجھا جاتا ہے جس کی تلخیص کشور

ناہید نے ان الفاظ میں کی ہے:۔

''رقم تو گھر پر بیاہ کرانے والی عورت پر خرچ کرنا مرد کی ہی ذمہ داری اور اس کی مردانگی قرار پاتی ہے۔ بالکل اسی طرح کرائے پر لی گئی طوائف پہ بھی رقم خرچ کی جاتی ہے مگر ایک مقررہ وقت کے لیے بیوی کو سماج میں ظاہر کیا جاتا ہے جبکہ طوائف سے رشتے کو راز میں رکھا جاتا ہے۔''

(صفحہ 114)

اس باب میں انہوں نے عورت کے طوائف بننے کے حالات کو بیان کیا ہے۔ کچھ عورتیں اپنے شوق اور خرچ پورے کرنے کے لیے طوائف بن جاتی ہیں۔ کچھ اپنے شوہروں کی پابندیوں سے تنگ آ کر اور دیہات کی کچھ لڑکیاں دھوکے سے یا اپنے عاشق کے جال میں پھنس کر فروخت ہو جاتی ہیں۔ طوائف بننے کے بعد کچھ وقت تک تو وہ خوشحال رہتی ہیں۔ لیکن بعد میں کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہو کر فوت ہو جاتی ہیں۔ طوائف کے ساتھ ساتھ انہوں نے مشبوحہ کا بھی حال بیان کیا ہے انگریزی میں مشبوحہ کے لیے Hitairas لفظ استعمال کیا ہے۔ مشبوحہ ان عورتوں کو کہا جاتا ہے جو صرف ہر ایک کو اپنا بدن نہیں بیچتی بلکہ کوئی نہ کوئی فن بھی اپنے اندر موجود رکھتی ہیں۔ فنِ موسیقی، رقص اور اداکاری وغیرہ میں ماہر ہوتی ہیں امیرانہ ٹھاٹ رکھتی ہے اپنی لڑکیوں کو کانوینٹ اسکول میں پڑھاتی اور ہر ممکن اپنے جیسا بننے سے روکتی ہیں۔

اگلا عنوان ''پختہ عمری سے بڑھاپے کی جانب'' ہے۔ اب تک عوام میں بچپن جوانی اور شادی شدہ زندگی کے حالات بیان کیے ہیں۔ اس باب میں عورت کے پختہ عمر سے بڑھاپے تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں خواتین خود کو جوان رکھنے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں لیکن جسمانی تغیر اور تبدیلی ہو کر رہتی ہے۔ کچھ خواتین تو حیض بند ہونے کی آزادی کو خوشی کے ساتھ قبول کر لیتی ہیں۔ کچھ خواتین زندگی کے اس فیصلے کو قبول ہی نہیں کر پاتی ان کو لگتا ہے کہ شوہر کی ناقدری کے باعث وہ وقت سے پہلے بڑھاپے کو پہنچ گئی ہیں۔ کچھ عورتیں بڑھاپے میں خدا سے لو لگا لیتی ہیں اور باقاعدہ نمازی بن جاتی ہیں۔

ڈھلتی عمر کے ساتھ عورت کی نفسیات کو بہت اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ نانی اور دادی بن کر خواتین کی محبت اپنی اولاد سے زیادہ نواسیوں اور پوتیوں میں ہوتی ہے فارغ وقت میں وہ اپنے پرانے چھوٹے ہوئے شوق پورے کرتی ہیں۔ گھر والے اضافی شے سمجھتے ہیں تو وہ ایک کونے میں پڑی موت کا انتظار کر رہی ہوتی ہیں۔

اس باب کا آخری عنوان ''عورت کا مقام اور کردار'' ہے۔ خواتین کے بچپن سے بڑھاپے تک کے حالات کا ذکر کرنے کے بعد اس باب میں انہوں نے معاشرے میں عورت کے مقام اور کردار کا جائزہ لیا ہے عورت صرف اتنی ہی دنیا دیکھتی ہے جتنی مرد اسے دکھاتا ہے۔ اسے باہر کے معاملوں سے الگ رکھ کے کم عقل اور بے وقوف ثابت کرتا ہے۔ یوں تو ہر شعبے میں عورت نے ترقی کر لی ہے مگر گھر میں ابھی بیوی خود کو شوہر سے کمتر محسوس کرتی ہے ان کو ہر جگہ بار بار یہ محسوس کرایا جاتا ہے کہ وہ مرد سے کم عقل ہیں۔ عورت کو غلام بنانے میں کہیں نہ کہیں معاشی کمزوری بھی سب سے بڑی وجہ ہوتی ہے۔ اپنی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کے لیے عورت مرد پر منحصر ہوتی ہے لڑکیوں کو بچپن سے ایک شہزادے کے خواب دکھائے جاتے ہیں جو اسے زندگی کی محرومیوں سے نجات دلا کر سارے ارمان پورے کرنے والا ہوتا ہے۔ مگر زندگی متضاد رویوں کو سامنے لاتی ہے تو لڑکیاں ساری مرد ذات سے خائف ہو کر خود اذیت میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ بغاوت کی صورت میں طلاق کا خوف بے گھر ہونے کا ڈر مالی ذمہ داری اور بوجھ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے مرد کا ہر حکم ماننے اور اس کی حیثیت تسلیم کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ یا حالات عورت کو دھیرے دھیرے اپنی ذات میں تنہا کر دیتے ہیں۔ عمر گزارنے کے ساتھ ساتھ عورت کے لہجے میں کرختگی، تلخی اور مرد سے اکتاہٹ آ جاتی ہے وہ خاندان اور بچوں کے لیے زندہ رہنے کو ہی زندگی کہتے ہیں۔ خواتین اگر اپنی ذات اور علم سے بغاوت کرنا چاہیں تو اس کی مخالفت سب سے پہلے خواتین ہی کرتی۔ حالات بدلنے کے لیے سب سے پہلے انفرادی جدوجہد کو اجتماعی جدوجہد میں بدلنا ہوگا۔

اس کے بعد تیسرا باب شروع ہوتا ہے The Second Sex میں یہ چوتھا باب ہے۔ جو ''جسٹی فیکیشن'' کے نام سے ہے۔ اس باب کا پہلا عنوان نرگسیت کے نام سے ہے اس باب میں انا پرست اور خود پرست عورتوں کے حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ایسی عورتیں بس اپنے آپ سے پیار کرتی ہیں خود کو آئینے میں گھنٹوں دیکھتی ہیں۔ اپنے آپ کو خوبصورت رکھنے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتی ہیں اس طرح کی عورتوں میں اداکارائیں اور ماڈل وغیرہ آتی ہیں۔

اس باب کا دوسرا عنوان ''عشق میں گرفتار عورت کے نام'' سے ہے۔ عشق دونوں جنسوں کے لیے الگ الگ چیز ہوتا ہے۔ مرد کا عشق زندگی میں ایک الگ چیز ہے جبکہ عورت کے لیے عشق پوری زندگی ہوتا

66

ہے۔اس باب میں مصنفہ نےعشق کے الگ الگ مرحلوں کو بتایا ہے۔مرد سے عشق کرتے کرتے وہ برابری میں محبت بھی چاہتی ہے لیکن مرد صرف کچھ وقت کی محبت جتا کر الگ ہو جاتے ہیں۔خواتین اپنے عشق کو چھپاتی ہیں لیکن مرد فخر سے سب کے سامنے بتاتے ہیں شوہر کی طرف سے لگائی ہوئی پابندیوں کو بھی عورت محبت کا نام دیتی ہے سب کے سامنے وہ یہی کہتی ہے کہ زیادہ محبت ہے اس لیے کہیں جانے نہیں دیتے آخر میں مصنفہ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عشق کو عورت اپنی کمزوری نہ بنائے بلکہ اپنی طاقت بنائے۔

تیسرا عنوان ''روحانیت'' ہے مردوں میں عشق تلاش کرتے کرتے عورت اپنے آپ کو خدا سے جوڑ لیتی ہے اس باب میں عشق حقیقی کا بیان کیا ہے۔کشور ناہید نے پاکستان اور مسلم مذہب کی مثال پیش کی ہے جبکہ سیمون ڈی بوار نے عیسائی کلچر سے مثالیں پیش کی ہیں۔

اس کے بعد چوتھا اور آخری باب ہے۔ اس باب میں دو عنوان ہیں نمبر ایک آزاد عورت نمبر دو اختتامیہ۔ پہلے باب میں آزاد عورت کے نام سے عورت کیا آزادی کا جائزہ لیا ہے اس باب میں مصنفہ کہتی ہیں کہ عورت کی آزادی کی باتیں تب تک خیالی رہیں گی جب تک ان کو معاشی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔

عورت اپنے اخراجات کے لیے مرد پر منحصر ہوتی ہے اس لیے وہ خود مفلوج ہو جاتی ہے۔صرف گھر سے باہر نکل کر کام کرنے کا مطلب آزادی نہیں ہوتا نوکری کرنے پر بھی خواتین کے لیے نہ گھر کے کام کم ہوتے ہیں نہ ہی گھر کی ذمہ داریاں اس کے علاوہ کام کرنے والی جگہوں پر بھی عورت کو کام کا کم معاوضہ دے کر اس کا استحصال کیا جاتا ہے۔شادی شدہ عورت کے لیے اس کی آمدنی گھر میں اضافی آمدنی کے طور پر ہوتی ہے۔جبکہ لڑکیاں صرف شادی کی تیاری میں مدد کرنے کے لیے کماتی ہیں۔ کوئی بھی خاتون کبھی اپنے پیروں پہ کھڑی ہونے کی کوشش نہیں کرتی بہت کم خواتین ہیں جو اپنے شعبوں میں معاشی اور سماجی انفرادیت حاصل کرتی ہیں مرد کے سامنے بچپن سے یہ سوال آتا ہے کہ بڑا ہو کر کیا بنے گا؟ لیکن لڑکیوں کو بچپن سے ہی شادی اور گھر بسانے کے خواب دکھائے جاتے ہیں ۔گھر میں بچپن سے ہی ایسا ماحول بنایا جاتا ہے کہ نوکری کرنے کے باوجود بھی گھر کا سارا کام کرنا عورت اپنا فرض سمجھتی ہے۔ کچھ مرد اپنی بیوی سے اس لیے کام نہیں کرانا چاہتے کہ وہ ان پر حاوی ہو جائے گی ۔بغیر کئے چین سے زندگی گزارنے والی عورت کو دیکھ کر بھی کمانے والی عورت کو اپنا قدم غلط لگتا ہے۔ یہ سارے عدم مساوات دور ہو سکتے ہیں اگر مرد سمجھداری سے عورت کا ہر معاملے میں ساتھ دے۔

آخری عنوان اختتامیہ ہے۔ اس باب میں پوری کتاب کا جائزہ پیش کیا ہے مرد کے مرتب کردہ اصولوں پر عورت کو ایک کمتر انسان سمجھا جاتا ہے عورت اپنے آپ کو برابر لانے کے بجائے بغاوت کر کے نفرت کے بیج بو رہی ہے۔ یہ تضاد ایسے ہی چلتا رہے گا اگر ایک دوسرے کو بطور فرد عزت واحترام نہیں دیا جائے گا۔معاشی' اخلاقی' سماجی اور تہذیبی ہر سطح پر معاشرے میں بدلاؤ ہونے سے ہی تبدیلی ممکن ہے۔ چھوٹی بچی کو کھلونے ،تربیت،کورس اور تعلیم مرد عورت کے برابری کی بنیاد پر ملیں گی تو وہ خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقائق سے معاملہ کرنے کے اہل ہوں گی۔ قدرتی امتیازات کو ان کی کمزوری نہ بنایا جائے بلکہ ہر چیز کی جان کاری ہونے پر وہ کسی بھی مقام پر کمزور نہیں پڑے گی۔

دونوں کتابوں کو جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کشور ناہید نے تلخیص کے لیے بہت عمدہ الفاظ کا چناؤ کیا ہے۔سیمون ڈی بوار کی یہ کتاب 1950 میں شائع ہوئی۔کشور ناہید نے اس کا ترجمہ 32 سال بعد 1982 میں کیا تھا۔ اتنے سالوں میں عورت کی زندگی میں بہت سارے اتار چڑھاؤ آئے ہیں جن کو کشور ناہید نے ترجمہ کرتے وقت اپنے تجربے کے حساب سے بیان کیا ہے۔اپنے حالات کو بہتر کرنے کے لیے انہوں نے اپنی طرف سے سجھاؤ بھی دیے ہیں۔خواتین کی نفسیاتی مطالعے کے لیے اردو زبان میں مصنفہ کی یہ کتاب بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اردو ادب میں ان سے پہلے کوئی عورت اتنا کھلا لہجہ اپنانے کی ہمت نہیں کر پائی ہے۔

شگفتہ خانم

ریسرچ سکالر ایم۔ جے۔ پی روہیلکھنڈ یونی ورسٹی
پیلی بھیت بائی پاس روڈ بریلی
نگراں: پروفیسر ڈاکٹر شیویہ ترپاٹھی
شعبہ اردو بریلی کالج بریلی

67

شاعری میں زبان کے تخلیقی استعمال کی ضرورت

تیمور احمد خان

ریسرچ اسکالر (شعبۂ اردو)

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ

ای میل ahmadtaimoor735@gmail.com

ابتدائی زمانے سے ہی کم وبیش ہر مفکر نے شاعری کی نوعیت و ماہیت کو واضح کرتے ہوئے شاعری میں انسانی جذبات و احساسات کی اہمیت پر زور دینے کے ساتھ شاعری کی افادیت اور مقصدیت کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہیں بعض مغربی مفکرین نے شاعری کے جمالیاتی پہلوؤں کو تسلیم کرتے ہوئے اسے فنون لطیفہ کا اہم ستون بھی قرار دیا ہے۔ حالانکہ فنون لطیفہ کے طور پر شاعری کے تشکیلی عمل کا کوئی خاطر خواہ معروضی جائزہ نظر نہیں آتا۔ جس میں شاعری، کو اجزاء میں تقسیم کئے بغیر اس کے وجود میں آنے کے محرکات اور نامیاتی یا تشکیلی عمل کا جائزہ لیا جا سکتا ہو۔ دیکھا جائے تو موضوع، مواد اور ہئیت کی طرح زبان کا جائزہ بھی ایک جزو کی حیثیت سے لیا جاتا رہا ہے۔ غالباً اسی سبب شاعرانہ اور غیر شاعرانہ زبان کی تقسیم ہمیشہ سے ہی اہل دانشور کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہے۔

اردو شاعری کے وقیع سرمائے پر نظر ڈالیں تو ہمیں زبان کے تعلق سے اسی نوعیت کی تقسیم عیاں طور پر نظر آتی ہے جس کے نتیجے میں الفاظ کو صوری اور معنوی اعتبار سے منقسم کر کے دیکھا جاتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایک طرف تو ثقیل، کریہہ اور نامانوس الفاظ اور دوسری جانب سبک رواں، مانوس، حسین اور سامعہ نواز الفاظ کی بحثیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ شبلی نے فصیح، غیر فصیح، سبک اور گراں، غنائی اور مغلق وغیرہ الفاظ کی تقسیم اور الفاظ کی صوتی کیفیات کے حوالے سے بعض کار آمد نتائج برآمد کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''الفاظ متعدد قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض نازک، لطیف، شستہ، صاف، رواں اور شیریں اور بعض پر شوکت، متین، بلند۔ پہلی قسم کے الفاظ عشق و محبت کے مضامین کے ادا کرنے کے لئے موزوں ہیں، عشق و محبت انسان کے لطیف اور نازک جذبات ہیں، اس لئے ان کے ادا کرنے کے لئے لفظ بھی اسی قسم کے ہونے چاہئیں۔۔۔۔''

شعر العجم، حصہ چہارم، معارف پریس اعظم گڑھ

ص، ۱۹۸۸، ۵۹۔۶۱

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ شبلی نے زبان کی تقسیم کرتے وقت الفاظ کی مجرد اور مطلق حیثیت کو خاطر میں رکھا ہے۔ جس میں معنوی اور صوری لحاظ سے الفاظ محدود دائرۂ عمل کے حامل ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی تقسیم کے تحت الفاظ کے استعمال میں شعوری کارفرمائی شامل رہتی ہے۔ جو مزید اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ شعری ہئیت کے اجزا جداگانہ حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں شاعری اور شعری زبان سے متعلق جو تصورات اور مباحث سامنے آتے ہیں اس سے شاعری کے نامیاتی عمل پر روشنی پڑتی ہے اور شعری زبان کے پرانے تصور کی تردید ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ نئے نظریے کی رو سے شاعری ایک فن ہے اور اس کی حدود وہاں سے شروع ہوتی ہیں جہاں مادی علوم وفنون کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ شاعری کی بنیاد جذبے اور جذباتی رد عمل پر ہے. جس کو شعری تجربے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شعری تجربے کی تین منزلیں (مادی، ذہنی اور نفسیاتی اور لسانی) ہوتی ہیں۔ چنانچہ پہلی منزل پر شاعر زندگی کے کسی بھی مظہر، شے یا خیال کے جذباتی رد عمل سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ حسیاتی تجربہ دوسرے تجربات، احساسات و تاثرات اور کیفیات کو جنم دیتا ہے۔ لیکن شاعری محض جذباتی ہیجان یا جذباتیت کے اظہار کا نام نہیں بلکہ جذباتی تجربات کی ترتیب اور قطع برید کا نام ہے۔ دوسری منزل پر پہنچ کر شاعر بنیادی خیال کو قوت متخیلہ یا وجدان کی مدد سے وسعت دینا شروع کر دیتا ہے اور داخلی سطح پر تجربے کا ادراک کرتا ہے۔ ادراک کی اس منزل کے ساتھ ہی اظہار کی لگن بھی جنم لیتی ہے اور شاعر لسانی سطح پر ان تجربات کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح شعری تجربہ جذباتی، نفسیاتی اور لسانی منزلیں طے کر کے جمالیاتی تجربہ بن جاتا ہے اور فنی وحدت کی شکل میں قاری کی حسیات اور تخیل کو بیدار کرتا ہے۔ چنانچہ شعری تجربہ خود ساختہ زبان کی تشکیل کرتا ہے جس کی نوعیت زبان کے عام استعمال سے مختلف ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے شاعرانہ اور غیر شاعرانہ زبان کی روایتی تقسیم اور صناعی کا تصور بے معنی نظر آنے لگتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ زندگی کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ زبان بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ الفاظ میں تبدیلیاں دو سطحوں پر نمودار ہوتی ہیں۔ ایک معنوی اور دوسری خارجی یا صوری۔ یعنی لفظ سماجی تبدیلیوں کا اثر قبول کرتے ہوئے اپنے پرانے معنی میں تحریف، توسیع اور ترمیم کرتا رہتا ہے وہیں صوری سطح پر اس کے املا، انشا اور تلفظ وغیرہ میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ان تبدیلیوں میں معنوی تبدیلیاں اہم اور غور طلب ہیں۔ ایسے الفاظ جو رفتہ رفتہ سماجی ضرورت کو پورا کرنے کی صلاحیت کھو دیتے ہیں، متروک

68

قرار دے دیے جاتے ہیں۔بعض الفاظ کا استعمال روایتی اور تقلیدی ہونے کے سبب فرسودہ معلوم ہونے لگتا ہے۔فرسودہ الفاظ کی جگہ نئی حسیت کے ابلاغ کے لئے نئے الفاظ وجود پا کر استعمال ہونے لگتے ہیں۔ یا پھر متروک وفرسودہ الفاظ کو غیر معمولی معنوں میں استعمال کیا جانے لگتا ہے۔اس عمل سے الفاظ اپنی معنوی توانائی دوبارہ حاصل کرتے ہیں۔زبان کی فرسودگی کے حوالے سے وزیر آغا نے الفاظ کے دو دھاروں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''ایک دھارا تو وہ ہے جس میں الفاظ کثرت استعمال سے دم بدم اپنی داخلی حرارت سے محروم ہو رہے ہیں یعنی مرگِ حرارت میں مبتلا ہیں اور یوں law of entropy کے تابع ہوکر نہ تو خود کو Regenerate کر سکتے ہیں اور نہ تخلیق کے عمل ہی سے بہرہ مند ہونے پر قادر ہیں۔ان میں سے ہر لفظ کا ایک متعین مفہوم اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چپک چکا ہے۔یہ وہ سکے ہیں جن پر قیمت کا ٹھپہ لگ چکا ہے اور اب تبدیل نہیں ہوسکتا اور اسی لئے یہ اس جہان میں بالکل بے کار ہیں۔جہاں کا سکہ کچھ اور ہے۔''

(وزیر آغا، نئے تناظر، اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد، ۱۹۷۹، ص ۸۹)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کثرت استعمال یا تقلیدی استعمال کی وجہ سے الفاظ معنوی جمود کے حامل ہوجاتے ہیں۔یعنی ان کے ساتھ متعینہ معنی یا مفہوم چپک جاتے ہیں۔جس کی وجہ سے الفاظ کی تازگی و توانائی برقرار نہیں رہتی اور اسی سبب یہ نئی زندگی کی حسیت یا معنویت کے اظہار کے قابل نہیں رہتے۔یہ زبان کاروباری یا عام زبان کہلاتی ہے۔جو کسی راست مفہوم کی ترسیل کے لئے کارآمد تو ہوسکتی ہے لیکن محسوسات کی دنیا کو مس نہیں کرسکتی۔یہ لسانی تبدیلیاں جہاں عام اور کاروباری یا روزمرہ کی زبان میں ظاہر ہوتی ہیں وہیں مجازی یا شعری و ادبی زبان بھی تغیر وتبدل سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔اس ضمن میں وزیر آغا زبان کی سطحوں کا ذکر کرتے ہوئے کاروباری اور مجازی زبان کے فرق و امتیاز کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''(زبان) خود مجازی سطح پر بھی اکثر و بیشتر کثرت استعمال کے باعث کاروباری سطح پر آجاتی ہے۔حد یہ ہے کہ ایک دور کی تشبیہیں، استعارے، تراکیب وغیرہ آئندہ دور میں پٹ ہٹا کر کاروباری حیثیت اختیار کرلیتی ہیں۔چنانچہ شاعر کو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ ہر بار زبان کو ایک نئے انداز میں استعمال کرے۔یوں کہ اس کی مجازی سطح کاروباری سطح پر غالب آجائے۔''

(تخلیقی عمل، وزیر آغا، علی گڑھ بک ڈپو، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ، ۱۹۷۵، ص ۱۵۵)

عام زبان تقلیدی اور روایتی انداز میں استعمال ہوکر جس طرح معنوی توانائی کھوکر کاروباری حیثیت اختیار کرتی ہے اسی طرح مجازی یا ادبی زبان میں بھی معنوی جمود کا درآنا کوئی حیرت کی بات نہیں معلوم ہوتی۔ادبی زبان تشبیہات، استعارات اور علامات و پیکر استعمال کرتی ہے۔مگر کبھی کبھی یہ وسائل اکہرے معنی کے حامل ہوجاتے ہیں اور نئی حسیت یا خیال کے اظہار کے لئے ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔مثلاً زلف کو گھٹا، ہونٹوں کو گلاب کہنا کسی زمانے میں یقیناً نئی بات رہی ہوگی مگر آج کل کے زمانے میں اس نوع کے الفاظ انوکھے پن کا احساس دلانے میں ناکام نظر آتے ہیں۔اس تناظر میں دیکھا جائے تو گھسے پٹے اور فرسودہ شاعرانہ وسائل کو نئے معنوں اور نئے زاویوں سے استعمال میں لایا جانا چاہئے تاکہ کسی بھی ادبی زبان میں دلچسپی اور تازگی کا عنصر برقرار رہے۔یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ لفظ کو جب تعبیری یا استعاراتی معنوں میں برتا جاتا ہے تو اس میں توانائی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ اپنے لغوی یا متعینہ معنی کے حصار کو توڑ کر معنی کی وسعتوں کو سمو لینے کی صلاحیت حاصل کرلیتا ہے۔تب کہیں جاکر نادر و نایاب جذبات کی نقش گری اور تجسیم کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔زبان کا یہ غیر معمولی یا تخلیقی استعمال تشبیہ، استعارات علامات اور پیکروں کے استعمال سے وجود میں آتا ہے۔تخلیقی زبان میں فنی وسائل کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے شمس الرحمان فاروقی لکھتے ہیں۔

''تخلیقی زبان چار چیزوں سے عبارت ہے، تشبیہ، پیکر استعارہ اور علامت۔۔۔تشبیہ، پیکر استعارہ اور علامت میں سے کم سے کم دو عناصر تخلیقی زبان میں تقریباً ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔اگر دو سے کم ہوں تو زبان غیر تخلیقی ہوجائے گی"

(شعر غیر شعر اور نثر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۲۰۰۵، ص ۱۳۹)

انیس ناگی شاعری میں زبان کے تخلیقی استعمال پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''تخلیق شعر میں لفظ کے استعمال کی بنیادی غایت تخلیقی تجربے کی ترسیل اور تشکیل ہے۔لفظ شاعر کا بنیادی حربہ ہے۔اسی کے ذریعہ وہ تجربے کے خط وخال معین کرتا ہے۔۔۔۔شاعر تخلیق شعر میں الفاظ کو مخصوص ڈیرائن کے تحت استعمال کرتا ہے۔یہ ڈیزائن شاعر کا جذباتی سیاق و سباق ہوتا ہے۔شاعر کے الفاظ کے ساتھ مخصوص شخصی تلازمے وابستہ ہوتے ہیں۔''

(تنقید شعر، انیس ناگی، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۸۷، ص ۴۹۔۵۱)

مذکورہ باتوں سے یہ نکتہ مترشح ہوجاتا ہے کہ نئے اور غیر معمولی انداز سے زبان کو استعمال کرنا اس کے معنوی امکانات کو مزید روشن کرتا ہے۔زبان کا یہی غیر معمولی استعمال تخلیقی استعمال کا ضامن بنتا ہے۔الفاظ کے تخلیقی استعمال کے سبب ہی نادر و نایاب اور غیر

69

مانوس تاثرات کوگرفت میں لایا جاسکتا ہے۔عنوان چشتی نے لفظ کے تخلیقی عمل کوجوہری توانائی سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''لفظ کا تخلیقی استعمال اس (لفظ) میں نئی توانائی، تازگی اور تاثیر پیدا کرتا ہے۔تخلیقی عمل سے گزر کر لفظ میں زندگی کی بڑھتی پھیلتی ہوئی لہروں کا احاطہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے اور زندگی نیز زمانے کی تمام نیرنگیوں اور ان نیرنگیوں کے تمام امکانات کو جذب کر کے ان کی عکاسی کرنے کی طاقت پیدا ہوجاتی ہے۔لفظ کا کوئی ذائقہ،کوئی خوشبو،کوئی رنگ،کوئی روپ نہیں ہوتا لیکن جب یہ تخلیقی عمل سے گزر جاتا ہے تو اس میں ایک جوہری توانائی آجاتی ہے۔''

(تنقید سے تحقیق تک،ڈاکٹرعنوان چشتی،،اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۷۴،ص ۳۶)

اس طرح لفظ کے تخلیقی استعمال سے واقعے کے ساتھ ساتھ تجریدیت کوگرفت میں لینے کی سہولت بھی ہاتھ آجاتی ہے۔وزیر آغا اپنے مضمون ''زبان اور ادبی زبان'' میں الفاظ کے تخلیقی استعمال کی نوعیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ایسے الفاظ جو فن کار کے ہاتھوں کے لمس سے زندہ اور بوقلموں جسموں کی طرح دھڑکنے لگتے ہیں مگر محض صورتوں کی بوقلمونی اور دھڑکن کا مظاہرہ ہی ان الفاظ کا واحد مقصد نہیں ان لفظوں کا واحد مقصد یہ بھی ہے کہ وہ اندر کے جہانِ پراسرار کو گرفت میں لیں اور یہ کام جبھی ممکن ہے کہ وہ اپنے اوپر سے متعین معنی کا سخت چھلکا اتار پھینکیں۔تمثیل کی زبان یوں کہہ لیجئے کہ جب کاروباری الفاظ کے سکوں کو کٹھالی میں ڈال کر ان کے سابقہ نقوش کو منہدم کر دیا جائے تو پھر خالص دھات کی صورت میں وہ نئے نقوش کو قبول کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔یہ ایک اچھے ادیب کا کام ہے کہ وہ اپنے تخلیقی عمل میں پہلے تو لفظ کو اس کے مروج مفہوم سے نجات دلاتا ہے اور پھر ایک جادوگر کی طرح اسے ایک نئے،تازہ اور زرخیز مفہوم سے منسلک کر دیتا ہے۔"

(وزیر آغا،نئے تناظر،اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد،۱۹۷۹،ص ۹۰)

لفظ کا تخلیقی استعمال اسے وسیع معنوں میں استعمال کرنے کے تخلیقی عمل سے وجود میں آتا ہے۔جہاں لفظ کی آواز اور آواز کی اشاریت سے بھی بھرپور کام لیا جاتا ہے۔چونکہ شاعری کا تعلق بنیادی طور پر جذبے سے ہے۔جس کی بنا پر شاعری نثری منطق سے دور ہوجاتی ہے۔جذبات اور ان سے پیدا شدہ تاثرات غیر واضح اور مبہم ہوتے ہیں۔جس کے لئے روایتی یا عام زبان دور تک ساتھ نہیں دے سکتی۔یہی وجہ ہے کہ ان تاثرات کے اظہار کے لئے زبان کا غیر معمولی استعمال عمل میں لایا جاتا ہے تاکہ ان جذبات واحساسات کو قاری کے سامنے اعلیٰ صورت میں پیش کیا جاسکے۔کبھی کبھی جذبات کے اظہار کیلئے زبان کی عام ہیئت اور اسکیم میں بھی تبدیلی لائی جاتی ہے۔

ان تمام معروضات کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ نئے انوکھے،مبہم،غیر مانوس اور پیچیدہ خیالات اور احساسات کو گرفت میں لینے کے لئے شاعر زبان کے مروجہ ڈھانچوں میں تبدیلی لاکر الفاظ کو نئے اور تعبیری معنوں میں استعمال کرتا ہے۔وہ نئی نئی تشبیہات،استعارات،علامات،تراکیب اور پیکر اختراع کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ شعری تجربے کے آغاز سے لیکر اس کے اظہار تک زبان کا تخلیقی استعمال بنیادی اہمیت کا حامل بن جاتا ہے اور زبان کے تخلیقی استعمال کی ضرورت کا جواز بھی یہیں سے مستنبط کیا جاسکتا ہے۔

حواشی:۔

۱۔شعر العجم، حصہ چہارم ،معارف پریس اعظم گڑھ ص،۱۹۸۸،۵۹۔۶۱

۲۔وزیر آغا،نئے تناظر،اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد،۱۹۷۹،ص ۸۹

۳۔تخلیقی عمل،وزیر آغا،علی گڑھ بک ڈپو،شمشاد مارکیٹ علی گڑھ،۱۹۷۵،ص ۱۵۵

۴۔شعر غیر شعر اور نثر،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۲۰۰۵،ص ۱۳۹

۵۔تنقید شعر،انیس ناگی،سنگ میل پبلیکیشنز لاہور،۱۹۸۷،ص ۴۹۔۵۱

۶۔تنقید سے تحقیق تک، ڈاکٹرعنوان چشتی،،اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۷۴،ص ۳۶

۷۔نئے تناظر،وزیر آغا،اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد،۱۹۷۹،ص ۹۰

70

تحقیق کا معلّم اوّل حافظ محمود خاں شیرانی

ڈاکٹر عرشی خاتون

چودھری محلہ، کٹیہار

arshikhatoon.amu@gmail.com

اردو میں باقاعدہ تحقیقی مقالہ لکھنے والوں میں پہلا نام حافظ محمود خاں شیرانی کا آتا ہے۔انھوں نے پہلی بار صحت واستناد کے اصولوں کو لازم قرار دیا۔ انھوں نے بتایا کہ تحقیق میں جذباتیت اور مبالغہ آمیزی کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ یہاں ہمیں صرف سچائی کا اظہار کرنا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم انھیں تحقیق کا معلم اوّل مانتے ہیں۔بہ قول رشید حسن خاں:

''ہندوستان میں اردو فارسی کی نسبت سے شیرانی صاحب کو میں تحقیق کا معلم اوّل مانتا ہوں۔ان کی بے مثال حیثیت یہ ہے کہ انھوں نے ادبی تحقیق کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت عطا کی اور اس اعتبار سے وہ روایت ساز تھے۔'' ۱؎

حافظ محمود خاں شیرانی ۵/اکتوبر ۱۸۸۰ء کو ریاست ٹونک راجستھان میں پیدا ہوئے۔وفات ۱۵/فروری ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔انھوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد اورینٹل کالج، لاہور سے منشی، منشی عالم اور فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۴ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے اعلیٰ تعلیم کی غرض سے لندن روانہ ہوئے۔ ان کے والد کی یہ خواہش تھی کہ وہ لندن جا کر بیرسٹری کا امتحان پاس کریں۔اور ہندوستان واپس آ کر اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں۔لندن میں رہ کر انھوں نے رومن لا، کریمنل لا، سینوشن لا، نیز لیگل ہسٹری کے امتحان میں یکے بعد دیگرے کامیابی حاصل کی۔وہ قانون کی پڑھائی کر ہی رہے تھے کہ اسی دوران ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔والد کی وفات کے بعد ان کے بھائی مسعود خاں نے انھیں اخراجات کے پیسے بھیجنے میں کوتاہی برتنی شروع کر دی۔لہٰذا مالی تنگی کے سبب ان کو پڑھائی بیچ میں ہی چھوڑ دینی پڑی۔لیکن ان کا قیام لندن میں ہی رہا۔انھوں نے وہاں کی لائبریریوں سے استفادہ کرتے ہوئے قدیم فارسی ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ لندن یونیورسٹی سے فارسی کا امتحان دیا اور اوّل آنے پر انھیں اوزلے اسکالرشپ ملا، جس سے انھوں نے پروفیسر ٹی۔ڈبلیو آرنلڈ کی رہنمائی میں ایک سال تک عربی زبان کا مطالعہ کیا۔لیکن مالی تنگی کا مسئلہ برقرار ہی رہا۔یہاں تک کہ لندن میں ان کا قیام مشکل نظر آنے لگا۔آمدنی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ایک دن یونہی پریشانی کے عالم میں سڑکوں پر چہل قدمی کر رہے تھے، کسی کباڑیے کی دکان پر کھڑے ہو کر کتابوں پر نظر ڈالنے لگے۔اچانک انھیں ایک پرانی کتاب دکھائی دی۔کتاب کے دام دریافت کیے تو بہت معمولی۔انھوں نے قیمت ادا کی اور کتاب خرید لی۔پھر کتاب لے کر مشہور فرم لوزک اینڈ کمپنی کو اچھی قیمت پر بیچ آئے۔یہ کمپنی پرانی چیزوں کا کاروبار کرتی تھی۔لہٰذا یہ ان کا ذریعہ معاش بنا۔اب انھوں نے پرانی کتابوں کے ساتھ ساتھ تصاویر اور دیگر آثارِ عتیقہ کی بھی تلاش و جستجو شروع کر دی۔اس طرح وہ نوادرات اور مخطوطات کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کچھ بھی نوادرات حاصل کر کے لوزک اینڈ کمپنی کو بیچ آتے۔بعد میں وہ اس کمپنی میں بطور مشیر برائے اسلامی مخطوطات و آثار عتیقہ کا کام کرنے لگے۔بعد میں اس کمپنی نے انھیں ۱۹۱۳ء میں ہندوستان کی پرانی چیزیں مثلاً کتابیں، سکّے، تصاویر، مورتیاں وغیرہ خرید کر لانے کا کام سونپا۔پھر وہ ہندوستان آ گئے اور یہیں مستقل قیام کر لیا۔

۱۹۲۰ء میں شیرانی صاحب نے فردوسی پر چار مقالے لکھے۔یہ مقالے تحقیقی حیثیت سے بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔اس مقالے کے چار عنوان مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ''شاہنامہ'' کی نظم کے اسباب

(۲) ہجو سلطانی محمود غزنوی

(۳) فردوسی کا مذہب

(۴) یوسف زلیخا فردوسی

شیرانی صاحب نے ان چاروں عنوان کے تحت مفصل تحقیق کی اور اس کتاب سے متعلق ایسی چونکا دینے والی باتیں بتائیں کہ اہلِ ایران بھی اب تک اس سے ناواقف تھے۔

تحقیق منسوبات تحقیق کی ایک شاخ ہے۔اس پر شیرانی صاحب نے زبردست کام کیا ہے۔''خالق باری'' کے بارے میں اب تک سمجھا جا رہا تھا کہ یہ امیر خسرو کی تصنیف ہے۔انھوں نے اپنی تحقیق سے یہ بات ثابت کی ہے کہ یہ ضیاء الدین خسرو کی کتاب ہے۔دیباچے میں لکھتے ہیں:

''مصنف کا نام خسرو اور لقب ضیاء الدین ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ مشہور یمین الدین امیر خسرو نہیں ہے بلکہ کوئی اور جس کو طوطی ہند کے ساتھ نام میں اشتراک کے سوا کوئی اور وجہ مماثلت نہیں۔سال تصنیف ۱۰۳۱ھ ہے جو مادہ تاریخ ''تصنیف آخر'' سے برآمد ہوتا ہے۔حضرت امیر خسرو ۷۲۵ھ میں وفات پاتے ہیں اور یہ خسرو ۱۰۳۱ھ میں بہ عہد جہانگیر اپنی تالیف تیار کرتا ہے۔اب ظاہر ہے کہ ہمارے بزرگوں نے بربنائے مشارکت اسمی اس خسرو کو زیادہ مشہور امیر خسرو تصور کر کے خالق باری کو غیر مستحقانہ قدامت دے دی ہے۔'' ۲؎

خالق باری امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے، اس کی ایک وجہ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ:

''اگر خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہوتی تو صورت حالات بالکل مختلف ہوتی۔ اس عہد سے لے کر سینکڑوں کتابیں اب تک اس کی تقلید میں لکھی جاتیں۔شارح اس کی شرحیں لکھتے۔اہلِ لغات اس سے استناد کرتے اور یہ کتاب مختلف فیہ لغات کے لیے ایک سندی ماخذ بن جاتی۔بہت کم لوگ واقف ہیں۔جس محنت اور مشکلات کے ماحول میں آٹھویں نویں اور دسویں قرن ہجری کے ہندی فرہنگ نگاروں نے اپنی کتب لغات ترتیب دی ہیں۔وہ ادنیٰ ادنیٰ شرحوں سے لغات جمع کرتے ہیں۔کتابوں کے حواشی سے الفاظ لیتے ہیں۔استادوں سے پوچھ رہے ہیں۔خطوط و رقعات سے استناد کر رہے ہیں۔وغیرہ۔اگر امیر خسرو اتنا بڑا مجموعہ

71

لغات اپنی یادگار چھوڑ جاتے جو کہا جاتا ہے کئی ہزار اشعار اور کئی جلدوں پر شامل تھا
تو کیا یہ فرہنگ نگار جو ایک درجن سے زیادہ ہیں،
اس سے استفادہ نہیں کرتے۔ یہ خیال کرنا کہ محض اتفاقیہ یہ کتاب ان کے ہاتھ نہیں لگی۔
بے حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کتاب کو داخل نصاب مانا جاتا ہے۔
اس لیے شروع ہی سے ان کی واقفیت اس سے ضروری تھی۔'' ۳؎

شیرانی صاحب اپنی تحقیق میں داخلی شواہد سے کام لیتے ہیں۔ داخلی شواہد کو وہ دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک حصّہ الفاظ اور انداز بیان سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا حصّہ افراد اور واقعات سے متعلق ہے۔ مثال کے طور پر ''خالق باری'' میں ایک لفظ 'دام'
آیا ہے۔ شعر ؎

دانگ فلوس جو آ ہے پیکا جتیل دمڑا جان
دام وانچہ کیسہ کھیسہ جان میکش تان ۴؎

اس داخلی شہادت کو سامنے رکھ کر انھوں نے اسے عہد اکبر کے بعد کی تصنیف قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:
''یہاں 'دام' اور 'دمڑا' جن کا رواج اکبری عہد میں شروع ہوجاتا ہے قابلِ غور ہیں۔ اکبر کے ہاں مالیہ کی وصولی چاندی کے رپے کے بجائے تانبے کے جدید اللرائج سکّے 'دام' کے ذریعے سے ہوتی تھی..........
بہر حال دام اور دمڑا اکبری دور سے قبل نامعلوم تھے۔ جب خالق باری میں یہ الفاظ موجود ہیں تو ظاہر ہے کہ اکبر کے بعد اس کی تالیف عمل میں آئی ہوگی۔''
۵؎

اسی طرح ایک کتاب ہے ''پرتھی راج راسا'' اس کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ بہت قدیم کتاب ہے۔ اور عہد غلامات، خلجی، تغلق، لودھی، مغل یعنی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے قبل لکھی جاچکی ہے۔ لیکن یہ کتاب اتنی قدیم نہیں ہے بلکہ بہت بعد کی ہے۔ اس کتاب کی قدامت کے متعلق شیرانی صاحب لکھتے ہیں:
''راسا میں توپ و بندوق کا ذکر۔ دس فیصدی غیر ہندی الفاظ کی اس میں آمیزش اور دیگر بیانات کی لغویت وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایسے زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ جب کہ توپ و بندوق ہندوستان میں عام طور سے استعمال ہونے لگی ہیں۔ اور فارسی وعربی الفاظ ہندی زبان میں شامل ہوچکے ہیں۔'' ۶؎
شیرانی صاحب نے اس کتاب پر تنقید وتبصرہ کیا ہے۔ اس کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:
''راسا اُن خوش قسمت مگر جعلی کتابوں میں سے ہے جو اپنے بعض گونا گوں مفروضہ اوصاف کی بنا پر دنیا سے عرصے تک خراج ستایش وتحسین وصول کرتی رہی ہے اور زمانۂ تصنیف سے لے کر اب تک عوام الناس کے دلوں پر اپنے اقتدار کا سکہ جمائے ہوئے ہے۔ اس کے پرستار اس کو ایک صحیفۂ آسمانی سے کم درجہ نہیں دیتے۔'' ۷؎

۱۹۲۲ء میں شیرانی صاحب نے علامہ شبلی نعمانی کی کتاب ''شعر العجم'' پر ''تنقید شعر العجم'' لکھی۔ ''شعر العجم'' میں مولانا نے فارسی شعراء کی تاریخ پیش کی ہے۔ ''تنقید شعر العجم'' میں انھوں نے سب سے پہلے مولانا شبلی کی اس کاوش کو سراہتے ہوئے لکھا ہے:
''مرحوم نے تاریخ نگاری کی بنیاد ایسے زمانے میں ڈالی جب فن تاریخ کا شوق ہمارے دل سے محو ہو چکا تھا، اردو زبان تاریخی کتابوں سے بالکل تہی مایہ تھی اور ملک کا مذاق نہایت پستی کی حالت میں تھا۔ ایسے جمود کے وقت میں ان کے قلم نے اس فن کے احیا میں وہ زبردست اور قابلِ قدر خدمت کی جو صدیوں تک یادگار رہے گی۔'' ۸؎

اس تحسین کے بعد شبلی کے تسامحات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً شبلی نے ص ۵۶ اور ص ۱۸۵ میں ایک ہی واقعہ کو دو شخصیتوں سے منسوب کرکے بیان کیا ہے:
''ایک دفعہ محمود چوگان کھیلنے میں گھوڑے پر سے گر پڑا اور خفیف سا زخم آیا عنصری نے فی البدیہ کہا ؎

شاہا ادبے کن فلک بدخورا
کآسیب رسانید رخ نیکورا
گر گوئی خطا رفت بہ چوگانش زن
ور اسپ غلط کرد یمین بخش اورا'' ۹؎

اسی واقعہ کو سلطان سنجر اور امیر مغری کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں:
''ایک دفعہ سلطان سنجر گیند کھیل رہا تھا اتفاق سے گھوڑے نے شوخی کی اور سنجر گھوڑے سے
گریز کیا۔ مغری نے برجستہ رباعی پڑھی ؎

شاہا ادبے کن فلک بدخورا
کو چشم رسانید رخ نیکورا
گر گوئی خطا کرد بہ چوگانش زن
ور اسپ خطا کرد بہ من بخش اورا ۱۰؎

اس پر شیرانی صاحب نے لکھا ہے:
'' ؎ خطاے بزرگان گرفتن خطا است
ہمارے پرانے معتقدات سے ہے لیکن افسوس کہ انھیں غلط اصولوں کی پیروی کا نتیجہ ہے کہ آج کل ہماری تاریخیں رطب و یابس غث وسمین اور دروغ و راست کا مجموعہ بن رہی ہیں، ہماری جرح وتعدیل کے پرانے ہتھیار پڑے پڑے زنگ آلود ہوگئے لیکن اس خوش اعتقادی کا روسیاہ جس نے ہمیں ان کے استعمال سے روک رکھا ہے۔ اس قسم کے موضوعات سے شبلی نے اگرچہ عنصری کی رونق محفل خوب کردی لیکن قصۂ بالا کا اصلی موضوع میرے خیال میں امیر مغری ہے۔''
۱۱؎

''شعر العجم'' کے مطالعے کے بعد شیرانی صاحب نے اپنے مجموعی تاثر کا اظہار اس طرح کیا ہے:
''شعر العجم'' کے مطالعہ کے بعد میری ذاتی رائے یہ قائم ہوتی ہے کہ علامہ شبلی اس تصنیف کے دوران میں مورخانہ ومحققانہ فرائض کی نگہداشت سے ایک بڑی حد تک غافل رہے ہیں۔ رطب و یابس جو کچھ ان کے مطالعے میں آجاتا ہے بشرطیکہ دلچسپ ہو، حوالہ کردیتے ہیں۔ بعض وقت دیکھا جاتا ہے کہ مولانا اپنے پچھلے بیانات کی آگے جاکر خود ہی تردید کردیتے ہیں۔ پچھلے کچھ رائے قائم کی بعد میں

72

جا کر کوئی اور نظریہ قائم کرلیا۔ممکن ہے کہ شبلی تاریخ اسلام میں بہتر نظریہ رکھتے ہوں لیکن شعرائے عجم کے حالات میں ان کے طاقت ور قلم نے بہت لغزشیں کی ہیں۔ اس خاص دائرے میں ان کی معلومات تاریخی نہایت محدود ہے اور نہ تمام سلسلۂ شعراء ان کے دواوین اور مآثر پر کافی عبور ہے، سن و تاریخ جو فنِ تاریخ کا ایک شاندار اور ایک وقیع پہلو ہے اس پر اوّل تو پوری توجّہ
نہیں کی اور ضرورتاً کہیں ایسا کیا بھی تو غلطیوں سے خالی نہیں۔بعض متاخرین کو متقدمین کا پہلونشین بنا دیا ہے اور بعض متاخرین کو متقدمین کا ہم بزم کر دیا ہے۔
بہت سے غیر تاریخی
افسانوں نے شعرالعجم میں قابلِ عزت جگہ پائی ہے۔'' ۱۲؎

محمود شیرانی نے ''تنقید آبِ حیات'' کے عنوان سے محمد حسین آزاد کی کتاب ''آبِ حیات'' کا بھی جائزہ لیا ہے اور اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ''آبِ حیات'' میں شعراء سے متعلق جو معلومات دی گئی ہیں ان پر اعتبار کرنے سے پہلے تحقیق ضروری ہے۔جیسے ذوقؔ کے بارے میں آزادؔ نے بہت سی غلط بیانیاں کی ہیں اور اگر کہیں صحیح بات لکھی بھی ہے تو تعریف اس حد تک بیان کی ہے کہ مبالغہ کے حد کو چھولیا ہے۔ذوقؔ کے متعلق آزاد رقم طراز ہیں:

''جب وہ صاحب کمال ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہاں میں پھیلی۔اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آبِ حیات اس پر شبنم ہوکر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکّہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ ہوگیا۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادرالکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔''

۱۳؎

آزادؔ ایک غیر معتبر راوی تھے اس لیے شیرانی صاحب نے ہمیں تاکید کی ہے کہ ہم آزادؔ کی باتوں میں نہ آئیں۔اور آبِ حیات میں مذکور باتوں پر بھروسہ نہ کریں، اور آبِ حیات کو اپنا ماخذ نہ بنائے اگر بنائیں بھی تو پہلے استناد کی جانچ کرلیں۔

لسانیات کے موضوع پر بھی شیرانی صاحب نے اچھا کام کیا ہے۔ اپنے تحقیقی مقالے 'پنجاب میں اردو' میں انھوں نے اردو کا رشتہ پنجاب سے جوڑا ہے۔اردو کے آغاز کے متعلق لکھتے ہیں:

''اصل یہ ہے کہ اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہوگئی ہے جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر توطن اختیار کرلیا ہے۔ہمارے مصنفین کا ایک مزعومہ خیال کرتا ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔کوئی مصنفین اسے برج کی
بیٹی بتاتا
ہے۔اور کوئی اس کے دودھ سے اس کی پرورش کرتا ہے......اس موقع پر ہمارے
مورخ
یہ امر فراموش کرجاتے ہیں کہ مسلمانوں کے تعلقات ہندوستان اور اہل ہند کے ساتھ پرتھی راج کی شکست اور فتح دہلی کے زمانہ سے شروع نہیں ہوتے بلکہ ان
واقعات سے
کئی صدی پیشتر سے ابتدا پاتے ہیں۔وہ عربوں کی فتح سندھ وملتان پر مسلمان پہلی صدی سے قابض تھے۔پنجاب پر ان کا قبضہ معزالدین محمد سام کی آمد سے ایک سو ستر سال پہلے سے تھا۔سندھ و پنجاب میں ہندو مسلم اقوام سب سے پہلے ملتی جلتی ہیں۔اس لیے انہیں اگر ایک عام زبان کی ضرورت ہوئی تو ان ممالک میں پیش آئی
ہوگی۔اور اردو کو ان
ممالک میں وجود میں آنا چاہیے۔'' ۱۴؎

اردو زبان کے آغاز کا سہرا پنجاب کے سر باندھنے کے بعد اس ضمن
وہ میں مزید لکھتے ہیں:

''جب ہم اردو کے ڈول اس کی شناخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں۔تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ڈھنگ اور ہے اور برج بھاشا کا رنگ اور ہے۔دونوں کے قواعد و ضوابط و اصول مختلف ہیں۔اردو برج بھاشا کے مقابلے میں پنجابی بالخصوص ملتانی سے مماثلت قریب رکھتی ہے۔'' ۱۵؎

شیرانی صاحب نے اردو اور پنجابی کی مشترکہ لسانی خصوصیات کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو زبان پنجاب میں پیدا ہوئی۔وہ لکھتے ہیں:

''پنجابی اور اردو اپنی صرف ونحو میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔'' ۱۶؎

پھر اس پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے مزید مثالیں پیش کرتے ہیں۔چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) مصدر کا قاعدہ دونوں زبانوں میں ایک ہے۔یعنی علامت 'نا' امر کے آخر میں اضافہ کردی جاتی ہے۔قدیم زبان میں اس کا رسم الخط دونوں زبانوں میں ''نان'' تھا۔بارہویں صدی کے اختتام کے قریب ایسے نون غنہ کو ترک کر دیا جاتا ہے اور دیگر الفاظ سے بھی خارج کر دیا جاتا ہے مثلاً سیں، کوں، ستیں وغیرہ جو بعد میں سے کو اور ستی بن جاتے ہیں۔

(۲) تذکیر وتانیث کے قواعد دونوں زبانوں میں ایک ہیں یعنی:۔
(i) اکثر ایسے الفاظ جو ''الف'' پر ختم ہوتے ہیں۔تانیث کی حالت میں ''ی'' پر ختم ہوتے ہیں۔مثلاً بکرا۔بکری، گھوڑا گھوڑی، چنگا۔چنگی، کالا۔کالی، لوٹا۔لوٹی۔
(ii) جب اسم مذکر حروف علت کے سوا حرف صحیح پر ختم ہو تو دونوں زبانوں میں تانیث کے لیے ''نی'' یا ''انی''
اضافہ کر دیتے ہیں:۔

مذکر	مونث پنجابی	مونث اردو
مغل	مغلانی	مغلانی
دیور	دیرانی	دِورانی

(iii) اگر مذکر ''ی'' پر ختم ہو تو مونث میں ''ی''، ''نون'' سے بدل جاتی ہے

مذکر	مونث پنجابی	مونث اردو
میراثی	میراثن	میراثن

73

تیل تیلن

تیلن

(۳) اسماء صفات تذکیر وتانیث اور جمع و واحد میں اپنے موصوف کی حالت کے مطابق ہوتے ہیں مثلاً

اردو: (۱)اونچا گھوڑا (۲)میرا لڑکا (۳)چھوٹی لڑکی (۴)بڑے لڑکے (۵)دوڑتے گھوڑے سے (۶)چھوٹی لڑکیاں

پنجابی: (۱)اُچّا گھوڑا (۲)میرا منڈا (۳)نکی کڑی (۴)وڈّے منڈے (۵)دوردے گھوڑےتوں (۶)نکیاں کڑیاں ''۱۷ے

اوپر دیے گئے مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شیرانی صاحب پنجاب کو اردو کا مولد مانتے ہیں۔لیکن اردو کے آغاز کے متعلق ان کا یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔اس ضمن میں رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''بعض اورلوگوں کی طرح شیرانی مرحوم نے بھی اپنی کتاب پنجاب میں اردو

میں بیاضوں کے حوالے دیئے ہیں۔شیرانی صاحب کو میں اردو تحقیق کا معلم اوّل مانتا ہوں۔ان کی تحریروں کو پڑھ کرہم لوگوں نے تحقیقی کے آداب سیکھے ہیں اوراس لحاظ سے ان کو استاد بلکہ استاذ الاستاذ کہنا چاہیے،مگر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے انھوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ پنجاب کو اردو کا مولد ثابت کرنا ہے اور پھر اس طے شدہ نقطہ نظر کے تحت انھوں نے ہر طرح کے حوالوں کو بلا تکلف قبول کرلیا۔''

۱۸ے

یوں تو مجموعی طور پر شیرانی صاحب کی دلچسپی تحقیق متن سے تھی لیکن انھوں نے متنی تنقید کے نمونے پیش کیے

ہیں۔مثلاً ڈاکٹر ہنری اسٹب (Henry Stubbe) کی اسلام کے موضوع پر ایک انگریزی کتاب تھی،اسے شیرانی صاحب نے مرتب کیا۔دوسرا کام حکیم قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ ''مجموعہ نغز'' اور تیسرا کام ''خالق باری'' کی تدوین ہے۔

شیرانی صاحب نے تحقیق وتدوین میں جو بھی کام کیا اعلیٰ درجے کا کیا۔اور ہمارے سامنے تحقیق کا ایک معیار قائم کیا جو ان سے قبل کسی اور نے نہیں کیا تھا۔اُن کی تحقیقی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے عبدالقیوم لکھتے ہیں:

''شیرانی صاحب سے پہلے ہماری ادبی تحقیق ابتدائی مرحلے میں تھی۔انھوں نے اسے پایدار بنیادوں پر قائم کیا اور اس میں جدید مغربی اصولوں کا رواج دیا۔ حوالے درج کرنے میں ذمے داری،مختلف ماخذوں سے ملنے والی معلومات پر جرح،بےعیب منطقی اصول پر مبنی استدلال اور مغالطوں سے گریز،شیرانی صاحب کے تحقیقی طریقِ کار کے بنیادی اصول ہیں۔انھوں نے ہمارے تحقیقی معیار کو بلند کرنے کے لیے اصلاحی تحقیق سے بڑا کام لیا۔ اس اعتبار سے ان کی ''تنقید شعرالعجم'' اور ''تنقید آبِ حیات'' مثالی حیثیت رکھتی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ شیرانی صاحب نے اپنی خدمات سے ہمارے علمی اور تحقیقی معیار کو پستی سے اٹھا کر بلندیوں سے روشناس کیا ہے۔'' ۱۹ے

حواشی

ا ے رشید حسن خان، تدوین۔تحقیق، روایت، ص ۱۹۲، ایس۔اے پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۹۹ء

۲ ے حفظ اللسان معروف بہ خالق باری،مصنفہ ضیاء الدین خسرو ،۱۰۳۱ھ،مرتبہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی، دیباچہ دوم۔ص ا،انجمن ترقی اردو(ہند)، دہلی، ۱۹۴۴ء

۳ ے محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، ص ۱۳۴، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنئو، ۱۹۹۰ء

۴ ے ایضاً ص۵۷

۵ ے حفظ اللسان معروف بہ خالق باری،مصنفہ ضیاء الدین خسرو ،۱۰۳۱ھ،مرتبہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی، ص ۵۷۔۵۸، انجمن ترقی اردو(ہند)، دہلی، ۱۹۴۴ء

۶ ے محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، ص ۱۲۳۔۱۲۴، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنئو، ۱۹۹۰ء

۷ ے محمود شیرانی، پرتھی راج راسا (مطالب تنقید وتبصرہ)، ص ا، انجمن ترقی اردو(ہند)، دہلی، ۱۹۴۳ء

۸ ے محمود شیرانی، تنقید شعرالعجم، ص ا، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۴۲ء

۹ ے علّامہ شبلی نعمانی، شعرالعجم، حصہ اوّل، ص ۵۶، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ہند

۱۰ ے ایضاً ص۱۸۵

۱۱ ے محمود شیرانی، تنقید شعرالعجم، ص ۶۶، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۴۲ء

۱۲ ے ایضاً ص۲

۱۳ ے محمد حسین آزاد، آبِ حیات، ص ۴۲، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنئو، ۱۹۹۳ء

۱۴ ے محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، ص ۲۶۔۲۷، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنئو، ۱۹۹۰ء

۱۵ ے ایضاً ص ۲۷۔۲۸

۱۶ ے ایضاً ص ۵۶

۱۷ ے ایضاً ص ۵۶۔۵۷۔۵۸۔۵۹

۱۸ ے رشید حسن خان، ادبی تحقیق۔مسائل اور تجزیہ، ص ۲۱، ایجوکیشنل بُک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۸ء

۱۹ ے عبدالقیوم (مضمون) حافظ محمود شیرانی۔ایک مطالعہ، (مشمولہ) حافظ محمود شیرانی تحقیقی مطالعے (مرتب) پروفیسر نذیر احمد ص۲۹۶، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، دسمبر ۱۹۹۱ء

74

کرناٹک میں اردو انشائیہ نگاری

یونس نداف

ریسرچ اسکالر

کوویمپو یونیورسٹی شیموگہ کرناٹک

ریاست کرناٹک، اردو ادب کے مختلف شعری ونثری صنف کی تجدید وترقی کی حامل رہی ہے۔ اردو ادب میں کرناٹک کے مختلف ادیب وشعراء کا ایک ضخیم حصہ شامل ہے۔ اردو ادب کا یہ عظیم، وسیع اور بلند درخت جس کی شاخیں پوری سرزمین پر پھیلی ہوئی ہیں اس کی آبیاری میں کرناٹک کے بے شمار ادیب وشعراء کا شمار رہا ہے۔ اگر تاریخی اعتبار سے روشنی ڈالی جائے تو بہمنی سلطنت کے دور سے ہی ریاست کرناٹک میں اردو ادب کی خدمات کا آغاز ہوااور ریاست کے ہر دور کے سلاطین نے اردو ادب کی ترویج وترقی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ان سلاطین کے دور میں اردو ادب کی شعری ونثری اصناف کو فروغ ملا اور بہت ساری اصناف متعارف کروائی گئیں اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا ہے۔ ملک ہندوستان کی دیگر ریاستوں کی طرح ریاست کرناٹک پر بھی غیر ملکیوں کا تسلط رہا ہے جسکا اثر ملک کی مختلف زبانوں اور ادب پر ہوا۔

لیکن میرا خیال ہے کہ اردو ادب اور اسکی ترقی کبھی متاثر نہیں ہوئی۔ آئے دن اردو ادب میں نت نئے شعری ونثری اصناف متاثر ہوتی رہیں اور کئی اصناف دیگر زبانوں کے ادب سے مشتق ہوئیں۔ جس کے نتیجے میں کئی نثری اصناف بھی اردو میں متعارف کروائی گئیں جن میں ایک انشائیہ بھی ہے اردو کے نثری سرمایہ میں افسانوی اور غیر افسانوی دونوں قسم کی نثر شامل ہیں۔ اردو نثر کو فروغ دینے میں ان دونوں قسم کی نثر کی اپنی اہمیت ہے انشائیہ کا شمار غیر افسانوی نثری صنف میں ہوتا ہے

اس غیر افسانوی صنف انشائیہ کی بنیاد اردو ادب میں ہندوستان کی آزادی سے کئی سال پہلے ہی ڈالی گئی۔ ریاست کرناٹک (دکن) میں تو ملا وجہی کی کتاب "سب رس" سے ہی انشائیہ کی بنیاد پڑی اور اس کے بعد بہت سارے ادیب بھی اس صنف ادب میں طبع آزمائی کرتے رہے اور دھیرے دھیرے صنف انشائیہ کا ذخیرہ بڑھتا گیا۔ اور آزادی کے بعد اس صنف کو مستحکم بنانے میں ریاست کے انشائیہ نگاروں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

اردو ادب میں لفظ انشائیہ انگریزی لفظ ESSAY کے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔ بعد میں اس لفظ کو اردو والوں نے متعدد معنوں میں استعمال کیا اور ہر قسم کے ادب پاروں مثلاً: علمی، تنقیدی، سوانحی، رسمی یا غیر رسمی وغیرہ کیلئے لفظ "مضمون" کا استعمال کیا جانے لگا۔ انگریزی لفظ کی طرح اردو لفظ "مضمون" وسعت اور جامعیت کے اعتبار سے ہر طرح کے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹنے لگا۔ مضمون میں طنزیہ اور مزاحیہ ادب پارے بھی جگہ پانے لگے۔ علمی مقالوں، مذہبی اور سوانحی مقالوں، شخصیات کے خاکوں، مراسلوں اور جلسوں کی رپورتاژ، روزنامچوں اور اداریوں کو مجموعی طور پر مضمون ہی کہا جاتا تھا۔ لیکن یہ حالت زیادہ تر قائم نہ رہی جوں ہی اردو زبان میں وسعت آگئی اور اسمیں مختلف ناموں کے تحت نئی اصناف نے جنم لینا شروع کیا اور بعض اصناف مغربی ادب کے زیر اثر اس میں پنپنے لگیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ اردو ادب میں بعض ایسے ادب پارے تخلیق کیے جانیلگے جو غیر رسمی انداز بیان اور ایک منفرد اسلوب کی بنیاد پر مراسلوں، مقالوں، سوانحی مضامین، اداریہ، خاکہ، روزنامچہ وغیرہ سے بالکل مختلف نوعیت کے حامل تھے اس نوعیت کے مضامین کو لائٹ ایسے، انشاءلطیف، لطیف پارہ، مضمون لطیف وغیرہ کا نام دیا جانے لگا۔

بعد میں لائٹ ایسے یا انشاءلطیف جیسے مضامین کو ہی انشائیہ کا نام ملا۔ اور اردو ادب میں انشائیہ ایک تناور درخت کی صورت میں ابھر کر پروان چڑھنے لگا۔ دیگر اصناف کی طرح انشائیہ کو بھی ایک صنف کی حیثیت سے تسلیم کیا جانے لگا۔ انشائیہ ترقی کے مختلف مدارج طے کرتے کرتے اپنی تکنیک اور اسلوب کے اعتبار سے نثری ادب میں ایک الگ صنف کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا۔

انشائیہ ادب کی وہ لطیف صنف ہے جو دلچسپی اور توجہ سے پڑھی جاتی ہے یہ موجودہ زمانے کی مقبول ترین صنف مانی گئی ہے جس کی بے ترتیبی میں بھی ایک ربط ہوتا ہے جس میں بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے یعنی یہ دعویٰ درست ہے کہ حکمت سے حماقت تک اور حماقت سے حکمت تک کی ساری منزلیں انشائیہ میں موجود ہوتی ہیں۔ انشائیے میں عموماً انشائیہ نگار بے تکلفانہ اور بے ساختگی سے ذاتی مشاہدے بیان کرتا ہے۔ اس میں اس کی شخصیت بھی جڑی ہوتی ہے۔ لیکن خاتمے کے سلسلے میں انشائیہ تھوڑا الگ ہوتا ہے۔ اس میں کسی نتیجے کو قاری پر تھوپنے کی بجائے اسے قاری کے فیصلے پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

75

بقول مشتاق قمر:

"انشائیہ نگاری داخلی ابال کا خارجی اظہار ہے اور بے جا مقصدیت کے بوجھ سے آزاد ہے"-مشتاق قمر

انشائیہ کی تحریر ہر شعبے اور زندگی کے ہر موڑ سے تعلق رکھتی ہے۔اسے کوئی روک ٹوک نہیں ہے وہ مکمل طور پر آزاد ہے

انشائیہ نگاری کے آغاز وارتقاء کے متعلق تاریخی اعتبار سے مختلف تصانیف میں یہ تحریر کیا گیا ہے کہ :

یوں تو اردو میں انشائیے کی عمر سوا سال سے بھی زیادہ ہےلیکن بحیثیت ایک منفرد نثری صنف اردو انشائیے اپنے تمام فنی محاسن کے ساتھ بیسویں صدی کے شروع دہائیوں میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔لیکن یہ بات بھی اظہر من شمس ہے کہ سب رس جسے اردو نثر کی اولین کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے اس میں انشائیہ کے اکثر خصوصیات پائی جاتی ہیں ملا وجہی جن کا تعلق 'دکن' حالیہ ریاست کرناٹک جس کا ایک جز تھی اس لحاظ سے ریاست کرناٹک میں انشائیہ نگاری کے نقوش "سب رس" سے ہی ملتے ہیں اور یہ بھی کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو ادب میں انشائیہ کا آغاز ہی (دکن) ریاست کرناٹک سے ہی ہوا ہے۔ڈاکٹر ہاجرہ بانو اپنے مقالہ 'اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے انشائیہ نگار' میں تحریر کرتی ہیں کہ: "جتنی ترقی انشائیہ نے مغرب میں کی اتنی ہی ترقی مغرب میں کی ہے۔"دکن کا بیکن "جی ہاں میں نے ملا وجہی کیلئے یہی نام تجویز کیا ہے جس نے "سب رس" کی صورت میں ہمیں انشائیہ جیسی تصنیف سے روشناس کرایا"۔

اکثر لوگوں کا خیال یہ بھی رہا ہے کہ سب رس میں انشائیہ کے عناصر نہیں ملتے۔

اس کے متعلق وہ جاوید وششٹ کے راء کو درج کرتی ہیں جو یہ ہے :

"ہمارے نقادوں کی آتش دل اتنی بلند نہ تھیں ورنہ انہیں سب رس کے قصہ میں پوشیدہ اردو انشائیہ کا شعلہ ضرور نظر آتا جو برق خرمن صد کوہ طور سے کم نہ تھا"

بحرحال ریاست میں اردو انشائیہ کے نقوش سولہویں صدی سے ہی ملتے ہیں اور یہ صنف مختلف انداز میں اور پیرایہ میں آگے بڑھتی رہی اور آزادی کے بعد مستحکم اور مکمل انشائیہ کی صورت میں ابھر آئی۔اور آزادی کے بعد کی دہائیوں میں ریاست کرناٹک میں اس صنف کو مخصوصی طور پر 1960 کے بعد کی دہائیوں میں فروغ ملا۔اور آج بھی طرقی کے مدارج طے کر رہا ہے۔ ریاست کرناٹک میں بے شمار ادیب ہیں جنہوں نے صنف انشائیہ میں طبع آزمائی کی جن میں ملا وجہی سے لیکر دور جدید کے انشائیہ نگار شامل ہیں جن میں اہم مجتبیٰ حسین، عبدالرحمن خان، احمد نثار، نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم رؤف خوشتر، شائستہ یوسف، خلیل مامون وغیرہ اہم ہیں۔ان کے علاوہ بھی بہت سارے انشائیہ نگار ہیں۔جنہوں نے ریاست میں انشائیہ کے ذخیرہ میں اپنا سرمایہ لگایا ہے۔

Dr. YUNUS NADAF
Research Scholar Dept. of PG Studies and Research in Urdu.
Kuvempu University, Sahyadri College Compus, Shivamogga. 577202
Mob:. 9742282928
E-Mail. nadafyunudo@gmail.com

اردو فقط اردو نہیں تہذیب ہے میری

شاہین بی
ریسرچ اسکالر، ایم جے پی، روہیل کھنڈ یونیورسٹی، بریلی

اردو ہندوستان کی پیدا شدہ زبانوں میں سے ایک زبان ہے جو ہندوستان میں ہی پلی بڑھی اور یہیں کے مختلف صوبوں میں دفتری و سرکاری زبان بنی، جیسے جموں و کشمیر، اور پاکستان کی سرکاری زبان بھی یہی اردو زبان ہے کہ 1947ء سے قبل پاکستان بھی ہندوستان میں شامل تھا، اور آج اردو زبان کی ترقی کا عالم یہ ہے ہندوستان کی سب سے زیادہ مقبول ترین زبان بن گئی ہے، تاریخی اعتبار سے بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اردو زبان بہت سے مراحل و منازل سے گزر کر آج ہمارے ہاتھوں میں ہے اور پوری دنیا میں دھوم مچائے ہوئے ہے جس کی منظر کشی داغ دہلوی نے اس طرح کی ہے کہ:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اسی ضمن میں مختصر ذکر کیا جائے تو بجا ہوگا کہ ہندوستان میں اردو کا بیج ایک ہزار عیسوی کے بعد پڑا جب کہ اردو کا باقاعدہ آغاز بارہویں صدی کے اواخر میں ہوا اسی وجہ سے 1200ء سے لیکر 1400ء تک کے دور کو اردو زبان کے پہلے دور کے نام سے یاد کیا گیا اور 1200ء سے لیکر 1700ء تک اردو زبان اپنے ارتقائی منازل طے کر کے قدیم اردو کے نام سے منسوب ہوئی اور پھر 1700ء سے لیکر 1857ء تک اردو کا دوسرا دور شروع ہوا۔ جس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا 1700ء سے لیکر 1800ء تک کا زمانہ اردو کے دوسرے دور کا پہلا دور ہے۔

1800ء سے لیکر 1857ء تک کا عہد اردو کے دوسرے دور کا دوسرا عہد ہے جس کو ابتدائی زمانے میں ہندی اور ہندوی کہا جاتا تھا جہاں امیر خسرو پہلے شاعر کے طور پر نظر آتے ہیں۔

پروفیسر شمس الرحمن فاروقی اپنی کتاب ''اردو کا ابتدائی زمانہ'' میں لکھتے ہیں کہ:
''جس زبان کو آج ہم اردو کہتے ہیں، پرانے زمانے میں اسی زبان کو ''ہندوی''، ''ہندی''، ''دہلوی''، ''گجری''، ''دکنی''، اور پھر ریختہ کہا گیا ہے۔ اور یہ نام تقریباً اسی ترتیب سے استعمال میں آئے جس ترتیب سے میں نے انہیں درج کیا ہے''۔ ص ۱۲

اس درمیان کچھ اختلاف کے ساتھ 1832 یا 1837 میں ہندوستان میں بھی اردو سرکاری زبان بنی، زمانے کی لاکھ گردش کا شکار ہونے کے باوجود آج تک ہندوستانیوں کے دلوں میں ایسی رسی بسی ہوئی ہے کہ جیسے ان کی سرشت میں شامل ہو گئی ہو کہ جب کوئی اردو زبان بولتا ہوا نظر آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا کہ:

کانوں میں رس گھول رہا ہے
یعنی کوئی اردو بول رہا ہے

اردو شیریں زبان ہے کہ اردو زبان میں گفتگو کرنا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لبوں سے پھول جھڑ رہے ہیں مشکل سے مشکل خیالات دقیق اور پیچیدہ مسائل اور بڑی سے بڑی بات کو بہت خوبصورت اور کم لفظوں میں پیش کرنے کی جو صلاحیت اردو زبان میں ہے وہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں۔

اسی بات کو ایڈورڈ ٹیری (Edward Terry) نے اپنی کتاب A Voyage to east India (لندن، 1655) میں لکھا ہے کہ:
"اندوستان بڑی جاندار زبان ہے اور یہ کم سے کم لفظوں میں بہت کچھ کہہ ڈالنے پر قادر ہے'۔
(بحوالہ اردو کا ابتدائی زمانہ (۱۹۹۹) از شمس الرحمن فاروقی، ص ۱۲)

یہاں احمد وصی کا شعر نقل کرنا مناسب ہوگا کہ:

وہ کرے بات تو ہر لفظ سے خوشبو آئے
ایسی بولی وہی بولے جسے اردو آئے

شمال مشرق ہو یا شمال مغرب اردو زبان کی دھوم ہر جگہ مچی ہے اردو نے بادشاہ سے لیکر عام انسان تک ہر جگہ ہر کسی کی رہبری اور رہنمائی کی ہے جب کبھی کسی دوسری مشکل زبان کو سمجھنے میں پریشانی ہوتی ہے اس وقت بھی اردو زبان کے سادہ و سلیس لفظ ہماری زبان پر آ کر ہماری رہنمائی کرتے ہیں ہمارے جذبات و خیالات کو دوسروں تک اور دوسروں کے جذبات و خیالات آسان اور عمدہ انداز میں ہم تک پہنچانے میں مدد کرتے ہیں اردو زبان کی مٹھاس اور شیرینی، جاذبیت اور ٹھہراؤ اردو زبان کے یہ وہ اوصاف ہیں جو دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتے نیز یہ کہ ایسی شائستہ و شستہ زبان ہے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ:

لاکھوں ہی زبانیں ہیں دنیا میں مگر
جس پہ مرتی ہے فصاحت وہ زباں ہے اردو

اردو جدید ہندوستانی زبان ہے اور یہ کسی علاقے کی نہیں بلکہ ہماری مشترکہ تہذیب کی ایک علامت ہے جس کی جڑیں قائم کرنے میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی محنتیں شامل ہیں، اس کی مقبولیت اور اہمیت کا بین ثبوت یہ ہے کہ آئین ہند کی 22 زبانوں میں اردو زبان بھی شامل ہے۔

ہر تہذیب و تمدن کے منفرد عناصر ہوتے ہیں اور ان کی اپنی الگ الگ

77

شناخت ہیں لیکن اردو واحد ایسی زبان ہے کہ اس کے اپنے ضابطے اور قاعدے ہونے کے ساتھ ساتھ اس پر ہر مذہب کے اثرات نظر آتے ہیں اور ایسی لچیلی بھی ہے کہ ہر زبان کے الفاظ کو اپنے اندر سمو لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اردو اپنے تلفظ کے اعتبار سے بہت دلکش واقع ہوئی ہے لیکن یہ دلکشی اسی وقت تک باقی رہتی ہے کہ اردو کو اس کے صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کیا جائے، تلفظ کسی بھی زبان کی روح ہے اور ر بدن سے روح نکل جائے تو جسم مردہ ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ اردو زبان کا ہے کہ اگر درست ادائیگی کا خیال نہ رکھا جائے تو اردو بے جان ہو جائے گی اردو زبان دوسرے لفظوں میں تہذیب ہے کلچر ہے اور کلچر کی بقا اور اس کا تحفظ تبھی ممکن ہے کہ اس پر عمل پیرا ہوا جائے۔

بعض مقامات پر دیکھا گیا ہے کہ اردو داں حضرات اردو زبان کے فروغ اور اس کے رسم الخط کے بقا اور اس کے تحفظ کی بات کرتے نظر آتے ہیں اور گفتگو کے دوران انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال کر کے اس کی روح کو مجروح کر رہے ہوتے ہیں، ہر چیز کا موقع و محل ہوتا ہے عربی کا مقولہ ہے کہ ''وضع الشی غیر محلہ ظلم'' (یعنی چیز کو غیر محل میں رکھنا ظلم ہے) جہاں اردو کے فروغ اور اس کے رسم الخط کے بقا کا ذکر ہو وہاں انگریزی زبان کا استعمال کرنا اردو زبان کے ساتھ ظلم ہے۔ جہاں اردو کے تحفظ و بقا کی بات ہو یا اردو زبان میں خطاب دینے کا معاملہ ہو تو ایسی صورتوں میں اردو الفاظ ہی کا استعمال کیا جانا چاہئے کہ اس کا فروغ اسی ڈھنگ اور طور طریقہ میں ہے۔

عصر حاضر میں اردو زبان کے ساتھ ایک بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ نئی نسل اردو زبان کی اہمیت سے نابلد ہے اور انگریزی زبان کو اپنے اوپر مسلط کی ہوئی ہے جب کہ بچوں کے والدین کو چاہئے کہ جہاں وہ اپنے بچوں کو عصری تعلیم سکھائیں وہیں اردو تعلیم سے بھی شناسائی حاصل کرائیں تاکہ نئی نسل عصری تعلیم کے ساتھ اپنی مذہبی تعلیم سے بھی جڑی رہے ایک پروگرام میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی صاحب نے اپنا خیال پیش کیا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ زندگی میں ایک زمانے تک پہنچتے پہنچتے عربی کے بعد اسلامیات و دینیات کا بہت بڑا ذخیرہ اردو زبان میں ہی موجود ہے نیز یہ کہ نسل نو اگر اردو زبان سے کٹ جاتی ہے تو وہ تہذیبی و دینی اور ملی سرمائے سے بھی کٹ جاتی ہے۔

اردو نہ صرف ایک زبان ہے بلکہ ہماری تہذیب کی آئینہ دار بھی ہے جس میں ہماری زندگی کی دینی محفلیں اور نشست و برخاست کے داب و آداب، ہمارا رہن سہن، طور طریقے، دوستانہ مراسم، زیبائش، آرائش و آسائش، گفتگو کا لب و لہجہ محبتیں نزاکتیں رفاقتیں قرابتیں شرافتیں حاصل کلام یہ کہ من جملہ یہ باتیں ایک تہذیب سے عبارت ہیں جن کو محبت میں اردو کہا جاتا ہے اردو ایک ایسی زبان ہے جو دیگر قوموں کے لوگوں کے درمیان رشتہ قائم کرتی ہے انہیں جینا کا بہترین سلیقہ سکھاتی ہے۔

شاہجہاں آباد ہو یا دکن یا دبستان دہلی دبستان لکھنو یا پھر دبستان رامپور کی بات ہو اردو زبان نے ہر جگہ اپنی روشنی بکھیری ہے ہر دبستان کے شاعر ہو یا ادیب سب نے الگ الگ انداز میں اردو کی تہذیب کو بیان کیا ہے۔

اردو ادب میں میرامن نے اپنا بڑا کارنامہ داستان باغ و بہار سادہ سلیس زبان میں لکھکر عوام تک پہچایا، جو لوگ اردو کو مشکل ترین سمجھتے تھے میرامن نے باغ و بہار کے ذریعے انکے لئے اُردو کو آسان بنا دیا۔

جس طرح اردو نے ہماری پرورش کی ہمارا بھی حق بنتا ہے اردو کے ساتھ انصاف کریں اور اس کے ساتھ انصاف یہ ہے کہ جملے ادا کرتے وقت خاص خیال رکھیں جو جملہ جیسا ہو اسے ویسے ہی ادا کریں اردو کا حسن اسی میں ہے اور اردو کے حسن ہی میں تہذیب ہے۔

بات کرنے کا حسین طور طریقہ سیکھا
ہم نے اردو کے بہانے سے سلیقہ سیکھا

Shaheen Bi
Research Scholor
Supervisor:Pro Jahangir Ahmad Khan
Govt. Raza P.G College Rampur-244901
Affiliated MJPRU Bareilly U.P
Email id: shaheenbi0099@gmail.com
Mob: 6395489858

78

سالک لکھنوی کی طنز و مزاح نگاری

تمنا نسیم
8820414403

اگر بنگال میں طنز و مزاح کی ترویج کا سہرا کسی کے سر بندھا سکتا ہے تو وہ سالک لکھنوی ہیں۔ 1982ء میں شائع ہونے والی کتاب "بے سروپا" میں سالک لکھنوی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہیں جیسے "تیتا مرچ"، "نور جہاں بنانے کا نسخہ"، "ایک تولہ خالص گھی"، "اگر پٹنے کا جی چاہیے"، "میں شاعر کیسے بنا"، "غالب اور میں" وغیرہ۔

تیتا مرچ اس مجموعے کا پہلا مضمون ہے جس پر انشائیے کا رنگ غالب ہے۔ ایک پیراگراف جس نکتے یا لفظ پر ختم ہوتا ہے، دوسرا اس مناسبت سے شروع ہوتا ہے۔ ایک بات سے دوسری بات نکلتی ہے اور آگے بڑھتی جاتی ہے۔

مصنف کے الفاظ:

"دیکھیے منھ سے پھر ایک غلط جملہ نکل گیا یعنی غریب قوم! بیوی سے چھپا کے ایک تیتا مرچ کھالی تھی نا، یہ اسی کا اثر ہے کہ زبان قابو میں نہیں کیونکہ اب غریبی کہاں؟ ڈھونڈیے بھی تو دور دور نہیں ملتی۔ گزشتہ پانچ برسوں میں محترمہ "غریبی ہٹاؤ" نے وہ چنگیزی حملے کیے ہیں کہ کشمیر سے راس کماری تک کسی شہر کی کسی سڑک پر کوئی غریب باقی نہیں رہا۔ جھگیوں میں رہنے والے سب کے سب اشوک ہوٹل میں جا بسے۔"

مزاح یوں تو زندگی کی ناہمواریوں اور بوالعجبیوں پر ہسنے ہنسانے کا نام ہے مگر جب ناہمواریاں انسان کو تختۂ مشق بنانے لگیں تو ردعمل میں ہنسی نہیں آتی بلکہ طنز جذباتی تسکین کا سامان بن جاتا ہے۔

انشائیہ کی زبان یوں بھی خوبصورت ہوا کرتی ہے مگر سالک لکھنوی کے قلم سے نکل کر یہ زبان دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ بھرپور طنز اور رچے ہوئے مزاح کے سبب ان کے اسلوب کی انفرادیت جملوں میں کشش پیدا کر دیتی ہے۔ ایسی دو مثالیں ان کے دوسرے مضامین "نور جہاں بنانے کا نسخہ" سے بھی ملاحظہ ہوں:-

"بچوں کی پڑھائی بند تو مارا صاحب کو تکلیف دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انھوں نے پرائیوٹ پڑھا کر امتحان دلوا بھی دیا تو کیا ہوگا؟ کسی امتحان کا نتیجہ تین چار سال سے پہلے نکلتا ہی نہیں، فیل ہو گئے تو مزید تین چار سال کی چھٹی ہو گئی، پاس کرتے کرتے بڑھاپا آ گیا۔ پاس ہو گئے تو تعلیم یافتہ بیکاروں کی فہرست لمبی ہو گئی- یوں بھی پڑھ لکھ کر بچے ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ آگے بڑھ کر نہ وزیر بن سکتے ہیں نہ غنڈے، ماسٹر صاحب کی تنخواہ بچی دو سو!"

ان کے ایک اور طنزیہ مضمون "ایک تولہ خالص گھی" کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:-

"میں نے سوچا گولی مارو بنیے کو، کسی دوسری دکان پر چلو۔ دوسری دکان تھی حاجی برکت اللہ صاحب کی۔ دیگو گھی بکتا تھا۔ بڑا کاروبار تھا، ایک تولہ گھی مانگتے شرم بھی آتی تھی۔ لیکن حکیم صاحب کے نسخے کو کیا کرتا۔ اس لیے مرتا کیا نہ کرتا ان کی خدمت میں حاضری دی۔ دیکھ کر خوش ہوئے اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے:

"السلام علیکم! کہیے کیسے زحمت فرمائی؟"

"کوئی خاص بات نہیں حاجی صاحب!" میں نے کہا۔ "ذرا سی تکلیف دینا ہے۔" حکیم صاحب نے دوا بتائی ہے ایک تولہ خالص گھی چاہیے سونگھوں گا!"

سالک نے طنز و مزاح لکھا ہی نہیں بلکہ اس کے لیے ماحول بھی استوار کیا اور طنز برداشت کرنے پر معاشرے کو آمادہ بھی کیا ورنہ کسی حکیم کو ملک الموت کا خطاب عطا ہو! اور وہ گریباں نہ پکڑے۔

بے سروپا کے مضمون "اگر پیٹنے کا جی چاہے" سے اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"عقلمندوں کا قول ہے کہ ہر اچھا کام گھر سے شروع کرو۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ عقلمندوں کے قول بھی عقلمندوں ہی کے لیے ہوا کرتے ہیں کیونکہ اس قول کی روشنی میں میں نے بھی رشٹرا بھاشا کو گھر ہی سے شروع کیا۔"

منھ دھونے کے بعد بیوی سے کہا:

"لاؤ کلار گڑ-! کلار گڑ-!؟" بیوی نے چار گلوکاری کا بیک وقت منھ کھول دیا۔ کیا مانگ رہے ہو تم؟ ارے پہلے منھ تو پوچھو- تمام پانی ٹپک رہا ہے۔"

"وہی تو مانگ رہا ہوں کلار گڑ منھ پوچھنے کے لیے۔"

"وہ کیا ٹنگا ہے تولیہ۔" بیوی بولی۔ "یہ کلار گڑ کیا کہہ رہے ہو؟"

"تولیہ ختم ہو گیا بیوی۔" میں نے سمجھایا۔ "اب تولیے کا نام کلار گڑ ہے۔ یہ راشٹر بھاشا ہے۔ اب ہمیں راشٹر بھاشا میں بات کرنا ہے!"

اب دوسرا پیراگراف ملاحظہ فرمائیں:-

بیوی میکے چلی گئی۔ اکنی دوانی چونی قسم کے بچوں کو ساتھ لیتی گئی۔

"یہ بھی اچھا ہوا جب دیکھو یہ شیطان کے بچے یا بستر پر قلابازیاں کھا رہے ہیں یا دودھ کے لیے بھٹک رہے ہیں یا ربر کے غبارے پھیلا رہے ہیں اور اگر غبارہ کسی چور بازاری کرنے والے کی توند کی طرح پھول کر پھٹ گیا تو رو رہے ہیں۔"

انسان حیوانِ ناطق ہی نہیں حیوانِ ظریف بھی ہے۔ یہ ظرافت انسانی شخصیت کی تکمیل میں وہی رول ادا کرتی ہے جو عناصر اور مادہ کی تکمیل میں انٹی پارٹیکل کا ہے۔ یعنی شخصیت اور اس کے وسیلے سے پیدا ہونے

79

والی تخلیقات علم و ہنر کے اعتبار کا درجہ نہیں کرتیں جب تک کے غیر مرئی طور سے اس کے اندر کردار و عمل کا وہ رخ موجود نہ ہو جسے ظرافت کہتے ہیں۔

سالک کے "بے سروپا" کے مضامین کی دو مثالیں دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی:-

"مجھے خود ایک ایسے استاد کی ضرورت تھی جن کے شاگردوں میں مجھ جیسوں کی ایک بڑی تعداد ہوتا کہ جب کسی مشاعرے میں اپنا کلامِ بلاغت نظام پیش کروں تو میرے استاد بھائی واہ-واہ کے شور سے آسمان سر پر اٹھالیں۔ آخر ایک دن میری یہ تمنا پوری ہوگئی اور حضرت اسفل سافیلنی کے دربار گرم آثار تک رسائی ہوگئی۔ انھوں نے پانچ روپیہ نقد اور ایک ڈبیہ سگریٹ پر مجھے اپنے حلقۂ تلامذہ شامل کرلیا۔ جس میں سیکڑوں کے ساتھ جناب ٹیس، جناب تپک، جناب چوٹ اور شری شمشان جیسے ارشد تلامذہ شامل تھے۔"

اس مضمون کا اور ایک پیراگراف:-

"ایک دن دمڑی کے چائے خانے میں چائے کی چسکیاں لیتا ہوا مصرعے پر مصرعہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ ایک شاعر غرا قسم کے شخص چائے خانے میں آدھمکے۔ ان کے ساتھ بڈھن قوال بھی تھے۔ میں انھیں دیکھ کر تعظیماً کھڑا ہوگیا۔ وہ شفقت سے پیش آئے۔ خیریت دریافت کی۔ شاعری کا حال چال پوچھا۔ ایک دردمند کو پاکر میں نے دلی کیفیت کا اظہار کردیا۔ انھوں نے نیک مشورہ دیا کہ میاں! اگر شہرت چاہتے ہو تو کسی قوال کی جوتیاں سیدھی کرو یا خود قوال بن جاؤ۔ یہ بات میرے دل میں اتر گئی۔

اپنے گلے کی افتاد کو دیکھتے ہوئے خود قوال بننا ذرا مشکل امر معلوم ہوا، جوتیاں سیدھی کرنا آسان تھا۔"

سالک لکھنوی کی تحریریں عام طور سے purposeful ہوتی ہیں اور ان کا نقطۂ نظر اصلاحی ہوتا ہے۔ وہ بہت زیادہ Factual نہیں ہوتے نہ ہی زیادہ تلخ گوئی کو راہ دیتے ہیں البتہ سیاسی موضوعات پر لکھتے ہوئے کبھی کبھی غیر معمولی سفاکی سے کام لیتے ہیں۔

"بے سروپا" میں ایسے نمونے جابجا نظر آتے ہیں، پڑھیے اور مزے لیجیے بلکہ مزے لے لے کر پڑھیے لیکن بات پھر وہیں اٹکتی ہوئی نظر آتی ہے جہاں فنکار وابستگی کی شدت میں کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

"یہ تصویر کس کی ہے" کے چند نمونے دیکھیے:-

"اور میں ذرا دیر تک سوچتا رہا، کمبخت داڑھی بھی ملنا تھی تو فرنچ کٹ! کوئی اور کٹ نہ سوجھی نالائق کیمرے کو۔ خود اپنے ہندوستان میں سینکڑوں قسم کی کٹ ہیں، ان ہی میں سے کوئی ایک مل جاتی اور پھر کسی خاص کٹ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ عظیم شخصیتیں تو ہمیشہ بے کٹ داڑھیوں کی مالک رہی ہیں۔ مارکس اینگلس "سرسید"، "ٹیگور"، "برناڈ"، "سریندر ناتھ بنرجی" "حلیم شرر" خدا کی قسم کیا داڑھیاں لائے تھے یہ لوگ۔ میں ان لوگوں سے بھی گیا گزرا ٹھہرا۔"

سالک لکھنوی نے اپنے مضامین میں نہ صرف واقعاتی مزاج کے نمونے پیش کیے ہیں بلکہ مضامین باضابطہ افسانوی رنگ میں لکھے ہیں۔ قدرت نے انھیں اتنی ذہین جذباتی آسودگی اور علمی و معاشی فراغت دی تھی کہ زندگی کا منفی پہلو ان کی زندگی سے اوجھل رہے۔ یہی وجوہات ہیں کہ ان کے مضامین فکاہیہ اور ہزلیہ ہیں، مسخرہ پن، خشونت، بیزاری اور طنز بیجا جیسے منفی عناصر کا ان کے یہاں فقدان ہے۔ ان کی فکاہیات و مضحکات کا مقصد صرف اتنا ہے کہ دورِ حاضر کے انسان کے دکھوں کا مداوا ہوسکے۔

"میرا ایک روپیہ" سے اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"ایک ایک کر کے پورے چالیس ہفتے گزر گئے لیکن میرا گیا ہوا روپیہ قصور نادم پوری کی جیب سے برآمد نہیں ہوا کیونکہ اس عرصہ میں وہ خود بھی میرے سامنے کہیں برآمد نہیں ہوئے۔ میں نے سوچا کیوں نہ ان کے درِ دولت پر حاضری دی جائے۔ بڑے شاعر ہیں ایک روپیہ یاد نہ آرہا ہوگا۔ ممکن ہے مجھے دیکھ کر انھیں اس غریب کی یاد آجائے اور مجھے اپنے بچھڑے ہوئے ایک روپیہ سے ملنے کا موقعہ مل جائے چنانچہ درِ دولت پر حاضر ہوا، آواز دی، ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر ایک کمسن صاحبزادی نکلیں اور بولیں:-

"کے کے کھوجو ہو جی؟"

کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی یہ زبان سن کر بوکھلا گیا۔

پوچھا "نادم قصور پوری، میرا مطلب یہ کہ قصور نادم پوری صاحب ہیں؟"

اس پوچھ پچھ نے محلے کے کچھ لوگوں کو ہوشیار کردیا۔

وہ سمجھے کہ خفیہ پولس کا کوئی آدمی ایک کمسن لڑکی سے کچھ اگلوانے کی کوشش کررہا ہے۔ ایک باعزم نوجوان نے آگے بڑھ کر مجھ سے سوال کیا "کس کو مانگتے ہیں آپ؟"

ان کی ایک مضمون "بیاض کی گمشدگی" ہے۔

یہ مضمون نہایت شریف اور سالکانہ مزاحیہ ہے لیکن اس معصوم اور بےضرر سے مضمون میں بھی انقلاب زندہ باد کے نعرے ہیں۔ ایک اقتباس دیکھیں۔

"دیکھیے حضرت! آپ کی نظمیں عموماً انقلابی ذات کی ہوا کرتی تھیں۔ یہ ایمرجنسی کا شار ہے۔ اگر آپ نے ان نظموں کو گولی نہیں ماری تو خود آپ کو ایک دن گولی ماردی جائے گی۔"

سالک لکھنوی کے مضامین کو پڑھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی ظرافت زبان و بیان کی ادبیات کے باوجود مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی طنز و مزاح نگاری کسی خاص مقصد و پیغام کے جذبے سے نہیں لکھی گئی بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ان کی تحریر میں طنز کے پہلو نہایت خفیف اور بےضرر ہیں۔

مضمون "قربانی کا بکرا" میں مصنف "قربانی کا بکرا" ڈھونڈتے ہوئے نظر آتا ہے۔

"میں خوش خوش گھر پہنچا اور بیوی کو پکارا۔ "بھاگوان! ہوگیا بکرے کا انتظام۔ آرہا ہے قصائی سمیت عید کی صبح کو!"

"یہ بکرا ہے؟" میں نے پھر پوچھا کیونکہ جو شکل میرے سامنے کھڑی ممیا رہی تھی، وہ بجز داڑھی کے کہیں سے بھی بکرا نہیں معلوم ہورہی تھی۔ یہ

معلوم ہوتا تھا جیسے مرگھٹ کے کتے کے منھ پر گوند سے دو چار بال چپکا کر اسے بکرے کی شکل دینے کی کوشش کی گئی ہو۔

مارے غصے کے میں کانپنے لگا۔ "میں ذبح کروں گا" میں چیخا۔ "ایسے دو سو بکرے اور ہوں تو انھیں بھی لے آؤ، کر ڈالوں گا سب کو ذبح۔ ایسے بکروں کا ذبح ہو جانا ہی بہتر!"

مضمون "اتحاد المسلمین اینڈ کمپنی (انڈیا) لمیٹیڈ" سے چند جملے ملاحظہ کریں:-

"چپ رہیے سالک صاحب! دینی معاملات میں ہر وقت انگریزی نہیں بولی جاسکتی!" مولانا نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں سہم گیا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آئندہ جمعہ کو بعد نماز ایک دعوت کی جائے جس میں ملت کی متعدد ہستیوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی جائے اور بعد کو لڈو!"

"میرے ذہن میں ہے۔ بالکل ذہن میں ہے۔" مولانا نے کہا۔ "تعلیماتِ اسلامی سے ناواقف ٹٹ پونجیے بکتی ہر شب برات کو شہر کے قبرستانوں میں سستے داموں فاتحہ پڑھ ڈالتے ہیں۔ ہمیں فاتحہ کے نرخ مقرر کرنا ہوں گے۔ جیسی فاتحہ ویسے دام۔ بن داموں فاتحہ نہیں پڑھی جاسکتی۔"

مضمون "چچا غالب مل گئے" کا یہ اقتباس دیکھیے۔

"چچا غالب ملے تو موصوف نے حال کا شعری منظر نامہ ان کے سامنے پیش کر دیا۔

اچھا سنیے اب میں اپنا مطلع عرض خدمت کرتا ہوں۔
چھنک چھن چھن چھنک چھن چھن چھنک چھن چھن مری بلی!
چھکا چھک چھوں چھکا چھکا چھوں مری گاڑی گئی دلی!"

سالک لکھنوی نے اپنی تحقیقات میں کسی مزاحیہ کردار کی تخلیق نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی سیمابی طبیعت اور سالکانہ اندازِ فکر نے انھیں کسی خاص صنفِ ادب سے جوڑ کر نہیں رکھا لیکن جہاں کہیں انھوں نے کسی کردار کی عکاسی کی ہے، طنز و مزاح کے نہایت عمدہ نقش مرتب ہوئے ہیں۔ "بے سرو پا" کے مضامین کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ طنز و مزاح کے میدان میں اگر کسی نے بنگال کی آبرو بچائی تو وہ نام سالک لکھنوی کا ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تحت تعلیم: محب وطن اور با اخلاق شہریوں کی تیاری

ڈاکٹر ترانہ یزدانی

احمد حسین

مراد آباد، اتر پردیش

یومِ آزادی کسی بھی ملک کی تاریخ میں محض ایک تاریخی دن نہیں ہوتا بلکہ یہ قومی شناخت، قربانی، اور آزادی کی قدر کو یاد رکھنے کا دن ہوتا ہے۔ ملکِ ہندوستان میں 15 اگست نہ صرف آزادی کے حصول کا دن ہے بلکہ یہ اس عزم کا اعادہ بھی ہے کہ ہم ایک تعلیم یافتہ، با اخلاق، اور متحد قوم کی تعمیر کریں گے۔ ایسے میں تعلیم کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جو نئی نسل میں حب الوطنی، قومی یکجہتی، اور اخلاقی شعور کو پروان چڑھاتی ہے۔ جب ہم اسکولوں میں یومِ آزادی مناتے ہیں تو یہ صرف پرچم کشائی، تقریریں یا گیت نہیں ہوتے، بلکہ یہ وہ لمحے ہوتے ہیں جہاں استاد بچوں کو یہ محسوس کرا سکتا ہے کہ آزادی کی قدر کیا ہے، اور ایک ذمہ دار شہری ہونے کے ناطے ہمیں کیا کردار ادا کرنا چاہیے۔ قومی تہوار تعلیم میں جذباتی وابستگی پیدا کرنے اور اقدار کی منتقلی کے بہترین مواقع فراہم کرتے ہیں، اور یہی عمل مستقبل کے محب وطن شہریوں کی بنیاد بناتا ہے۔

استاد کسی بھی قوم کی تعمیر میں بنیادی ستون کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ صرف نصاب کی منتقلی کرنے والا فرد نہیں بلکہ طلبہ کی شخصیت، سوچ، اخلاق اور اقدار کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہندوستان جیسے کثیر الثقافتی اور جمہوری ملک میں استاد کا کام نہ صرف تعلیم دینا بلکہ طلبہ میں حب الوطنی، رواداری، بھائی چارہ، آئینی شعور اور سماجی ہم آہنگی کے جذبات کو اجاگر کرنا بھی ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 اساتذہ کو "قوم ساز" کی حیثیت دیتی ہے جو محض معلومات منتقل کرنے والے نہیں بلکہ زندگی کی قدروں کے علمبردار ہوں۔ یومِ آزادی جیسے مواقع اساتذہ کے لیے بہترین مواقع ہوتے ہیں کہ وہ تاریخ، قربانیوں، اور مجاہدینِ آزادی کے کردار کو اجاگر کرتے ہوئے طلبہ کو یہ بتائیں کہ ایک ذمہ دار، باشعور، اور محب وطن شہری کیسا ہوتا ہے۔ استاد کا ہر لفظ، عمل اور رویہ طلبہ کے لیے ایک نمونہ ہوتا ہے، جو آنے والے کل کے ہندوستان کی بنیاد تیار کرتا ہے۔

یومِ آزادی کے موقع پر ہمیں تعلیم اور استاد کے کردار پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ آزادی کے حقیقی تحفظ اور تسلسل کے لیے ضروری ہے کہ ہم اساتذہ کو صرف تعلیمی مواد منتقل کرنے والا نہ سمجھیں بلکہ انہیں اقدار، کردار، اور قومی شعور کا علمبردار بنائیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 اسی نظریہ کو عملی صورت میں ڈھالنے کی کوشش ہے، جس کے ذریعے ہم ایسی نسل تیار کر سکتے ہیں جو نہ صرف علمی اعتبار سے مضبوط ہو بلکہ قومی، اخلاقی اور آئینی لحاظ سے بھی باوقار اور ذمہ دار شہری ہو۔ اساتذہ کی رہنمائی، تربیت اور خود شناسی کے ذریعے ہم ایک بہتر تعلیمی، اخلاقی اور قومی مستقبل کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 ہندوستان کی تعلیمی تاریخ کا ایک انقلابی اور

81

جامع خاکہ ہے، جو اکیسویں صدی کے تقاضوں کے مطابق تعلیم کے تمام پہلوؤں کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس پالیسی کا بنیادی مقصد ایک ایسی تعلیمی فضا قائم کرنا ہے جہاں طلبہ صرف علمی مہارتیں ہی حاصل نہ کریں بلکہ وہ قومی اقدار، اخلاقی اصولوں، اور انسانی ہمدردی سے بھی مالا مال ہوں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 اساتذہ، طلبہ، والدین اور تعلیمی منتظمین سب کے لیے ایک واضح رہنما اصول فراہم کرتی ہے، جس کے ذریعے تعلیم کو زیادہ با مقصد، ہمہ جہت، اور اقدار پر مبنی بنایا جاسکتا ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تحت اسکول کی سطح پر متعدد انقلابی تبدیلیاں متعارف کرائی جانی چاہئیں تاکہ تعلیم کو زیادہ مؤثر، با مقصد اور طلبا کے لیے با معنی بنایا جا سکے۔ ان تبدیلیوں کا مرکز طلبہ کی ہمہ جہت ترقی، لچکدار نصاب، اور عملی و تحقیقی سیکھنے کے مواقع فراہم کرنا ہے۔ سب سے نمایاں تبدیلی 5+3+3+4 کا نیا تعلیمی ڈھانچہ ہے، جو بچوں کی عمر اور نشوونما کے مراحل کو مدنظر رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعے پری پرائمری سے لے کر بارہویں جماعت تک کی تعلیم کو چار سطحوں (فاؤنڈیشنل، پریپریٹری، مڈل، اور سیکنڈری) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس تقسیم کا مقصد بچوں کو ان کی فطری صلاحیتوں کے مطابق تعلیم دینا ہے، نہ کہ رٹّے بازی پر مبنی نظام پر اصرار کرنا۔ اسی طرح، اسکول کے نصاب میں بھی بڑی تبدیلیاں متعارف ہوئیں۔ صرف نصابی کتابوں پر انحصار نہ کرتے ہوئے انفرادی و اجتماعی طور پر پروجیکٹ ورک، بحث و مباحثہ، عملی تجربات، اور مقامی علم کو سیکھنے کا حصہ بنانے کی بات کی گئی ہے۔ اس میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ بچوں کو سوال پوچھنے، سوچنے اور تحقیق کرنے کی تربیت دی جانی چاہیئے تاکہ وہ ایک فعال سیکھنے والے بن سکیں۔ اساتذہ کی تربیت، ملٹی لنگوئل تعلیم (کئی زبانوں میں تعلیم)، اور ٹیکنالوجی کے مؤثر استعمال کو بھی اسکولوں کی سطح پر فروغ دینے کی بات کی گئی ہے۔ خاص طور پر، مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دینے پر زور دے کر بچوں کے سمجھنے کے عمل کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ یہ تمام تبدیلیاں اس مقصد کے حصول کے لئے لازمی قرار دی گئی ہیں کہ اسکول نہ صرف تعلیمی ترقی کے مراکز ہوں بلکہ سماجی و اخلاقی تربیت کے بھی مراکز بنیں، جہاں پر ایک باشعور، با اخلاق اور محب وطن نسل کی تعلیم و تربیت کو یقینی بنایا جاسکے۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 طلبہ کی تعلیم کو صرف نصابی کتابوں یا امتحانات تک محدود رکھنے کے بجائے ان کی ہمہ جہت نشوونما پر زور دیتی ہے۔ ہمہ جہت نشوونما سے مراد، بچے کی ذہنی، جسمانی، جذباتی، سماجی، اخلاقی، اور تخلیقی تمام پہلوؤں پر مبنی تعلیمی و تربیتی نظام قائم کیا جائے تاکہ وہ ایک مکمل، باشعور، اور خود اعتماد انسان بن سکے۔ اس مقصد کے لیے اسکولوں میں صرف نصابی سرگرمیوں کو اہمیت نہیں دی جانی چاہیئے بلکہ ہم نصابی سرگرمیوں (کھیل، فنونِ لطیفہ، ثقافتی سرگرمیوں، اخلاقی تربیت، اور زندگی کی مہارتوں) کو بھی برابر مقام دیا جانا چاہیئے۔ ان سرگرمیوں کے ذریعے نہ صرف طلبا کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جاسکتا ہے بلکہ گروہی سرگرمی، قیادت، فیصلہ سازی، جذباتی نظم و ضبط اور سماجی ہمدردی جیسے اوصاف کے حامل بنایا جا سکتا ہے۔ اساتذہ کو اس بات کی تربیت دی جانی چاہیئے کہ وہ کلاس روم کے ماحول کو ایسا لچیلا بنائیں جہاں طلبہ آزادی سے اظہارِ خیال کرسکیں، غلطی کرنے پر شرمندہ نہ ہوں، اور سیکھنے کا عمل خوشگوار ہو۔ اساتذہ کو یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ وہ ہر بچے کے انفرادی فرق کو تسلیم کریں اور ان کی رفتار، دلچسپی اور انداز کے مطابق سیکھنے کا ماحول مہیا کریں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ہر طالب علم کو اخلاقی اقدار (جیسے ایمانداری، احترام، ہمدردی، مساوات) کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ ایک ذمے دار شہری بنے۔ یعنی تعلیم کو محض "امتحان پاس کرنے" کی مشق نہیں بلکہ زندگی گزارنے کے لیے تیار کرنے کا عمل بنایا جانا چاہیئے۔

یوں قومی تعلیمی پالیسی 2020 صرف نصاب میں تبدیلی یا تعلیمی ڈھانچے کی اصلاح تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک ہمہ گیر وژن رکھتی ہے جس کا مقصد ایک ایسی نسل تیار کرنا ہے جو علم، ہنر، اقدار اور قومی شعور سے آراستہ ہو۔ اس پالیسی کی کامیابی کا انحصار اسکولوں، اساتذہ اور والدین کی مشترکہ کوششوں پر ہے۔ بطور معلم ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس پالیسی کے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہوئے طلبہ کی شخصیت سازی کے ہر پہلو کو سنوارنے میں اپنا فعال کردار ادا کریں۔

اساتذہ کا کردار

تعلیم کے ذریعے حب الوطنی، اخلاقی شعور، اور آئینی فہم کو پروان چڑھانا ایک ایسا مقدس عمل ہے جس میں استاد کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ کمرہ جماعت کو محض تعلیمی مقام نہ مانا جائے بلکہ یہ قومی تعمیر کی نرسری ہو جہاں مستقبل کے معمار تیار ہوتے ہیں۔

تدریس کے ذریعے حب الوطنی کا فروغ: استاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ تدریس کو صرف علمی سرگرمی نہ سمجھے بلکہ اس کے ذریعے طلبہ میں حب الوطنی کے جذبات پیدا کرے۔ تعلیم کے ذریعے جب بچوں کو اپنی تاریخ، ثقافت، قومی ہیروز اور ملکی خدمات کا شعور حاصل ہوتا ہے تو ان کے دل میں اپنے وطن کے لیے محبت اور احترام کے جذبات پنپتے ہیں۔ یہ جذبہ اسکول کی سطح سے ہی بیدار کیا جانا چاہیے تاکہ ایک باشعور نسل پروان چڑھے۔

یومِ آزادی و یومِ جمہوریہ کی تقریبات: یومِ آزادی (15 اگست) اور یومِ جمہوریہ (26 جنوری) جیسے قومی تہوار اسکول کی سطح پر نہایت سنجیدگی اور جوش و جذبے سے منائے جانے چاہئیں۔ ان تقریبات کے دوران طلبہ کو ترنگا لہرانے، قومی پرچم کے احترام، مجاہدینِ آزادی کی قربانیوں، اور آئینی اقدار کی اہمیت سے روشناس کرایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک معلم 15 اگست کے موقع پر صبح کی اسمبلی میں مجاہدِ آزادی گاندھی جی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد علی جوہر، بھگت سنگھ یا مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح عمری سناتا ہے اور طلبہ سے سوال کرتا ہے کہ "کیا ہم اپنے آج کو بہتر بنا کر ان کے خوابوں کو پورا کر سکتے ہیں؟"۔ اس قسم کی سرگرمیاں طلبہ کو سوچنے اور جذباتی طور پر جڑنے پر مجبور کرتی ہیں۔

قومی ترانے، کہانیاں، اور نظمیں: اساتذہ کے ذریعے حب الوطنی پر مبنی کہانیاں، نظمیں، اور گیتوں کی تدریس طلبہ کے دلوں میں قومی فخر اور احترام پیدا کرتی ہے۔ "جن گن من" اور "سارے جہاں سے اچھا" جیسے ترانے صرف زبانی یاد کرانا کافی نہیں، ان کی معنویت سمجھانا بھی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر ایک اُردو کے استاد حب الوطنی پر مبنی نظم "ہندوستان ہمارا ہے" کی تدریس کے دوران اس نظم میں استعمال ہونے والی علامتوں (پہاڑ، دریا، چمن، فضا) کے قومی معنی پر گفتگو کرواتے ہیں، اور طلبہ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ "اگر ہمیں اپنے وطن سے محبت ہے تو ہمیں اپنے ماحول اور سماج کا خیال کیسے رکھنا چاہیئے؟"

اخلاقی تعلیم کی شمولیت: ایک استاد محض نصاب پڑھانے والا فرد نہیں بلکہ کردار سازی کا معمار ہوتا ہے۔ وہ طلبہ کو اخلاقی اقدار (جیسے دیانت، سچائی، احترام، برداشت، ہمدردی اور انصاف) نہ صرف سکھاتا ہے بلکہ اپنے رویے سے اس کا عملی مظاہرہ بھی کرتا ہے۔ ان اقدار کی تعلیم بچوں میں ایک باکردار، ذمہ دار اور قوم دوست شہری بننے کی بنیاد رکھتی ہے۔

ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

82

روزمرہ کی مثالیں: اساتذہ کلاس روم کے عام حالات میں پیش آنے والے واقعات سے اخلاقی نکات واضح کر سکتے ہیں۔مثلاً، کسی ساتھی کی مدد کرنا، اپنی باری کا انتظار کرنا، جھوٹ سے اجتناب برتنا، یا دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا بی یہ سب اخلاقی سبق بن سکتے ہیں۔مثال کے طور پر اگر کوئی طالب علم اپنی کاپی بھول جائے تو استاد باقی طلبہ سے کہہ سکتا ہے،"کیا ہم اسے نوٹس فراہم کر سکتے ہیں تا کہ وہ پیچھے نہ رہ جائے؟"۔اس طرح نہ صرف ہمدردی اور تعاون کا جذبہ پیدا ہوگا بلکہ طلبہ یہ سیکھیں گے کہ علم صرف مقابلہ نہیں بلکہ بانٹنے کی چیز ہے۔

کردار سازی پر مبنی سرگرمیاں: کردار سازی کو تقویت دینے کے لیے اسکول میں ایسے پروگرامز اور سرگرمیاں کرائی جا سکتی ہیں جو طلبہ کو عملی اخلاقیات سکھائیں، جیسے رول پلے، کہانی سنانا، گروپ ڈسکشن، اور اخلاقی معمہ (Moral Dilemmas) پر مباحثہ۔مثال کے طور پر "سچ

بولنے کا نتیجہ" کے عنوان پر ایک مختصر ڈرامہ کروایا جائے جس میں ایک طالب علم امتحان میں نقل کرنے کے بجائے خالی کاپی جمع کراتا ہے۔اختتام پر استاد بتاتا ہے کہ یہ طالب علم اپنی ایمانداری کی بدولت اگلی کلاس میں منتخب ہو جاتا ہے۔

آئینی اقدار کی تعلیم: ایک استاد کا بنیادی فرض صرف علمی مواد کی ترسیل نہیں بلکہ طلبہ کو ہندوستانی آئین کی روح سے روشناس کرانا بھی ہے، تا کہ وہ ایک باخبر، ذمہ دار، اور خودمختار شہری بن سکیں۔اسکول کے ابتدائی سطح سے ہی اگر طلبہ کو جمہوریت، برابری، رواداری، اور بھائی چارے جیسے آئینی اصولوں سے واقف کرایا جائے تو وہ نہ صرف اپنے حقوق سے آگاہ ہوں گے بلکہ دوسروں کے حقوق کا بھی احترام کریں گے۔

بنیادی فرائض وحقوق کا درس: طلبہ کو سبق آموز کہانیوں، سرگرمیوں، اور مکالماتی اسباق کے ذریعے اس بات کی تعلیم دی جا سکتی ہے کہ ہر فرد کو تعلیم، آزادی اظہار، اور مذہبی آزادی جیسے بنیادی حقوق حاصل ہیں، لیکن ان کے ساتھ بنیادی فرائض جیسے صفائی، یکجہتی، قوم سے وفاداری، اور قانون کی پاسداری بھی لازم ہیں۔مثال کے طور پر استاد یوم آئین کے موقع پر ایک سرگرمی کروا سکتا ہے جہاں ہر طالبعلم ایک بنیادی حق اور ایک فرض کا پوسٹر بنائے۔اس سے طلبہ کو آئینی توازن کا شعور حاصل ہوگا۔

جمہوریت، مساوات، اور بھائی چارہ کا شعور: استاد جماعت کے اندر چھوٹے پیمانے پر جمہوریت کے اصول نافذ کر سکتا ہے، مثلاً کلاس مانیٹر کا انتخاب ووٹنگ کے ذریعے، گروپ سرگرمیوں میں سب کی رائے لینا، اور کمزور بچوں کو آگے بڑھنے کے مواقع دینا۔مثال کے طور پر ایک استاد "ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے" کے موضوع پر مباحثہ کروا سکتا ہے، جہاں طلبہ اپنے خیالات کا اظہار کریں اور دوسروں کی رائے کو سننے کا سلیقہ سیکھیں۔اس طرح بھائی چارہ، برابری اور رواداری جیسے تصورات ذہن نشین ہوں گے۔

یوں اسکول ٹیچر کا کردار صرف تدریسی عمل تک محدود نہیں بلکہ وہ قومی تعمیر، کردار سازی اور آئینی شعور کی روشنی پھیلانے والے مشعل بردار ہوتے ہیں۔تدریس کے ذریعے حب الوطنی، اخلاقی تعلیم، اور آئینی اقدار کو فروغ دے کر استاد طلبہ کے اندر وہ صفات پیدا کرتا ہے جو ایک مضبوط، مساوی اور باوقار سماج کی تشکیل میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے اساتذہ کو جو ذمہ داریاں سونپی ہیں، ان کی ادائیگی کے لیے جذبہ، شعور، اور تخلیقی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔اگر اساتذہ سنجیدگی اور اخلاص سے ان نکات پر عمل کریں تو ایک بہتر، متحد اور باشعور ہندوستان کی تعمیر ممکن ہے۔

اکتسابی تجربات اور تدریسی حکمتِ عملیاں

محض زبانی تعلیم اور کتابی معلومات سے حب الوطنی کا جذبہ پیدا نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ اس کے ساتھ ساتھ ایسی سرگرمیاں نہ ہوں جو طلبہ کو عملی طور پر قوم، سماج اور اقدار سے جوڑ سکیں۔ایک مؤثر استاد کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ کلاس روم میں ایسے ماحول اور سرگرمیوں کا اہتمام کرے جو حب الوطنی، سماجی خدمت، اور قومی شعور کو اجاگر کریں۔ان سرگرمیوں کے ذریعے نہ صرف طلبہ کا ذاتی و اخلاقی ارتقاء ہوتا ہے بلکہ وہ ملک کے ذمہ دار شہری بننے کی طرف بھی پیش قدمی کرتے ہیں۔

کلاس روم میں حب الوطنی سے بھرپور ماحول: کلاس روم میں حب الوطنی سے بھرپور ماحول پیدا کرنے کے لیے استاد کو تعلیمی وغیر نصابی سرگرمیوں کو قومی شعور سے ہم آہنگ بنانا چاہیے۔کلاس روم کی دیواروں پر قومی پرچم، مجاہدین آزادی کی تصاویر، آئینی اقدار سے متعلق چارٹس اور حب الوطنی پر مبنی اقوال آویزاں کیے جائیں تا کہ بصری طور پر طلبہ کے ذہن میں قومی شناخت کا شعور پیدا ہو۔روزانہ کی اسمبلی میں قومی ترانہ، حب الوطنی کی نظم، اور قومی موضوعات پر مختصر تقریر کو شامل کیا جانا چاہیے، جس سے بچوں کو نہ صرف زبان کی تربیت ملے گی بلکہ ان کے دل میں اپنے وطن کے لیے جذبات مضبوط ہوں گے۔تدریسی عمل میں، خاص طور پر اردو، تاریخ، اور معاشرتی علوم جیسے مضامین میں، اسباق سے متعلقہ قومی موضوعات پر گفتگو کی جائے جیسے آزادی کی جدوجہد، آئینی اقدار، قومی ہیروز کی قربانیاں اور قوم کی ترقی میں طلبہ کا کردار۔استاد اپنی تدریسی مثالوں اور کہانیوں میں حب الوطنی کے پہلو کو اجاگر کرے تا کہ یہ سبق صرف کتابوں تک محدود نہ رہے بلکہ بچوں کی شخصیت کا حصہ بن جائے۔طلبہ کو قومی تہواروں جیسے یومِ آزادی اور یومِ جمہوریہ کی تیاری میں شامل کیا جائے، جن میں قومی گیت، تقریریں، اور ڈرامے شامل ہوں تا کہ وہ عملی طور پر اس جذبے کو محسوس کر سکیں۔اس کے ساتھ ساتھ، استاد خود بھی دیانت داری، وقت کی پابندی، اور قومی ذمہ داریوں کا مظاہرہ کرے تا کہ وہ طلبہ کے لیے ایک عملی نمونہ بنے۔اس طرح کا ماحول نہ صرف تعلیمی معیار کو بہتر بناتا ہے بلکہ طلبہ کے دلوں میں اپنے وطن سے محبت، اتحاد، مساوات اور قربانی جیسے جذبات کو بھی فروغ دیتا ہے۔

سروس لرننگ اور کمیونٹی ورک: سروس لرننگ اور کمیونٹی ورک کے ذریعے طلبہ میں حب الوطنی اور سماجی ذمے داری کا جذبہ بیدار کیا جا سکتا ہے۔اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طلبہ کو مقامی سطح پر موجود مسائل جیسے صفائی، پانی کی بچت، شجر کاری، یا بزرگوں کی دیکھ بھال جیسے موضوعات پر عملی سرگرمیوں میں شامل کریں تا کہ وہ قوم کی بہتری کے لیے کام کرنے کا شعور حاصل کر سکیں۔مثال کے طور پر، طلبہ اپنے اسکول یا محلے میں صفائی مہم چلا سکتے ہیں یا" ہر ہفتہ ایک پودا"مہم میں حصہ لے سکتے ہیں، جس سے وہ زمین اور ماحول کے تحفظ کو قومی خدمت کے ایک حصے کے طور پر دیکھنے لگیں گے۔اساتذہ ان سرگرمیوں کو نصاب سے مربوط کر کے سیکھنے کے مقاصد بھی حاصل کر سکتے ہیں، جیسے سائنس میں ماحولیاتی توازن، یا سماجی علوم میں برادری کی اہمیت کا تصور۔کمیونٹی ورک کے دوران، طلبہ جب حقیقی زندگی میں مختلف طبقات کے افراد سے ملتے ہیں، ان کی ضروریات اور چیلنجز کو سمجھتے ہیں، تو ان کے اندر ہمدردی، ذمہ داری، اور ملک کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طلبہ کی ان سرگرمیوں کو اسکول کی سطح پر تسلیم کریں، حوصلہ افزائی کریں، اور ان کے تجربات کو کلاس میں شیئر کروائیں تا کہ دوسرے طلبہ بھی متاثر ہوں اور ایک صحت مند حب الوطنی کا ماحول

83

پیدا ہو۔

پروجیکٹ بیسڈ لرننگ: قومی ہیروز پر کام: پروجیکٹ بیسڈ لرننگ کے تحت قومی ہیروز پر کام کروانا طلبہ میں حب الوطنی، تحقیق کی مہارت، اور تخلیقی صلاحیت کو فروغ دینے کا مؤثر طریقہ ہے۔ اساتذہ طلبہ کو مختلف قومی رہنماؤں جیسے مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر بی آر امبیڈکر، سر سید احمد خان، رانی لکشمی بائی، یا بھگت سنگھ وغیرہ کی زندگی، خدمات، اور قربانیوں پر تحقیقی پروجیکٹ تیار کرنے کا موقع دیں۔ طلبہ ان ہیروز کے حالاتِ زندگی، ان کے نظریات، اور ملک کے لیے ان کے کردار کا مطالعہ کرتے ہیں، جس سے انہیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ آزادی کوئی آسان عمل نہ تھا بلکہ قربانیوں، جدوجہد اور اصول پسندی کا نتیجہ ہے۔ پروجیکٹ کی نوعیت مختلف ہوسکتی ہے، جیسے چارٹ، پوسٹر، پریزنٹیشن، ڈرامہ، یا ڈاکیومنٹری فلم۔ اس عمل میں طلبہ کو صرف معلومات حاصل کرنے کا موقع نہیں ملتا بلکہ وہ اپنی ٹیم کے ساتھ مل کر کام کرنے، مسائل کا حل تلاش کرنے، اور اپنے خیالات کو تخلیقی انداز میں پیش کرنے کی مہارت بھی سیکھتے ہیں۔ اس طرح کے منصوبے نہ صرف طلبہ کے علمی و تخلیقی ارتقاء میں مددگار ہوتے ہیں بلکہ ان کے دلوں میں قوم سے محبت، فخر، اور خدمت کا جذبہ بھی پیدا کرتے ہیں۔

گروپ ڈسکشن اور رول پلے: گروپ ڈسکشن اور رول پلے جیسی سرگرمیاں طلبہ میں حب الوطنی، باہمی احترام، اور آئینی اقدار کے فروغ کے لیے انتہائی مؤثر تدریسی حکمت عملی کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہیں۔ گروپ ڈسکشن کے ذریعے طلبہ کو مختلف قومی موضوعات جیسے "آزادی کی قدر"، "جمہوریت میں شہریوں کا کردار"، یا "ہمارے آئینی فرائض" پر اظہارِ خیال کا موقع ملتا ہے، جس سے نہ صرف ان کی سوچ وسیع ہوتی ہے بلکہ وہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سننے اور احترام سے قبول کرنے کے رویے کو اپناتے ہیں۔ اسی طرح رول پلے میں طلبہ کو تاریخی یا موجودہ قومی کرداروں کا کردار نبھانے دیا جاتا ہے، جیسے کہ کوئی آزادی کا سپاہی، آئین ساز، یا کوئی دیانت دار سرکاری ملازم۔ ان کرداروں کو ادا کرتے ہوئے طلبہ اُن کی سوچ، جدوجہد، اور خدمات کو عملی طور پر محسوس کرتے ہیں، جس سے ان کے دل میں حب الوطنی اور ذمے داری کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اس طرح کی سرگرمیاں نہ صرف تعلیمی مشغولیت کو بڑھاتی ہیں بلکہ قومی شعور اور کردار سازی پر بھی گہرا اثر ڈالتی ہیں۔

عملی سرگرمیاں جیسے کہ گروپ ڈسکشن، پروجیکٹ بیسڈ لرننگ، رول پلے، اور کمیونٹی ورک صرف تعلیم کا حصہ نہیں بلکہ وہ طلبہ کو زندگی کے بڑے مقاصد سے روشناس کراتی ہیں۔ ان سے طلبہ میں حب الوطنی، قیادت، تعاون، سماجی خدمت، اور آئینی شعور پیدا ہوتا ہے۔ اساتذہ اگر ان حکمت عملیوں کو خلوص اور فہم کے ساتھ نافذ کریں تو نئی نسل کو ایک بااخلاق، خوددار، اور ملک دوست قیادت فراہم کی جا سکتی ہے، جو ہندوستان کے روشن مستقبل کی ضمانت بنے گی۔

درپیش مسائل اوران کا حل

اگرچہ اسکولوں میں یوم آزادی جیسے قومی مواقع کو جوش وجذبے سے منایا جاتا ہے، مگر ان تقاریب کا اثر اکثر سطحی اور وقتی ثابت ہوتا ہے۔ حب الوطنی کے حقیقی جذبے کو طلبہ کی شخصیت میں راسخ کرنے کے لیے کئی چیلنجز درپیش ہیں جن کا سامنا نہ صرف اساتذہ کو بلکہ تعلیمی نظام کو مجموعی طور پر کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ تعلیمی ڈھانچے، اساتذہ کی تیاری، اور وقت کے مؤثر استعمال سے متعلق متعدد رکاوٹیں ہیں جو حب الوطنی پر مبنی تدریس میں حائل ہو رہی ہیں۔ ان رکاوٹوں کا تجزیہ اور ان کے حل کی طرف عملی پیش قدمی کرنا نہایت ضروری ہے۔

رسمی رویہ یا سطحی تقریبات: یومِ آزادی جیسی قومی تقریبات اکثر اسکولوں میں رسمی اور سطحی انداز میں منعقد کی جاتی ہیں، جس کی وجہ سے ان کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ تقاریر، نعرے، اور پرچم کشائی جیسے عمل ایک مخصوص سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں جن میں طلبہ کی جذباتی اور فکری شرکت محدود رہتی ہے۔ اساتذہ اور انتظامیہ کئی بار ان تقاریب کو محض ایک سالانہ فریضے کے طور پر انجام دیتے ہیں، جس میں حب الوطنی کے گہرے مفہوم اور قومی شعور کو اجاگر کرنے کی سنجیدہ کوشش کم نظر آتی ہے۔ نتیجتاً، طلبہ میں یہ مواقع ایک تعطیلاتی یا نمائشی سرگرمی کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ رسمی رویے کی موجودگی میں نہ صرف مقصدیت متاثر ہوتی ہے بلکہ طلبہ میں حب الوطنی، قومی شناخت، اور ذمہ دار شہریت جیسے جذبات بھی صحیح طریقے سے پروان نہیں چڑھ پاتے۔ ان سرگرمیوں کو معنی خیز بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ طلبہ کو شامل کر کے انہیں قومی تاریخ، جدوجہدِ آزادی، اور آئینی اقدار سے مربوط طریقے سے روشناس کرائیں، تاکہ تقریبات محض روایتی نہ رہیں بلکہ تعلیمی اور اخلاقی اثرات بھی مرتب کریں۔

وقت اور تربیت کی کمی: اساتذہ کو حب الوطنی پر مبنی تدریسی سرگرمیاں مؤثر طور پر انجام دینے کے لئے وقت اور تربیت کی کمی ایک بڑا چیلنج ہے۔ روزمرہ کی تدریسی ذمہ داریاں، نصابی دباؤ، اور محدود تعلیمی وسائل اساتذہ کو اس قابل نہیں بناتے کہ وہ قومی تشخص یا آئینی اقدار جیسے موضوعات پر سنجیدگی سے کام کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اکثر اساتذہ کو حب الوطنی جیسے اہم موضوع کو تدریس میں شامل کرنے کے لیے مطلوبہ تربیت نہیں دی جاتی، جس کی وجہ سے وہ صرف سطحی سرگرمیوں تک محدود رہ جاتے ہیں۔ اساتذہ کو اس بات کی رہنمائی کم ہی ملتی ہے کہ وہ حب الوطنی جیسے اہم جذبے کو مختلف مضامین میں کس طرح مربوط طریقے سے شامل کریں۔ تربیتی پروگراموں کی عدم موجودگی، جدید تدریسی حکمت عملیوں سے عدم واقفیت، اور وقت کی قلت انہیں صرف مخصوص دنوں کی سرگرمیوں تک محدود رکھتی ہے، جبکہ حب الوطنی ایک مسلسل جذبہ ہے جسے مستقل مزاجی اور تدبر کے ساتھ فروغ دینا چاہیے۔ اس چیلنج پر قابو پانے کے لیے تدریسی تربیت، وقت کی منظم منصوبہ بندی، اور تعلیمی نظام میں لچکدار طریقوں کی شمولیت ناگزیر ہے۔

اساتذہ کی تربیت، نصاب میں بہتری اور ICT کا استعمال: اساتذہ کی تربیت، نصاب میں بہتری، اور ICT کے مؤثر استعمال کے ذریعے حب الوطنی کے فروغ سے متعلق موجودہ چیلنجز کا حل نکالا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے اساتذہ کو ایسے تربیتی مواقع فراہم کیے جائیں جن میں وہ قومی شناخت، آئینی اقدار، اور اخلاقی تعلیم جیسے موضوعات کو اپنے تدریسی عمل میں ضم کرنے کے عملی طریقے سیکھ سکیں۔ ساتھ ہی ساتھ نصاب میں ایسی کہانیاں، مثالیں، اور سرگرمیاں شامل کی جائیں جو طلبہ میں حب الوطنی، جمہوریت، اور بھائی چارے کے جذبات کو ابھاریں۔ روایتی نصابی مواد کی جگہ ایسا مواد متعارف کرایا جائے جو نہ صرف معلوماتی ہو بلکہ متاثر کن بھی ہو۔ مزید برآں، انفارمیشن اینڈ کمیونیکیشن ٹیکنالوجی (ICT) کا استعمال اس میدان میں بڑی تبدیلی لا سکتا ہے۔ حب الوطنی سے متعلق ڈاکیومینٹریز، مجاہدینِ آزادی پر ویڈیوز، انٹرایکٹو ایپس، اور آن لائن سرگرمیوں کے ذریعے طلبہ کو بصری، سمعی اور عملی سطح پر جوڑا جا سکتا ہے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ ٹیکنالوجی کا استعمال کر کے اپنے تدریسی مواد کو نہ صرف دلچسپ بنائیں بلکہ اس سے طلبہ کے دلوں میں قومی فخر اور ذمہ داری کا احساس بھی پیدا کریں۔ یوں تدریس اور تربیت کا یہ امتزاج حب الوطنی کو رسمی سرگرمیوں سے نکال کر طلبہ کے روزمرہ رویوں کا حصہ بنا سکتا ہے۔

ان چیلنجز کے باوجود، اگر اساتذہ کو مناسب تربیت فراہم کی جائے،

84

نصاب کو عصری تقاضوں کے مطابق بہتر بنایا جائے، اور تدریس میں ICT کا مؤثر استعمال کیا جائے، تو حب الوطنی کے جذبے کو مؤثر طریقے سے نئی نسل میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ایک فعال، باخبر اور مؤثر استاد ہی تعلیمی ادارے کو قومی تعمیر کا مرکز بنا سکتا ہے، بشرطیکہ اسے درکار وسائل، وقت، اور تربیت فراہم کی جائے۔

تجاویز

موجودہ وقت میں تعلیم کا مقصد صرف معلومات کی ترسیل تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس کا دائرہ کار شخصیت کی تعمیر، قومی شعور کی بیداری، اور آئینی و اخلاقی اقدار کی تعلیم تک پھیل چکا ہے۔ اسکول ایک ایسی بنیادی اکائی ہے جہاں طلبہ کی ذہنی، جذباتی، اور اخلاقی تربیت کی جا سکتی ہے۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ تعلیمی نظام میں ایسی پالیسیوں اور عملی تدابیر کو شامل کیا جائے جو نہ صرف علم فراہم کریں بلکہ طلبہ کے اندر حب الوطنی، سماجی ذمہ داری، اور قائدانہ صلاحیتوں کو بھی فروغ دیں۔

ہر سطح پر اقدار پر مبنی تعلیم کی شمولیت: ہر سطح پر اقدار پر مبنی تعلیم کی شمولیت وقت کی اہم ضرورت ہے، کیونکہ صرف نصابی علم کافی نہیں بلکہ طلبہ کو ایک باکردار شہری بنانے کے لیے اُن کی اخلاقی، سماجی اور جذباتی نشوونما بھی ضروری ہے۔ اسکول کے ابتدائی درجے سے لے کر اعلیٰ ثانوی سطح تک نصاب میں دیانت داری، احترام، رواداری، انصاف، مساوات، اور حب الوطنی جیسے بنیادی انسانی و آئینی اقدار کو شامل کیا جانا چاہیے۔ مضامین جیسے زبان، مطالعۂ سماج، اسلامیات یا اخلاقیات میں کہانیوں، نظموں، کرداروں، اور عملی سرگرمیوں کے ذریعے ان اقدار کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ تدریسی حکمت عملی میں کردار ادا کرنا، مباحثے، گروپ ورک اور مسائل کا حل نکالنے والی سرگرمیاں شامل کر کے ان اقدار کو زندگی سے جوڑنے کا موقع فراہم کیا جا سکتا ہے۔ جب طلبہ ان اقدار کو روزمرہ کے اسکولی تجربات میں محسوس کرتے ہیں تو وہ فکری اور عملی طور پر ان سے جڑ جاتے ہیں۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ تدریس کے دوران مثالوں، رویے اور زبان و بیان میں ان اقدار کو نمایاں کریں تاکہ سیکھنے کا عمل شعوری طور پر اقدار پر مبنی ہو جائے۔

اسکول اسمبلی میں حب الوطنی کے عناصر: اسکول اسمبلیاں حب الوطنی اور اقدار کی تعلیم کا ایک مؤثر ذریعہ بن سکتی ہیں اگر اُن میں قومی جذبے سے بھرپور عناصر کو شعوری طور پر شامل کیا جائے۔ روزانہ کی اسمبلی میں قومی ترانہ، حب الوطنی کی نظمیں، اقوالِ زریں، اور اہم قومی شخصیات کی زندگی سے سبق آموز واقعات کا تذکرہ نہ صرف طلبہ کے جذبات کو بیدار کرتا ہے بلکہ ان کے ذہن میں ملک و قوم سے وابستگی کو مستحکم بھی کرتا ہے۔ یومِ آزادی، یومِ جمہوریہ، گاندھی جینتی، اور دیگر قومی ایّام پر خصوصی تقریبات کے انعقاد سے طلبہ کو اپنی تاریخ، آئین اور جمہوری اقدار سے واقفیت ہوتی ہے۔ اسمبلی کے ذریعے بین الثقافتی ہم آہنگی، اتحاد، مساوات، اور بھائی چارے جیسے موضوعات کو اجاگر کر کے طلبہ کے اندر سماجی ذمہ داری اور حب الوطنی کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ اساتذہ اور طلبہ کو مل کر اسمبلی کی منصوبہ بندی کرنی چاہیے تاکہ وہ صرف رسمی عمل نہ رہے بلکہ ایک تعلیمی و اقداری تجربہ بن جائے۔

طلبا کونسل اور لیڈرشپ پروگرامز: طلبا کونسل اور لیڈرشپ پروگرامز طلبہ میں قیادت، خود اعتمادی، اور حب الوطنی جیسے اوصاف کے فروغ کا مؤثر ذریعہ بن سکتے ہیں۔ جب طلبہ کو اسکول کی سطح پر مختلف ذمے داریاں سونپی جاتی ہیں، جیسے کہ اسمبلی کی قیادت، صفائی کا نظم، تقریبات کی تنظیم، یا کلاس کی نمائندگی، تو ان میں نہ صرف قیادت کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں بلکہ وہ اپنے ادارے، سماج اور ملک سے وابستگی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اسٹوڈنٹ کونسل کے انتخابات جمہوری اقدار جیسے انتخابی عمل، برابری، شفافیت اور اجتماعی فیصلے کی عملی تربیت فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح، قیادت پر مبنی ورکشاپس، مباحثے، کمیونٹی سروس کے منصوبے اور رضاکارانہ سرگرمیاں طلبہ کو فعال شہری بننے کی تربیت دیتی ہیں۔ ان پروگرامز کے ذریعے اسکول ایک ایسی نسل تیار کر سکتا ہے جو نہ صرف علم رکھتی ہو بلکہ معاشرتی اور قومی ذمہ داریوں کو سمجھنے والی بھی ہو۔

استاد بطور رول ماڈل: استاد بطور رول ماڈل طلبہ کی شخصیت سازی اور اقدار کی منتقلی میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ جب ایک استاد خود دیانت، وقت کی پابندی، انصاف پسندی، اور حب الوطنی جیسے اوصاف کا عملی مظاہرہ کرتا ہے تو طلبہ اس کے طرزِ عمل کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ استاد کا لباس، گفتگو کا انداز، اختلافِ رائے کا احترام، اور ہر طالب علم سے یکساں سلوک بچوں کے دلوں پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ اگر استاد خود آئینی اقدار اور قومی تشخص کا احترام کرے، اسکول کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے، اور مثبت طرزِ عمل اپنائے، تو یہ رویہ طلبہ میں شعوری طور پر منتقل ہوتا ہے۔ استاد کے اقوال و افعال طلبہ کے لیے جیتی جاگتی تعلیم ہوتے ہیں، اور یہی غیر رسمی لیکن مؤثر طریقہ تدریس اقدار کی تعلیم کے لیے سب سے زیادہ پائیدار اور قابلِ اعتماد ذریعہ بن سکتا ہے۔

اگر اسکول کی سرگرمیوں، تدریس، اور طرزِ عمل میں اقدار پر مبنی عناصر کو منظم انداز میں شامل کیا جائے تو یہ صرف فرد کی اصلاح تک محدود نہ رہیں گے بلکہ ایک بہتر، ذمہ دار، اور قوم پر فخر کرنے والے شہری پیدا ہوں گے۔ اسکول اسمبلیوں، اسٹوڈنٹ کونسل، لیڈرشپ پروگرامز اور اساتذہ کی ذاتی مثالوں کے ذریعے یہ عمل پائیدار بن سکتا ہے۔ جب استاد خود اقدار کا پیکر بنے گا تو طلبہ نہ صرف ان اقدار کو سیکھیں گے بلکہ اپنی زندگیوں میں نافذ بھی کریں گے۔ یوں ایک مضبوط، باکردار، اور باہدف نسل کی تشکیل ممکن ہو سکے گی۔

اساتذہ کی اہمیت قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں نہایت کلیدی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ یہ پالیسی اساتذہ کو علم کے محض معلومات کی ترسیل کرنے کے بجائے طلبہ کی ہمہ جہت ترقی کے رہنما اور رہبر کے طور پر دیکھتی ہے۔ NEP اساتذہ کو تعلیم کے نظام میں مرکزی حیثیت دیتی ہے اور ان کی پیشہ ورانہ ترقی، خودمختاری، اور تربیت پر خصوصی زور دیتی ہے تاکہ وہ نہ صرف نصاب کی تدریس تک محدود نہ رہیں بلکہ طلبہ میں اخلاقی اقدار، حب الوطنی، تنقیدی سوچ، اور معاشرتی شعور پیدا کرنے کا ذریعہ بھی بنیں۔ اس پالیسی کے تحت اساتذہ کو نہ صرف معیاری تدریسی وسائل فراہم کیے جاتے ہیں بلکہ ان کے کردار کو اس حد تک وسعت دی گئی ہے کہ وہ ایک مثالی رول ماڈل بن کر طلبہ کی کردار سازی، قومی یکجہتی، اور آئینی شعور کو فروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کریں۔ چنانچہ NEP 2020 اساتذہ کو تعلیمی اصلاحات کا محرک اور قوم کی تعمیر کا بنیادی ستون تسلیم کرتی ہے۔

لہٰذا اساتذہ کی تربیت، اسکولی ماحول، اور تعلیمی سرگرمیوں کے ذریعے قوم پرستی، آئینی اقدار، اور اخلاقی تعلیم کو فروغ دینا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اگر ابتدائی سطح سے ہی ان عناصر کو تعلیم کا حصہ بنا دیا جائے تو مستقبل میں ہم ایک ایسی نسل تیار کر سکتے ہیں جو نہ صرف علمی اعتبار سے مضبوط ہو بلکہ سماجی، اخلاقی، اور قومی ذمہ داریوں سے بھی بخوبی آگاہ ہو۔ یہی باشعور، بااخلاق اور محب وطن نسل ایک مضبوط اور روشن ہندوستان کی بنیاد بن سکتی ہے۔ اور، اس طرح ہندوستان کے وشیو گرو بننے کے خواب کو بھی حقیقت میں بدلا جا سکتا ہے۔

 85

مصر میں بچوں کے ادب میں کامل کیلانی کی خدمات

مطہر احمد لوہار

ریسرچ اسکالر (شعبہ: شیخ العالم، کشمیر یونیورسٹی، حضرتبل سرینگر)

mutahirsalfi123@gmail.com

تعارف:

عربی ادب میں احمد شوقی سے پہلے اور مختصر افسانوں میں کامل کیلانی سے پہلے بچوں کا ادب ایک الگ فن کے طور پر عربی ادب میں داخل نہیں ہوا تھا۔ محمد محمود بچوں کے ادب کی تعریف کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں کہ ایسے اچھی کلام کو کہتے ہیں جو بچوں کے دلوں میں فنی لذت پیدا کرتی ہے، چاہے وہ شاعری ہو یا نثر۔ چاہے یہ زبانی ہو یا تحریری اظہار، اس مفہوم بچوں کی کہانیاں، انکے ڈرامے اور انکے نغمیں شامل ہیں۔

احمد نجیب کہتا ہے کہ بچوں کے ادب کی دو صورتیں ہیں، جن میں سے ایک عمومی ہے اور اس کا مطلب ہے "علم کی مختلف شاخوں میں ان بچوں کے لیے کتابوں میں درج ذہنی پیداوار، "اور دوسرا مخصوص ہے، اور اس کا مطلب ہے "اچھا کلام جوان بچوں کی روحوں میں فنکارانہ لذت پیدا کرتی ہے۔ خواہ وہ شاعری ہو یا نثر، اور چاہے یہ زبانی ہو یا تحریری اظہار،

بچوں کے ادب کی ترقی کے مراحل

اسکالرز کا خیال ہے کہ بچوں کا ادب تین مراحل سے گزرا ہے،

پہلا مرحلہ: یہ 1697 عیسوی میں شروع ہوتا ہے، جو کہ کہانی "حکایات اُمّی ال اِوزۃ '' کی اشاعت کی تاریخ ہے جسے فرانسیسی شاعر چارلس پیرولٹ 1628)Charles Perrault) -1703ء نے لکھا تھا۔ اس کتاب نے پورے یورپ میں نمایاں ادبی سرگرمیوں کے احیاء میں اہم کردار ادا کیا، یہ پرانے براعظم کی لوک داستانوں پر مبنی تھی اور بچوں کو پیش کی گئی۔

اس مرحلے میں ایک اہم ادبی واقعہ دیکھنے میں آیا، جو کہ Antoine Galland (1646-1715 AD) کی کہانیوں کا ترجمہ تھا "ایک ہزار اور ایک راتیں 'الف لیلۃ ولیلۃ، جو بعد میں ادبی تخلیق میں ایک نمایاں سنگ میل بن گیا، جس نے سترہویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں بچوں کے ادب میں لکھے گئے نے بہت ساروں متاثر کیا۔ پھر بچوں کے ادب میں لکھنے نے جان جیک روسو کی کتاب "ایمیل" کے ظہور کے ساتھ ایک اور پختہ موڑ لیا، جس نے سب سے پہلے بچے کا ایک آزاد انسان کے طور پر مطالعہ کیا۔ اس عرصے کے دوران، عظیم مصنفین سامنے آئے جنہوں نے بچوں کے لیے تحریری طور پر اپنا نشان چھوڑا، جن میں جرمن بھائی جیکب گرِم (1785-1863ء) اور وِلھیم گرِم (1786-1859ء) شامل ہیں، جنہوں نے "بچوں کی کہانیاں اور مکانات '' لکھے۔ بین الاقوامی کہانی ''سنو وائٹ Snow White'' انگریز لیوس کیرول (1832?-1898AD)، جس نے اپنی کہانی ایلس ان ونڈرلینڈ شائع کی، اور ڈینش ہینس اینڈرسن (1865-1875AD)، ? جس نے کہانی "The Ugly Duckling" لکھی۔

دوسرا مرحلہ: پہلی جنگ عظیم (1914-1918ء) کے بعد کا دور ہے اور اس کی خصوصیت ایک آزاد ہستی کے طور پر بچے پر منظم سائنسی مطالعات کی تکمیل سے تھی۔ عادات اور اس کس ی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس دور کے مصنفین نے ان مطالعات سے استفادہ کیا اور اپنے طریقے سے عنوانات انہیں بچوں کی ضروریات اور خواہشات کے مطابق پیش کرنے کا طریقہ تیار کیا۔

تیسرا مرحلہ: یہ مرحلہ دوسری جنگ عظیم (1939-1945 عیسوی) کے خاتمے کے ساتھ شروع ہوتا ہے، کیونکہ مغرب کے اسکالرز اس وقت کو بچوں کے ادب کا سنہری دور سمجھتے ہیں، جس کے دوران کتابیں چھپی تھیں۔ اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہوا، خاص طور پر بچوں کے لیے رسالے شائع کرنا، ڈرامے بنانا اور فلمیں بنانا۔ خصوصی لائبریریاں اور اشاعتی ادارے بھی سامنے آئے اور بچوں کے ادب کو ایک ایسے مضمون کے طور پر شامل کیا گیا جو مختلف بڑی یونیورسٹیوں میں مطالعات میں اپنا مقام رکھتا ہے، جس نے اس فن کی بنیادیں قائم کیں۔

عرب دنیا میں بچوں کا ادب

جہاں تک عرب دنیا کا تعلق ہے تو بچوں کے ادب میں لکھنے کی پہلی نشانیاں امیر شعراء احمد شوقی (1868ء تا 1932ء) کے ہاتھوں نمودار ہوئیں، جنہیں عرب دنیا بچوں کی اس قسم کے ادب کی ضرورت کو جلد ہی محسوس ہوا، چنانچہ شوقی نے 'الصیاد والعصفور"، "الدیک الھندی"، "الدجاج البلدی" وغیرہ غیرۃ نظمیں لکھی۔ جوان کے شاعری مجموعے "الشوقیات" میں موجود ہیں، جو کہ 1898ء میں شائع ہوا تھا۔ جہاں تک شوقی سے پہلے لکھے گئے ادب کا تعلق ہے، یہ خاص طور پر بچوں کے لیے نہیں لکھا گیا، جیسا کہ ڈاکٹر علی الحدیدی اور دیگر علماء نے کہا ہے کہ اس فن کو جو کہانیوں اور تعلیمی نظموں کا بھرپور ذریعہ بننے سے نہیں روکتا ہے۔ اس سے بعد کے زمانے میں ماہرین تعلیم نے بچے کی عمر اور صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسی کا انتخاب کیا۔ اس نقطہ نظر سے جدید دور کے بعض مصنفین میں "الف لیلۃ ولیلۃ: ہزار داستان" کی کہانیوں کو افسانوں، مافوق الفطرت اور کچھ "فحش" مناظر سے نظر ثانی کر کے اور ان کے کچھ حصوں کو اسٹیج پر ڈراموں کے طور پر پیش کر کے دوبارہ لکھنے کی کوشش کی۔ پھر ادیبوں کی کاوشیں بچوں کا ادب لکھنے کے لیے جاری رہیں جن میں شاعری اور کہانیاں بھی شامل تھیں۔

ورثے سے کہانیاں لکھنا، ان کا خلاصہ لکھنا، آسان بنا کر لکھنا، ان میں سسپنس اور تماشا شامل کر کے لکھنا، اور روح کے مطابق لکھنا مصنفین کا غالب مشغلہ بن گیا۔ اور یہ کہانیاں اس زمانے میں اکثر جانوروں اور کیڑوں کی زبانوں سے پیش کی جاتی تھی، لیکن یہ تجربہ 1970 کی دہائی کے اوائل تک کافی پختہ نہیں ہوا تھا۔ پھر شوقی کے دور کے بعد ایک شاندار نام سامنے آیا جسے مصر اور عرب دنیا میں بچوں کے ادب کے علمبرداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یعنی کامل الکلانی (1897 - 1959)، جس نے 1927 عیسوی میں ایک مشہور کہانی "السندباد البحری" "Sinbad the Sailor" لکھ کر ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ اور اسی طرح "من حیاۃ الرسول" سیرت مصطفی ﷺ پر ایک اہم شاہکار لکھا، پھر جوان کلیوں کے فہم و ادراک سے ہم آہنگ رکھنے کے لیے ان پر مبنی کہانیاں لکھیں۔ اس کے بعد کبھی عرب ورثے کے لیے، اور کبھی عالمی ورثے کے لیے، یہ سب ایک وسیع ثقافت کی تعمیر ہے جو بچوں کی تفریح کا ذریعہ بنا

86

پھراس فن کے دوسرے پہلو میں سفر جاری رکھا اور اس میدان میں تخلیقی مقاصد حاصل کیے جن میں سے زیادہ ترتعلیمی اور تربیتی پہلو پائے ہیں، ہم مثال کے طور پر مصر میں احمد نجیب (1928ء) اور علی الحدیدی، شام میں سلیمان العیسیٰ (1921 (2013)) اور عراق میں جعفر الصادق کا ذکر کرتے ہیں۔

کامل کیلانی کی زندگی کا خلاصہ:

کامل کیلانی ایک مصری مصنف، صحافی اور شاعر ہے جنہیں بچوں کے ادب کا علمبردار سمجھا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے بچوں کے لیے ایک ہزار سے زیادہ کہانیاں لکھی اور دیگر زبانوں سے ترجمہ بھی کیئں، اور وہ رومانوی شاعری اسکول "اپولو" کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا رکن تھا۔

پیدائش اور پرورش

کامل کیلانی بن ابراہیم کیلانی 20 اکتوبر 1897ء کو مصر کے دارالحکومت قاہرہ کے محلہ قلعہ میں پیدا ہوئے، وہیں پلے بڑھے اور پڑوس کے اساتذہ سے قرآن پاک حفظ کیا اور ساتھ ساتھ پڑھنا لکھنا بھی سیکھا۔ پھر 1907 میں ام عباس پرائمری اسکول، پھر قاہرہ اسکینڈری اسکول میں داخلہ لیا اور بیچلوریٹ کی ڈگری حاصل کی، اور اس عرصے کے دوران اس نے خود کو انگریزی ادب کے لئے وقف کیا، اسکے بعد فرانسیسی زبان اور اطالوی زبان کے اصولوں کو سیکھا۔ پھر 1917 میں مصری یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جہاں سے انہوں نے انگریزی کے شعبہ سے بیچلر آف آرٹس حاصل کیا۔ اسی طرح انہوں نے جامع الازہر میں صرف ونحو، اور منطق کے اسباق میں بھی شرکت کر کے کمال حاصل کیا۔

ملازمتیں اور ذمہ داریاں

پہلے پہل انہوں نے بحیثیت انگریزی زبان کے استاد اور متعدد اسکولوں میں مترجم کے طور پر کام کیا، پھر انہیں 1922ء میں وزارت اوقاف میں ملازم مقرر کیا گیا۔ جہاں وہ لسانی طریقوں کو درست کرنے کا ذمہ دار تھا، اور وہیں پر سکونت پذیر ہوئے 1954ء تک مختلف عہدوں پر فائز ہو کر کام کرتا رہا پھر 1954 میں سپریم انڈومنٹ کونسل کے سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔

ادبی کارنامے اور تجربہ:

کیلانی نے ابتدا میں صحافت میں کام کیا ساتھ ساتھ ادب اور فنون میں مہارت حاصل کی، اور اپنے گھر میں اپنے دوستوں کیلیے ہفتہ وار سیمینار منعقد کرتا رہا۔ پھر 1918ء میں اس نے ماڈرن ایکٹنگ کلب کے صدر کے طور پر کام کیا اور پھر 1922 میں الرجاء نامی ایک اخبار کے چیف ایڈیٹر بن گئے۔ پھر 1925-1932 کے دوران عرب لٹریچر ایسوسی ایشن کے سیکرٹری رہے۔

انہوں نے اپنی دلچسپی سے بچوں کا ادب لکھنے کی طرف 1927 میں شروعات کی اور اس فن کے سرخیل بننے اور بچوں کے لیے ان کی پہلی کہانی "السندباد البحری" کو شائع کیا اور اسی میدان میں اس نے بہت ساری تحریروں کے ساتھ اس فن کی پیروی کی۔ ان کا خیال تھا کہ بچوں کی کہانیوں کے مکالمے کلاسیکی یعنی فصیح عربی میں ہونے چاہئیں اور اس نے کلاسیکی عربی کو مقبول بنانے کی کوشش کی۔ بچوں کو خوبصورت گرافک انداز میں وہ اپنی تحریر کا مذہبی اور اخلاقی پہلو بھی دکھانے کے خواہشمند تھے۔ اس نے بچوں کے رویے کو بہتر بنانے اور اقدار کو بالواسطہ طور پر ابھارنے کے لیے عالمی اور مقبول افسانوں سے کام لیکر قصوں اور کہانیوں کی تخلیق کی۔ انہوں نے نثری ادبی شاہکاروں کے علاوہ عربی شاعری کی بیس ہزار سے زائد سطریں حفظ کی تھیں۔ اور اسی طرح حکمت کی باتیں، کہاوتیں، اور مزاحیہ ادب اور افسانوں کا ایک اچھا مجموعہ یاد کیا تھا جس کے بارے میں وہ پرجوش ہو گیا یہاں تک کہ اس نے کہا: "إن الأسطورة دعامة حياتي" ترجمہ: افسانہ میری زندگی کا ایک ستون ہے۔

تالیفات:

کیلانی نے بچوں کے لیے ایک ہزار سے زیادہ کہانیاں لکھیں، اور انگریزی زبان سے کہانیوں کا ایک مجموعہ ترجمہ کیا جن کو انھوں نے "روائع من قصص الغرب: مغربی کہانیوں کے شاہکار" اور "مختار القصص: کہانیوں کا انتخاب" کے عنوان سے شائع کیے۔ ابوالعلاء المعری کی تصنیف "رسالۃ الغفران" کا انگریز مستشرق جیرالڈ بریکنبری کے ساتھ مل کر انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح اس نے اطالوی زبان میں لکھی گیی نظموں اور کہانیاں کا ترجمہ بھی کیا۔

ان کی سب سے مشہور مختصر کہانیوں کی کتابوں یوں ہیں: مصباح علاء الدین: علاء کا چراغ"، و'حی بن یقظان"، و'نوادر جحا: جحا کی کہانیاں." و"روبنسون کروزو: رابنسن کروسو"، و"شہرزاد"، و'ألف ليلة: ایک ہزار راتیں" وغیرہ وغیرہ

اس نے ڈچ مستشرق رین ہارٹ دوسی کی کتاب " کنگز آف سیکٹ اینڈ ویوز آن دی ہسٹری آف اسلام" کا عربی میں ترجمہ کر کے "ملوک الطوائف ونظرات في تاريخ ال إسلام" نام رکھا۔ اس نے "نظرات في تاريخ الأدب الأندلسي: اندلسی ادب کی تاریخ پر نظریات، کے نام سے ایک کتاب لکھی (جو کہ مصری یونیورسٹی میں دیے گئے اس کے لیکچرز ہیں)"۔ فن تحریر میں "كيف ندرس فن ال إنشاء: ہم تحریر کے فن کا مطالعہ کیسے کریں"، اور "مذكرات الأقطار الشقيقة: بہن ممالک کی یادداشتیں" لکھیں۔ اور ساتھ ساتھ "دیوان ابن رومی" اور "دیوان ابن زیدون" کی تحقیق بھی کی۔

ان کی شاعرانہ تخلیقات: کامل کیلانی کا بچوں کے لیے شعری مجموعہ کے علاوہ بہت سارے قصائد ہیں جو "اپولو" میگزین چھپے ہیں، جن میں "من يعنيني: کون میری فکر کرتا ہے"، و'سوف أنساك: میں تمہیں بھول جاؤں گا"، و'شاعر مخبول يصف الحب: ایک پاگل شاعر محبت کو بیان کرتا ہے" اور قصائد اور نظمیں 'شعر الأطفال: بچوں کی شاعری" کے عنوان سے میگزین کے مختلف شماروں میں شائع ہوا، اور اس میں سے کچھ کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔

وفات: مصنف کامل کیلانی 9 اکتوبر 1959 کو وفات پا گئے۔

کتابیات:

1. أحمد ابو أسعد، تطور فن الكتابة للأطفال، ومشكلياته، الموقف الأدبي، 1980ء۔
2. أحمد ناصر، القصص الفلسطيني المكتوب للأطفال، دائرة الثقافة، 1998ء۔
3. أحمد نجيب. القصة في أدب الأطفال، مطبعة علي بك، القاهرة، 1974ء
4. أحمد حسن حنورة، أدب الأطفال/ الكويت: مكتبة الفلاح، 1989ء
5. نجيب كلاني، أدب الأطفال في ضوء ال إسلام، بروت: مؤسسة الرسالة، 1993ء
6. حامد عبد السلام زهران، علم نفس النمو الطفولة والمراهقة/ القاهرة: عالم الكتب 1998ء
7. منصور حسين، د. محمد مصطفى زيدان، الطفل والمراهقة، إسكندرية
8. جميل حمداوي، أدب الأطفال في العراق مقال

87

توضیح فنون ادب اور ڈاکٹر صابر سنبھلی

فرمان حسین سیف خاں

،سرائے سنبھل

موبائل:8909927605

نگراں : ڈاکٹر جہانگیر احمد خاں

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے (ادب کے فن کی وضاحت) (lkfgfR;d dykvksa dh O;k[;k) ڈاکٹر صابر حسین سنبھلی متوطن سیف خان سرائے سنبھلی اتر پردیش پیدائش 29 جولائی 1942ء انتقال 28 دسمبر 2021ء صدر شعبہ اردو ادب ایم۔ ایچ کالج مرادآباد کی تصنیف ہے۔

آپ نے نثر و نظم دونوں میں طبع آزمائی کر کمال کے جوہر دکھائے اور دونوں میں ہی آپ کا ادبی ذخیرہ ملتا ہے۔ حمد، نعت، مرثیہ، رُباعی، غزل جیسی اصناف کے آپ صاحب دیوان ہیں۔ اس کے علاوہ منقبت، تضمین، سہرے، دوہے، مستزاد، نظم، تاریخ گوئی، قطعہ، پہیلیاں وغیرہ اصناف میں بھی خوب طبع آزمائی کی۔

نثر میں آپ محقق، زبان دان، نقاد، مترجم، ادیب، لسانداں اور خوش بیان بھی رہے۔ تحقیق نما۔ اردو تحقیق اور متیاز علی عرشی، ادبیات رضا۔ ادبی تجزیہ۔ نقد و بصر۔ شعار زباندانی، کنزالایمان کا لسانی جائزہ۔ اوراق العروض اور توضیح فنون ادب جیسی کتب انکے عمیق علم کا پتہ دیتی ہیں۔ آپکا یہ شاہکار تحقیق کارنامہ اردو ادب کے عظیم خزائن میں اضافہ کرتا ہے۔

توضیح فنون ادب 144 صفحات پر مشتمل ہے آپ نے اس میں چار عنوان نثر۔ علم قافیہ۔ تاریخ گوئی اور عروض کے تحت نو ((9 موضوعات 1- نثر اور اقسام نثر 2- تحریف روی 3- کچھ ایطا کے بارے میں 4۔ حساب جمل میں ہمزہ کے اعداد I- حساب جمل میں ہمزہ کے اعداد II- رازہائے تاریخ گوئی اور راز صاحب 7- اقبال کی غزلیات کا عروضی جائزہ 8- حدائق بخشش کا عروضی تجزیہ اور- 9 سقوط حرف علت کو زیر بحث لیا ہے۔

نثر اور اقسام نثر بابت اپریل 1995ء، تحریف روی بابت مارچ 1996ء حساب جمل میں ہمزہ کے اعداد بابت جولائی 1995ء، حساب جمل میں ہمزہ کے اعداد بابت مئی 1996ء، رازہائے تاریخ گوئی اور راز صاحب بابت مئی 1997ء، سقوط حرف علت بابت دسمبر 1996ء کی اشاعت ماہ نامہ تیرنیم کش مرادآباد میں ہوئی اور کچھ ایطا کے بارے میں۔ سہ ماہی ابر بدایوں ایطا نمبر جولائی تا دسمبر 1996ء جبکہ اقبال کی اردو غزلیات کا عروضی جائزہ سہ ماہی اردو ادب نئی دہلی بابت 1986ء شمارہ ۱۔۲ اور سقوط حرف علت۔ سالنامہ یادگار رضا بمبئی (ممبئی 1995 میں شائع ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ان سارے مضامین کو مضامین بلاغت کا نام تجویز کر خوش نویس سید محمود علی کے سامنے رکھا۔ انھوں نے اس نام سے اختلاف کیا جس کی تائید اد ماہر عروض داں ڈاکٹر عارف حسن صدر شعبہ اردو ہندو کالج مرادآباد نے بھی کی۔

پھر اسکا تاریخی نام (توضیح فنون ادب 1417ھ رکھا اور 1995 میں اس کو کتابی شکل دے دی گئی۔

☆☆☆

سب سے پہلا موضوع: نثر اور اقسامِ نثر پر بحث اٹھاتے ہوئے بتایا ہے کہ زمانہ قدیم کی نثر کو دو اقسام میں رکھا جا سکتا ہے ایک الفاظ کے لحاظ سے اور دوسری معنی کے لحاظ سے۔

الفاظ کے لحاظ سے

الفاظ کے لحاظ سے بھی نثر کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ مرجز ۲۔ مسبّع ۳۔ عاری

ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں کہ (زبدۃ القواعد) میں ان تینوں کا ذکر ملتا ہے اور آگے بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اپنی تصنیف ''اُردو کے اسالیب بیان'' میں ایک قسم (مقفیٰ) اور بڑھا کر چار مانتے تھے نسیم بلاعت میں بھی چار اقسام درج ہیں مگر مقفیٰ کی جگہ مرصع کا نام ملتا ہے جبکہ زبدۃ القواعد میں مقفیٰ اور مسجّع کو ایک ہی مانا ہے۔ مطلب کل ملا کر دیکھا جائے تو نثر کے اقسام اسطرح ہو گئے:

۱۔ مرجز ۲۔ مقفیٰ (مرصّع۔ مسجّع) ۳۔ عاری

۱۔ مرجز۔ نثر سے متعلق دو گروہ مختلف آرا رکھتے ہیں جبکہ سرمائے بلاعت کا موقف ان دونوں کی آدھی آدھی تقلید کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے کیونکہ یہ مثال تو پہلے گروہ کی دیتا ہے اور رائے کی تصدیق دوسرے گروہ کی کرتا ہے۔

پہلا گروہ مرجز نثر کی تعریف یوں کرتا ہے:

''وہ نثر ہے جس میں فقروں کے کلمات ہم وزن ہوں قافیہ مقفیٰ نہ ہوں۔''

اس تعریف کی تائید میں پہلا گروہ یہ ہے:

۱۔ ڈاکٹر زبید احمد ----------------

زبدۃ القواعد صفحہ 186۔

۲۔ علامہ اخلاق دہلوی

شمیم بلاغت صفحہ 95۔ ----------------

۳۔ ملّا غیاث الدین رام پوری ----------------

غیاث الغات۔

مثال: (۱) قامت (۲) موزوں (۳) کے (۴) روبرو (۵) سرو (۶) رواں (۷) ناچیز (۸) ہے اور

(۱) کاکل (۲) پیچاں (۳) گے (۴) سامنے (۵) مشک (۶) ختن (۷) بیقدر (۸) ہے۔

دوسرے گروہ کی تعریف اس طرح بیان کی ہے:

''وہ نثر جس میں وزن ہو قافیہ نہ ہو''

مثال:-'' دیوان حقیقت کے مطلع کے ہیں دو مصرع ایک حمد الٰہی ہے اور ایک نعت پیمبر ہے اس مطلع روشن کے معنی منور سے ہر ذرہ بھی ہے واقف۔

دوسرے گروہ کہ موئد یہ ہیں:

۱۔ انوار رضوی -

درس بلاغت صفحہ 59-58

۲۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور -

اردو کے اسالیب بیان صفحہ 58

۳۔ سید قدرت نقوی -

88

باغ و بہار کا تنقیدی مطالعہ صفحہ 113-111

۴۔ مرزا غالب -

مکتوب بنام سرور مشمولہ عود ہندی صفحہ 13-14

۵۔ نجم الغنی خاں رام پور -

بحر الفصاحت صفہ 1009

اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنا موقف بھی بیان کر دیا جو اسطرح ہے:

''دبی زبان سے یہ کہنے کی گستاخی ضرور کرونگا کہ میں اس بات کو نہیں سمجھ سکا کہ جب نثر کلام ناموزوں اور غیر مقفیٰ ہے تو اس کے اقسام میں موزونیت اور قافیہ کہاں سے آ جاتا ہے۔''

آپکی یہ دلیل بھی قوی محسوس ہوتی ہے جیسا کہا جاتا ہے کہ کلام موزوں کو نظم اور غیر موزں کو نثر کہا جاتا ہے۔

اب دونوں گروہ کی آرا پر غور کیا جائے تو دونوں مرجز میں وزن کا ہونا مانتے ہیں اور قافیہ کا نہیں۔ ہاں پہلا گروہ (دوفقروں کے کلمات) کی شرط لگاتا ہے۔

نثر مقفیٰ = (مسجّع اور مرصّع)

مسجع : نثر مقفیٰ میں قافیہ کا ہونا اور وزن کا نہ ہونا قرار پایا مطلب مرجز کی مخالف نثر مقفیٰ کی پہلی شاخہ نثر مسجع جو مقفیٰ کے قریب تر ہے اس میں دوفقروں کے تمام الفاظ ہم وزن اور آخری حرف میں بھی موافقت بتائی گئی ہے۔

مرصّع۔ یہ نثر مقفیٰ کی دوسری شاخہ ہے۔

پہلے فقرے میں جو الفاظ واقع ہوئے ہیں انھیں کے وزن پر دوسرے فقرے کے الفاظ لائیں۔

مسجع کی طرح اس میں دونوں فقروں کے الفاظ ہم وزن ہوں۔

مرصع اور مسجع میں صرف آخری حرف کی موافقت کا فرق آتا ہے۔

نثر عاری

یہ نثر وزن قافیہ وغیرہ کی قید سے آزاد ہے اور اردو نثر کے ہر شعبہ میں نثر عاری نے اپنا کمال دکھایا ہے آج یہ نثر سب کی پسند ہے۔

معنی کے لحاظ سے نثر کے اقسام

معنیٰ کے لحاظ سے نثر کی دو قسمیں ہیں ایک دقیق اور دوسری سلیس ان دونوں قسموں نے بھی خود کو سادہ اور رنگین میں ڈھالا۔ اب ان کی قسمیں اس طرح ہیں:

۱۔ دقیق سادہ
۲۔ دقیق رنگین
۳۔ سلیس سادہ
۴۔ سلیس رنگین

مذکورہ اقسام پر فارسی نے غلبہ جمائے رکھا۔ عہدِ جدید میں نثر کی تقسیم مفاہم کے اعتبار سے کی گئی ہے جس کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ وضاحتی یا توضیحی نثر = وضاحت، ترتیب، استدلال، ایجاز، بلاغت اسکی پانچ خصوصیات ہیں۔

۲۔ بیانیہ نثر = کسی واقع شے یا شخص کا فرضی یا حقیقی بیان۔

۳۔ انانیتی نثر = خود نوشت اور روز نامچے اسی کے دائرے میں آتے ہیں۔

۴۔ تاثراتی نثر = اسمیں خالق اپنے محسوسات کو قلم بند کرتا ہے۔

اہمیت اور اہلیت کے اعتبار سے نثر کے تین حصے:

۱۔ تخلیقی نثر
۲۔ غیر تخلیقی یا کاروباری نثر
۳۔ خالص علمی یا استدلالی نثر

تخلیقی نثر

تخلیقی نثر تشبیہات، استعارات، تلمیحات، محاورات، ضرب الامثال مترادفات رعایت لفظی، ایمایت اور رمزیت وغیرہ سے رنگینی پیدا کی جاتی ہے یہ بھی دو روپ لے لیتی ہے شاعرانہ اور خطبانہ۔

غیر تخلیقی یا کاروباری نثر

غیر تخلیقی یا کاروباری نثر کو روزمرہ کے کاموں میں جیسے۔ تذکرے، ڈائریاں، خطوط اخبارات وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں۔

خالص علمی یا استدلالی نثر

اس نثر کو عہد جدید میں سائنٹفک مانا گیا ہے۔ یہ ابہام اور مبالغہ وغیرہ سے پاک ہوتی ہے یہ علمی نثر بھی کہلاتی ہے۔

تحریف روی

ڈاکٹر صابر صاحب فرماتے ہیں:

''اگر ایک قافیہ میں (الف) ہو اور دوسرے میں ہائے مختفی تو شعرا عام طور پر ہائے مختفی کو الف سے بدل دیتے ہیں صرف مطلع کی حد تک نہیں بلکہ پوری غزل یا قصیدے میں جہاں بھی ہائے مختفی پر قافیہ ختم ہوا سے الف سے بدل لیا جاتا ہے۔ مثنوی کی ابیات میں بھی اس کی پابندی کی جاتی ہے اور اس کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔''

جیسے: ''انجانا'' کا قافیہ اگر ''دیوانہ'' ہو تو دیوانہ کی ''ہا'' کو الف سے بدل کر ''دیوانا'' لکھتے ہیں اور ایسا کچھ بے سبب نہیں کرتے فن کی کتابوں میں نہ صرف اس کی اجازت ہے بلکہ اساتذہ اپنے شاگردوں کو اسکی ہدایت دیتے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے اس پر تجربہ کر کے دیکھا کہ یہ طریقہ صحیح ہے یا غلط اس کی جواز کے جو موئد ہیں ان میں چھ حضرات کو انکے دلائل کے ساتھ زیر بحث لیا ہے جن میں شوق نیموی کا جواز پیش کرتے ہیں۔

''ہامختفیہ کے بعد اگر کوئی حرف معنوی نہ ہو تو اس ''ہے (ہ)'' کو الف سے بدلنا جائز ہے۔

ناسخ: گھر میرا فرقت میں سونا ہو گیا ۔۔۔ کنج مدفن کا نمونا ہو گیا

دوسرے صاحب خورشید لکھنوی کا حوالہ دیتے ہیں جنھوں نے اپنی ''افادات'' میں یوں فرمایا ہے:

''بعض قوافی ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں کوئی حرف اور سوا روی کے نہیں ہوتا اور اختلاف اسکا کسی طرح کا جائز نہیں گو، بحریں قریب المخرج کیوں نہ ہو۔''

تیسرا حوالہ مرزا محمد عسکری کا دیا ہے جو آئینہ بلاغت میں اسطرح درج کرتے ہیں:

''تحریف روی: یعنی حرف روی کا کسی ایسے حرف سے بدل جانا جو قافیہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہو یعنی کانوں کو چنداں برا نہ معلوم ہو۔

89

جیسے۔ ''سیب کا سیوٗ'' ''جد کا تدٗ'' کر دینا۔
سیو کا قافیہ''ریوٗ'اور جد تد کا قافیہ حد سے ہو جائے۔

مثال: عجب نہیں ہے جو جانے نہ میرؔ چاہ کی ریت سنا نہیں ہے مگر یہ کہ جو گی کس کے میت
ہزار شانہ و مسواک، غسل شیخ کرے ہمارے عندلے میں تو ہے وہ خبیث و پلیت

ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ صحیح لفظ پلید ہے مگر بضرورت قافیہ کے (د) کو (ت) حرف میں بدل کر پلیت لفظ لاتے ہیں جبکہ ڈاکٹر صاحب اس میں املا کا عیب مانتے ہیں۔

☆ جہانگیر لغات میں پلیت اور پلید دونوں الفاظ درج ہیں اور دونوں کے معنی گندہ۔نجس۔خراب ناپاک کے ہیں۔

چوتھے صاحب عنوان چشتی کی طرف توجہ دلائی ہے (جو عروض اور فنی مسائل) اردو سماج نئی دلّی 905 کے صفحہ 86 پر رقم طراز ہیں۔

''تحریف روی میں حرف روی باقی رہتا ہے بلکہ لفظ کا املا تبدیل کر کے حرف روی کی تخلیق کی جاتی ہے اس لئے یہ اعتراض تو کیا جا سکتا ہے کہ ضرورت شعری کے تحت لفظ کی اصل شکل کو تبدیل کیا ہے لیکن قافیہ کے نقطہ نظر سے اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا ہے۔''

☆ جہانگیر اردو لغت (جامع ترین) صفحہ 284

اگر کتب بلاغت پر غور کریں تو یہ ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ بضرورت قافیہ حرف روی تبدیل ہو جائے تو وہ تحریف روی ہے اگر یہ صحیح ہے تو (مے خانہ) کا (مے خانا) تحریف روی ہوگا۔

اب اسکو خامی تسلیم کیا جائے یا خوبی ڈاکٹر صاحب نے سوق نیموی کے حوالے سے بتایا ہے۔

(نون اصلی کے ساتھ نون تنوین قافیہ میں بعض جگہ آیا ہے) جس کی مثال یہ ہے۔

جیسے۔

یار من من کے بگڑ جاتا ہے
کام بن بن کے بگڑ جاتا ہے
یہ نراڈر ہے کہ بوسوں کا کھیل
ادبًا بن کے بگڑ جاتا ہے

قید اپنا وہ آپ پرفن تھا
حلقہ زلف طوق گردن تھا
عذر مانع نہ تھا کوئی تسلیم
ترک شعر و سخن یہ قصداً تھا

شوق نیموی اس قسم کا تقفیہ معیوب مانتے ہیں اس وجہ سے ڈاکٹر صاحب متعجب ہیں کہ اس کو اختلاف روی کیوں نہ مانا گیا۔

ڈاکٹر صاحب اس بحث میں پانچویں ہستی شمس الرحمٰن فاروقی کو شامل کرتے ہیں جنھوں نے اس طرح فرمایا ہے:

''ایسے الفاظ جو چھوٹی (ہ) پر ختم ہوتے ہیں اور اکثر انکا قافیہ الف والے الفاظ کے ساتھ کیا جاتا ہے تو ایسی صورت میں چھوٹی (ہ) والے لفظ کو الف سے لکھا جائے یا نہیں مثلاً عمدہ۔شیشہ۔فریفتہ جیسے الفاظ کو پیدا۔دینا۔سزا جیسے الفاظ کا قافیہ کیا جائے تو کیا عمدہ کو عمدا شیشہ اور فریفتہ کو فریفتا لکھا جائے۔''

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ پرانے خیال کے لوگ اس رائے کو درست مانتے ہیں کہ املا پر قافیہ نہیں ہو سکتا، بنیادی اصول کے خلاف ہے۔

اگر ایسا ہے تو (خاص) کو (س) کے ساتھ لکھ کر آس قافیہ کیوں نہ کر لیا جائے اس سلسلہ میں علامہ شاداں بلگرامی نے بھی اپنا موقف بیان کر دیا۔وہ لکھتے ہیں:

اگر چھوٹی (ہ) پر ختم ہونے والے الفاظ کا قافیہ (الف) پر ختم ہونے والے الفاظ سے کیا جائے تو املا بدلنے کی ضرورت نہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا ماننا ہے فاروقی صاحب کی یہ رائے بالکل درست ہے جس کے مؤدفن شاعری کے ماہر علامہ شاداں بلگرامی بھی ہیں۔ڈاکٹر صاحب فاروقی صاحب کی اس رائے کو بھی درست مانتے ہیں کہ شاعری میں تلفظ اور تاریخ گوئی میں کتابت کا اعتبار ہوتا ہے (ہا) اور (الف) کا تلفظ یکساں ہے۔

قافیہ میں (ہا) مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ کو الف سے لکھنے پر کیا غلط نتائج سامنے آسکتے ہیں انکو ڈاکٹر صاحب نے خود ساختہ اشعار سے بتایا ہے ملاحظہ فرمائیں:

جو ہر قابل کو پہنچانا نہیں
کوئی بھی اس بزم دانا نہیں
مات تم شیطاں سے کھانا نہیں
ہاں فریب نفس میں آنا نہیں
فائدہ کیا اس جگہ پر کیوں رہیں
ڈھونڈنے پر بھی ملا دانا نہیں
اے عزیزوں! طالب دولت ہو تم!
پاس اس نادار کے آنا نہیں

ان اشعار میں (دانا) اور (آنا) قافیے آئے ہیں اور ابہام بھی خوب پیدا ہو گیا ہے جو (ہا) مختفی کو الف میں بدلنے کا نتیجہ ہے۔تفہیم میں ایسی دشواریاں کہ حل ہی نہ ہوں۔

دانا = عقل مند اور دانہ = قطرہ یا ایک عدد

پہلے اور تیسرے شعر کے دوسرے مصرے میں ''دانا'' اور دوسرے و چوتھے شعر کے دوسرے مصرعوں میں ''آنا'' پر غور کریں۔

کیونکہ پہلے اور تیسرے اشعار میں دانا کا مطلب غذا کا ایک عدد ہے یا عقل مند ہے؟ دوسرے اور چوتھے اشعار میں ''آنا'' کا مطلب 1/16 روپے ہے یا مصدر ہے؟ اس میں آپ نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ (ہا) مختفی کو الف سے بدلنے پر تفہیم میں دشواری پیدا کرنا اور اور تحریف روی کے جرم کا مرتکب ہونا ہے۔

کچھ ایطا کے بارے میں

ڈاکٹر صاحب نے گوہر شیخ پوری کے خط کے جواب میں پانچ اساتذ ہ سخن کے خطوط سے نو نکات نکال کر ان کی تنقیح کی ہے جو جولائی تا دسمبر 1995ء سہ ماہی ''ابر'' بدایوں کے شمارے میں شائع ہوئے تھے۔

نکات کی فہرست یہ ہے:

۱۔ ایطا اگر عیب ہے تو مطلع کے ساتھ اس کی تخصیص غلط ہے ہر جگہ عیب ہونا چاہیے۔

۲۔ ایطا کا تعلق اندھی تقلید سے ہے۔

90

۳۔ مطلع میں ''تھمی'' اور ''صدی'' کے قافیہ درست ہیں ان سے شعر میں کو نقص پیدا نہیں ہوتا۔

۴۔ ایطا سے شعر میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

۵۔ دونوں قوافی سے روی نکالنے پر اگر دونوں لفظ با معنی بچیں تو اس کو ایطا کہنا بے تکی بات ہے۔ یہ شرط مہمل ہے۔

۶۔ ایطا کوئی عیب نہیں یہ خواہ مخواہ کا روڑہ ہے۔

۷۔ داغ اسکول کے بہت سے شعرا اس عیب کے قائل نہیں۔

۸۔ قافیہ مختلف زبانوں کے ہوں تو ان میں ایطا نہ ماننا بے اصولی کی بات ہے۔

۹۔ حرف روی کو ہٹا کر یہ دیکھنا کہ لفظ بے معنیٰ بچے غلط نقطہ نظر ہے کبھی کبھی حرف روی یا علامت مشترک ہٹانے پر بھی کسی نہ کسی زبان کا با معنی لفظ مل ہی جاتا ہے۔

۱۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ مطلع غزل کی بنیاد ہے اور اسی میں قوافی کا تعین ہوتا ہے اگر مطلع میں قافیہ غلط ہونگے تو لازمی طور پر ایطا ہوگا ہاں یہ الگ بات ہے کہ مطلع کے علاوہ دیگر جگہ یہ کمی ہو تو اسکو کوئی اور نام دے دیا جائے۔ ظاہر ہے قوافی بنیاد ہوتی ہے جو مطلع میں طے ہوتی ہے اگر بنیاد خراب ہے تو بلڈنگ خراب ہی تیار ہوگی اور عیب آخر عیب ہوتا ہے وہ کہیں بھی ہو۔

۲۔ جن سے غلط اور صحیح ظاہر ہو جائے ان اصولوں کو ماننا اندھی تقلید کیونکر ہوگی اگر ماہرین کے ذریعہ بنائے گئے قوانین سے باہر ہو کر شاعری کی جائے تو یہ بات کہنا درست ہوگی اور نہ تو اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ والا طریقہ ہوگا پھر تو جو جس نے فرما دیا وہ اسکا بہترین کلام ہوگا۔

۳۔ تھمی اور صدی کو درست قافیہ تسلیم کر لیا جائے تو حرف روی کے اصولوں میں زلزلہ پیدا ہو جائے گا کیونکہ زائد حرف (ی) کو الگ کر کے دیکھیں تو تھم کی (م) اور صد کی (د) حرف روی کے اصول پر نہیں ہے اگر مذکدہ بالا قوافی کو صحیح مانا جائے تو کیا میرے اس مطلع کو صحیح تسلیم کیا جائے گا جو صرف مثالی ہے۔

یوں تو مدت سے سوچتا ہوں میں
نہ کھلا یہ کہ کیا ہوں میں
(الف)

قافیہ ''سوچتا'' اور ''کیا'' میں سے حرف روی نکال کر دیکھیں تو (سوچت) اور (کی) دونوں مہمل ہیں۔

۴۔ چوتھے نکتے کا جواب آگے ایک غزل ہے۔

۵۔ پانچویں نکتے کا جواب اس شعر سے مل سکتا ہے:

دل مردہ کا عالم کچھ ایسا ہوتا ہے
چراغ گور غریباں میں جیسے جلتا ہے

قافیہ۔ ہوتا اور جلتا۔ سے علامت مشترک (تا) کو الگ کر کے دیکھیں تو دونوں الفاظ با معنیٰ ہیں مگر باہم مقفیٰ نہیں تو کیا یہ ایطا نہیں۔

چھٹی بات کے جواب میں ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں تکرار قافیہ بلا شبہ عیب ہے اگر ایسا نہیں ہے تو اقوا یا اکفا یا شترگربہ بھی دائرہ عیب میں نہیں اور ایطا عیب نہیں تو آگے درج میری غزل کو بنا عیب کی کہی جا سکتی ہے۔

۷۔ ساتویں بات کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی کے انکاری یا سہل پسندی ہونے سے حقیقت کا وجود ختم نہیں ہو جاتا۔ کچھ لوگ خدا کے وجود کے انکاری ہیں تو کیا یہ حقیقت نہیں؟

۸۔ آٹھویں نکتے کا خلاصہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ کلیہ طور سے یہ نہیں مانا جا سکتا کہ مطلع میں قافیہ اگر دو مختلف زبانوں کے ہوں تو ایطا داخل نہیں ہوگا بلکہ دو مختلف زبانوں کے جمع الفاظ کو مطلع کا قافیہ بنایا جائے اور قافیہ کی جمعیں ایک طرز پر بنی ہوں تو ایطا داخل ہو سکتا ہے جیسا کہ آٹھواں نکتہ جو اخذ کیا ہے وہ اس طرح ہے۔

''قافیہ'' مختلف زبانوں کے ہوں تو ان میں ایطا نہ ماننا بے اصولی کی بات ہے۔''

مطلب اگر قافیہ مختلف زبانوں کے ہونگے تو ایطا ضرور ہوگا اگر ایطا نہ ماننا تو یہ بے اصولی کی بات ہے۔

شفیق رضوی۔ عماد پوری ''رکن عروض'' نامی پریس لکھنو 1992ء کے صفہ 29 پر لکھتے ہیں:

''مطلع غزل میں دو قافیوں کا آنا لازمی ہے اگر دو زبانوں کے لفظ ہوں ایطا یک قلم نہیں آ سکتا۔''

ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں کہ اگر مطلع میں دونوں قافیہ مختلف زبانوں کے ہوں تو صرف روی میں کسی قسم کا دھوکا نہیں ہوتا عموماً قافیوں میں آخری ایک حرف مشترک ہوتا ہے۔ ایطا سے بچنے کا یہ اچھا طریقہ ہے لیکن اس میں احتیاط شرط ہے اگر دونوں کی جمعوں کو قافیہ بنایا جائے اور جمعیں کسی ایک طریقہ پر بنائی گئی ہوں تو ایطا ضرور داخل ہوگا۔

مثال:۔ اردو کی جمعیں - نظریں - آنکھیں
فارسی کی جمعیں - چوکیات - کاغذات

اس لئے اس کی احتیات ضروری ہے کہ مختلف زبانوں کے قافیہ بناتے وقت جمعیں ایک ہی طرز پر نہ ہوں۔

دوسری مثال ان دو مطلعوں سے:

یوں تو مدت سے سوچتا ہوں میں
دل فردہ کا عالم کچھ ایسا ہوتا ہے
نہ کھلا یہ مگر کے کیا ہوں میں
چراغ گور غریباں میں جیسے جلتا ہے

ایسا ان دونوں مطلعوں کے چاروں قافیوں میں علامت مشترک ہٹانے پر کیا حاصل ہوتا ہے ملاحظہ فرمائیں:

قافیہ
علامت مشترک
قافیہ کا لفظ بچا
سوچتا
الف
سوچت
کیا
الف
کی
ہوتا
تا
ہو
جلتا
تا

ISSN 2321-1601,RNI UPURD/2016/67444

91

جل
چاروں الفاظ با معنیٰ ہیں تو کیا ایطا نہیں ہے اب ذرا پوری غزل ملاحظہ فرمائیں۔
غزل
دل فردہ کا عالم کچھ ایسا ہوتا
+
چراغ گورغریباں میں جیسے جلتا
جسے بھی دیکھیے وہ ہے غرض کا دیوانہ
+
جو اہل ظرف ہے ہمیشہ اوروں کے کام آتا ہے
اگر سیاہ ہے قسمت مری تو ہے یہ سبب
+
دل وجگر سے دھواں سا اٹھتا ہے
دکھانہ دل کو جوانی کا تذکرہ کرکے
+
گزر گیا زمانہ کہیں پلٹتا ہے
رواں ہے نوک قلم سے لہو جگر مرے
+
جراحتوں کا مفصل بیاں لکھتا ہے
اگر چہ عقل سے عاری ہے پر یہ دیوانہ
و
جو بات کوئی نہ سمجھے اسے سمجھتا ہے
جو یاد آتا ہے عہد شباب بھولا ہوا
+
تو ناگ بن کے میرے ذہن ودل کو ڈستا ہے
تمہارے حسن کا شیدائی کھو چکا سب کچھ
+
بچا نہ کچھ تو اب آنکھوں کی نیند کھوتا ہے
تیرے فراق کا صدمہ سہا نہیں جاتا
+
اگر چہ دل پہ ہزاروں ہی رنج سہتا ہے
عجب ہے عشق بازی ہر اک نہیں سمجھتا
+
جو ہارا عشق میداں میں وہ جیتا ہے
نہ دیں تسلیا احباب کچھ نہیں حاصل
+
مرض ہے دل کا یہ گھٹتا نہیں بڑھتا ہے

مذکورہ بالا غزل میں اگر ایطا ہے تو اس کی بنیاد مطلع سے ہی پڑ گئی اور اس سے ایطا کو عیب تسلیم نا کرنے والوں کے خیالات کی تردید کا جائزہ بھی ہو گیا۔
چند نکات جو ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں تھے ان کو بھی انھوں نے اسطرح لکھا ہے:

تکرار قافیہ ایطا ہے مگر ہر موقع پر نہیں۔
جب تکرار قافیہ ہو اور معنیٰ الگ الگ ہوں تو ایطا نہیں مانا جاتا۔
لیکن صفت تجنیس اپنے حسن اور چمک سے ایطا کو دبا دیتی ہے
(ماہرین کے ضابطوں کے مطابق یہ ایطا ہے)

شمشیر کو اپنی جب جلا دے
سو فتنہ مردہ کو جلا دے

پہلے جلا کا مطلب مانجھنا دوسرے جلا کا مطلب زندہ کرنا ہے۔
اسی سے مطلق ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ تکرار قافیہ ایطا ہوتا ہے۔
مگر کچھ موقعوں پر نہیں جب تکرار قافیہ ہوں اور معنیٰ الگ الگ ہوں۔
جیسے جلا بامعنی مانجھنا اور جلا بامعنی زندہ کرنا چونکہ یہاں صنعت تجنیس نے اپنے حسن اور چمک سے ایطا کو دبا دیا مگر ماہرین ایطا نے جو ضابطے طے کئے ہیں اس حساب سے ایطا ہے۔

شمشیر کو اپنی جب جلا دے سو فتنہ مردوں کو جلا دے

(اصلاح سخن) محمد عبدالعلیٰ سوق سندیلوی ، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو صفحہ 51 کے حوالے سے حکیم سید حسن مرتضیٰ شفیق رضوی عماد پوری نے اس شعر پر اصلاح دی کہ

غضب ہوا دل صبر آزما نے لوٹ لیا
فریب دے کے مجھے رہنما نے لوٹ لیا

(قافیہ- رہنما اور صبر آزما میں ایطا ہے) اس بات کی وضاحت ڈاکٹر صاحب نے یوں کی ہے کہ اس شعر میں ایطا ہے اس کا فیصلہ بعد والے اشعار سے ہوگا اگر حرف روی الف کو ہٹا کر بعد کے اشعار میں وہ سب حروف مشترک نہ رہے تو ایطا ہے ورنہ نہیں۔

☆☆☆

92

ڈپٹی نذیر احمد اور تانیثیت

ہلال احمد کمہار
پتہ: ریسرچ اسکالر یونی ورسٹی آف حیدرآباد
رابطہ: 959613175

تانیثیت ایک ایسی تحریک اور نظریہ ہے جس کے ذریعے معاشرے کے ہاتھوں مظلوم خواتین کی دردناک زندگیوں اور اس کے بے شمار مسائل کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ درحقیقت اس نظریے کے تحت سماجی، سماجی، سیاسی، معاشی اور تعلیمی سطحوں پر مرد اور عورت کے درمیان صنفی تفریق کے خلاف احتجاج کیا جاتا ہے اور اس تحریک کا بنیادی مقصد خواتین کے جائز حقوق کی بحالی ہے۔ یہ تحریک مغربی ممالک کے زیر اثر ہندوستان پہنچی اور جلد ہی یہاں کی مختلف زبانوں اور ادب پر اپنے دیر پا اثرات چھوڑے۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور بھی یہ تحریک معاشرے میں مظلوم خواتین کے حقوق اور برابری کے لیے سرگرم عمل ہے۔ اردو ادب میں بالخصوص اردو ناول میں تانیثی نظریات ورجحانات کے گہرے نقوش ملتے ہیں اور فکشن کے علاوہ اردو ناولوں میں بھی عورت کو معاشرے کے ایک زندہ جاوید اور بیدار کردار کے طور پر پیش کیا گیا اور اس کی زندگی کے تمام حالات ومسائل کو بیان کیا گیا۔ ناول نگاروں نے پسماندہ طبقے بالخصوص خواتین کی زبوں حالی اور کسمپرسی کے گڈھے سے نکالنے کے لیے اس کی زندگی کے تمام تر حالات ومسائل مثلاً سماجی، تعلیمی ومعاشی حیثیت، شادی بیاہ، طلاق وبیوگی وغیرہ کو موضوع بحث بنایا۔ اردو ناول میں تانیثیت کی ایک مستحکم روایت ملتی ہے۔ ویسے تو ترقی پسند تحریک کے قبل ہی سے اردو ناول میں عورتوں کے مسائل کی صدائے بازگشت سنائی پڑتی ہے۔ اگر ہم اس ہمہ گیر تحریک کے بعد اردو ناولوں میں تانیثی فکر وعمل کا جائزہ لیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ مرد اور خواتین قلم کاروں کی ایک بڑی جماعت ہے جس نے عورتوں پر ڈھائے گئے ظلم وستم کے خلاف اپنی تیز تر آواز بلند کی۔ ڈپٹی نذیر احمد سے رُسوا تک جتنے بھی نسوانی کردار پیش کیے گئے ہیں وہ آج تک ہمارے ذہن میں ایک نقوش کی صورت ثبت کر گئے ہیں۔ ان ناول نگاروں نے عورتوں کے درد وغم لاچاری، بے بسی کے علاوہ ان کی سماجی صورت حال اور معاشی بدحالی کو بہ خوبی اپنے ناول میں پیش کیا ہے لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس عہد کے ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کے ذریعے عورت کے ایک خاص صورت میں پیش کیا ہے جس میں وہ اپنے اوپر ہو رہے سارے ظلم وستم کو برداشت کرتی نظر آتی ہے۔ وہ مرد غالب سماج کے خلاف کوئی احتجاج اور بغاوت نہیں کرتی ہے بلکہ وہ اپنے عورت پن پے خاموشی سے آنسوں بہاتی نظر آتی ہے۔ البتہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو ادب لکھا گیا اس میں کسی حد تک عورتوں کے مسائل اور نفسیات کو پرکھنے اور محسوس کرنے کے طریقے میں تبدیلی آئی ہے؛ اور سعادت حسن منٹو، راجیندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی کی تخلیقات کو اسی فہرت میں رکھا جا سکتا ہے، جنھوں نے انتہائی دردمندی اور بے باکی کے ساتھ عورتوں کی ذلت بھری زندگی کو بیان کیا ہے جس کی بنا پر ہے ان فنکاروں کا یہ رویہ اس عہد میں روایت سے بغاوت کا درجہ کے طور دیکھا جاتا تھا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ عورتوں کے جائز حقوق، ان کے مسائل اور سماج میں اُن کی پسماندگی کو سب سے پہلے جن لوگوں نے موضوع بنایا وہ خواتین نہیں مرد ادیب تھے۔ انیسویں صدی کے اختتام کے بعد اردو ادب میں خواتین کے معاشرتی مسائل اور ان کی مجبوریوں کو موضوعات بنایا گیا۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ سر سید احمد خاں جیسے مصلح کار نے بھی عورتوں کی تعلیم سے اختلاف کیا تھا۔ مگر مولانا حالؔی اور سیماب اکبرآبادی عورتوں کی تعلیم کے حامی تھے۔ مولوی نذیر احمد اردو کے وہ پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اپنے عہد کے خاندانوں میں رائج ظالمانہ اور جاہلانہ رویوں کے خلاف اپنا قلم اٹھایا۔ ترنم ریاض ایک جگہ رقم طراز ہیں:

> ''دلچسپ بات یہ ہے کہ اس دور میں خواتین ادیبوں کے تحریروں کا ایجنڈا کسی خاتون نے نہیں، بلکہ ایک مرد نے تیار کیا وہ شخصیت ہیں ڈپٹی نذیر احمد جنھوں نے مراۃ العروس میں اصغری کے کردار کے ذریعے ایک رول ماڈل تیار کیا اور یہ رول ماڈل اردو ادب میں خاصی دیر تک ڈولتا رہا، اصغری کا کردار، جو دینی علوم کے علاوہ دُنیاوی علوم تاریخ، سائنس جغرافیہ اور جنرل نالج سے مالا مال تھا مسلمان اردو دان طبقے میں ایک ماڈل کی حیثیت سے تقریباً آدھی صدی تک مقبول رہا۔'' (خواتین اردو ادب میں تانیثی رُجحان، مشمولہ ''شاعری'' (ممبئی شمارہ ۱۱، ۲۰۰۳ء) صفحہ نمبر ۳۴(۱)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تانیثی نقطہ نظر سے اردو ناول میں تانیثیت کے اولین مگر دھندلے نقوش ہمیں نذیر احمد کے ناولوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے عہد میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ خواتین کی اصلاح وتربیت اور ان کی زندگی کے المناک پہلوؤں کو پیش کرنے کا شروعاتی فریضہ انجام دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاحِ خواتین کے لئے مغربی طرز تعلیم وتہذیب کی تبلیغ کرنے کے بجائے مشرقی طرز فکر کو اختیار کیا، ان مظلوم، حساس عورتوں کو قوت اور قوتِ تحریک عطا کی جو ایک طویل مدت سے مرد غالب بالا دستی کی محکومیت کو برداشت کرتی آرہی تھیں۔ ایسے ماحول میں انھوں نے ناول لکھا جہاں ناول لکھنا تو دور کی بات پڑھنا بھی اچھا نہیں مانا جاتا تھا۔ نذیر احمد نے عورتوں پر بہت بڑا احسان کیا کہ انہیں اپنے حقوق اور تہذیب وشائستگی سے سرفراز ہونے کی راہ دکھائی۔

93

اردو ناول میں تانیثیت کے حوالے سے جن مرد وخواتین ناول نگاروں نے لکھا ہے ان میں ڈپٹی نذیر احمد کے علاوہ پنڈت رتن ناتھ سرشار،عبدالحلیم شرر،راشدالخیری،مرزا محمد ہادی رسوا،پریم چند ،راجیندر سنگھ بیدی،قاضی عبدالغفار،صغریٰ ہمایوں مرزا،نذر سجاد حیدر،رضیہ سجاد ظہیر،عصمت چغتائی،قرۃالعین حیدر،بانو قدسیہ،جیلانی بانو،خدیجہ مستور،جمیلہ ہاشمی،واجدہ تبسم،رضیہ فصیح احمد،رضیہ بھٹ،بشریٰ رحمن،صغرمہدی،ترنم ریاض،ثروت خان،سلطانہ مہراور فرید رحمت اللہ وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں صرف اردو کے پہلے ناول نگاراور تانیثیت کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔

ڈپٹی نذیراحمداردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنہوں نہ صرف اردو میں ناول نگاری کی داغ بیل ڈالی بلکہ ابتدائی تانیثی رجحانات کو بھی زیرقلم لایا ہے۔نذیراحمد کئی اعتبار سے اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ملکی سطح پرتغیر پذیر حالات اوران سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنا پہلا ناول ۱۸۶۹ء میں ''مرۃالعروس'' کے نام سے لکھا جس کا براہ راست تعلق عورتوں کی اصلاح اور ان کی بہتر تعلیم وتربیت سے ہے۔نذیراحمد کے ناولوں میں ''مرۃالعروس''،''بنات النعش''، ''توبۃالنصوح''،''ابن الوقت''،''فسانہٗ مبتلا''،''ایامیٰ''،''رُویائے صادقہ''وغیرہ جیسے ناولوں میں تانیثی نقوش کا پتا چلتا ہے یہاں تک کہ آج جدید دور کے ناولوں میں بھی عورتوں کے تعلق سے جتنے بھی بحث ومباحثے ہوتے ہیں اگر دیکھا جائے تو کہیں نہ کہیں نذیراحمد کےعورتوں کے تیئں تانیثی افکارو نظریات کی ایک چھاپ نظر آتی ہے۔نذیراحمد نے اس دور میں تانیثیت پر اپنی قلم اُٹھائی جب ایک تخلیق مرد لیڈران پر بھی قلم اُٹھانے میں ہچکچاتے تھے۔ایسی صورت میں نذیراحمد نے پہلی دفعہ عورتوں کے مسائل اوراُن کی خراب صورت حال پر اپنی نظر مرکوز کی بقول جس کی تائید کرتے ہوئے علی احمد فاطمی رقم طراز ہیں۔

> ''نذیراحمد نے اردو میں پہلی بار ناول کی صنف کو روشناس کرایااور پہلی بار مسلمانوں کے متوسط گھرانوں کے روزمرہ کی زندگی ،تربیتی مسائل اور بالخصوص عورتوں اور لڑکیوں کے تہذیبی وتعلیمی مسائل پر روشنی ڈالی۔کسی ناول میں بیوہ کا مسئلہ کسی میں شادی کا مسئلہ اور کسی میں ہنرمندی کے مسائل کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا اور حد یہ کہ ہریالی کے کردار میں نذیراحمد نے طوائف کو بھی بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔''(علی احمد فاطمی ''تحریک نسواں اور اردو ادب''،''مشمولہ:نئی تنقید نئے اقدار،از:علی احمد فاطمی،(سرسوتی آفسیٹ پریس الہٰ باد۱۹۹۹،صفحہ نمبر ۴۷)(۲)

نذیراحمد نے اپنے پہلے ناول'مراۃالعروس' میں نہ صرف عورت کو ایک پڑھی لکھی،سلیقہ داراورفہم وادراک کی حامل بتایا ہے بلکہ اس کےفیض صحبت سے محلے کی عورتیں بھی انتہائی سلیقہ شعار ہوجاتی ہیں کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔اس ناول میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اصغری ایک ایسی عورت ہے جو اپنے شوہر کو حصولِ علم کا شوق دلاتی ہے،اس میں حوصلہ پیدا کرتی ہے۔اپنے شوہر کی اصلاح کے بعد اصغری ایک ہمدرد بہو کی طرح سیالکوٹ سسرال جاتی ہے۔اورانہیں یہ مشورہ دیتی ہے کہ وہ بزرگی کے باعث پنشن لے کر گھر میں آرام کریں اوران کے بدلے اپنے بہنوئی محمد عاقل کو نوکری دلوانے میں کامیاب ہوتی ہے۔اصغری جیسے بہترین نسوانی کردار کے ذریعے نذیراحمد نے مرد کی زندگی میں عورت کی اہم شخصیت کو منوایا ہے۔

نذیراحمد کو اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ تانیثی مفکر اور حقوق نسواں کے علمبردار ہونے کا شرف حاصل تھا اس لیے انھوں نے سماج کے کمزور طبقات بالخصوص خواتین کی پستی اور زبوں حالی کے ان بنیادی مسائل کو اپنے ناول میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے جو مسائل عمومی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھے'ناول' مراۃالعروس' میں وہ عورتوں کے سماجی بے قدری پر ایک جگہ ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں۔:

> ''عام دستور کے موافق ہم عورتوں کو کچھ قدر دیتے نہیں۔ خانہ داری کے برتاؤ میں دیکھوتو گھریلو خدمت کے علاوہ کوئی عمدہ کام بھی عورتوں سے نہیں لیا جاتا ہے۔اور نہ ہی کسی عمدہ کام کے اصلاح ومشورے میں عورتیں شریک ہوتی ہیں ۔''(نذیر احمد'مراۃالعروس'(جمال پرنٹنگ پریس دہلی)سن ندارد،صفحہ نمبر ۲۵)(۳)

یعنی بقول نذیراحمد اس زمانے میں عورتوں سے کوئی صلاح مشورہ نہیں لیا جا تا تھا۔اورامورخانہ داری پر بھی انہیں کچھ خاص اختیار حاصل نہیں تھا بلکہ وہ بے بس اور مجبور کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔نذیراحمد کو اس بات کا احساس تھا کہ عورت کے سماجی موقف کو کمتر بنانے کی پوری ذمہ داری مرد طبقے کو جاتی ہے۔اس دور میں عورت کو ہر چیز سے محروم رکھ کر اسے مردوں کے زیر دست رہنے پر مجبور کیا گیا۔مرد طبقے نے اس سلسلے میں سب سے بڑا ہتھکنڈا یہ اپنایا تھا کہ عورتوں کو تعلیم سے دور رکھنے کی بھرپور کوشش کی گئی کیوں کہ مرد طبقہ کو اس بات کا شک وشبہ تھا کہ عورتیں تعلیم یافتہ ہوجائیں گی تو وہ ان سے اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرنا شروع کردیں گی۔تعلیم سے عورتوں کی محرومی کا ایک مایوس کن نتیجہ سامنے یہ آیا کہ عورتیں ہر معاملے میں اپنے آپ کو کمزور پانے لگی۔اور رکردار اکبری کے ذریعے نذیراحمد نے اس کی زبانی یہ دکھایا ہے کہ ٹونے ٹوٹکے کے چکر میں عورتیں کس طرح سے اپنا نقصان کرتی تھی۔اکبری کو نذیراحمد نے ایک عیارخاتون کے دھوکے میں مبتلا کرواکے خلاف عقل اور خلاف شرع حرکتیں کروائی ہیں۔یہ عیارعورت اپنے آپ کو حجن کہتی ہے اور اکبری اس کے جھانسے میں آجاتی ہے۔اور یہ حجن آخرکار اسے ایک دن لوٹ لیتی ہے۔اپنے شوہر کو قابو میں کرنے کے لئے اکبری کی حرکات ملاحظہ ہوں:

> ''مزاج دار بہو نے غسل کر کے کپڑے بدلے،خوشبو لگا یا ایک لونگ بسم اللہ کر کے اپنی چوٹی میں باندھی اورمیاں کے پلنگ کی چادر اور تکیوں کے غلاف بدل کر ایک لونگ کسی تکئے

94

میں رکھ دی۔'' (مراۃ العروس، صفحہ نمبر ۷۰) (۴)

صدیوں پرانی رسمیں سماج میں اس قدر گہری پیوست تھیں کہ عورتوں کو اسکی بجا آوری کو لازمی قرار دے دیا گیا تھا چنانچہ عورتوں کو ان سے دوسری طرف رُخ کرنا یا ان کو نہ اپنانے کے لئے کہہ دینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مرد طبقہ اگر چہ انیسویں صدی کے انقلابی تبدیلیوں کا اثر قبول کر رہے تھے۔ مگر خواتین کے دلوں سے یہ شک وشبہ کو دور کرنا بہت دشوار تھا۔ کیوں کہ قدیم روایات کے خلاف قدم اُٹھانے یا پھر اس کے خلاف آواز بلند کرنا ایک طرح سے پدری سماج پر حملہ مانا جاتا تھا اور سماج اس چیز کو بالکل برداشت نہیں کرتا تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے زمانے کی خواتین کی زندگی کا جو خاکہ پیش کیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے شوہروں سے موافقت پیدا کرنے کے گُر سے نا آشنا تھیں۔ اکثر شریف گھرانوں میں میاں بیوی کے درمیان اصل وجہ یہی تھی کی وہ اپنے حقوق وفرائض سے واقف نہیں تھے۔ ناول ''فسانۂ مبتلا'' میں مبتلا کے گھریلو بحران کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس کی اہلیہ ''غیرت بیگم'' اپنے میاں کی مزاج سے واقف نہیں ہے۔ نمونے کے طور پر ''فسانۂ مبتلا'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں نذیر احمد نے عورتوں کے ایک اہم مسئلے پر روشنی ڈالی ہے:

> ''غیرت بیگم کے ساتھ مبتلا کے دل نہ ملنے کا سبب مبتلا کی حسن پرستی اور آوارگی تھی مگر اتنا قصور تو غیرت بیگم کا بھی ضروری تھا کہ اس نے مبتلا کو اپنی طرف مائل کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔ وہ سمجھی جیسا کہ گھر کی اکثر بیبیاں سمجھا کرتی ہیں کہ ماں باپ نے میاں کے ساتھ میں ہاتھ پکڑا دیا تو بس مجھے اپنی طرف سے کچھ کرنا نہیں۔ اب میاں کا کام ہے کہ کما کر لائے مجھے کھلائے پہنائے میری خاطر اور مدارات کرے۔'' (نذیر احمد ''فسانۂ مبتلا'' (استقلال پریس انارکلی لاہور ۱۹۶۰ء) (۵)

نذیر احمد نے اپنے دور کے عورتوں کے مختلف مصائب و آلام کو اپنے ناول میں بیان کیا ہے کہ ان کی ازدواجی زندگی بھی بہت اچھی نہیں تھی۔ گھریلو نظام کی صورتِ حال یہ تھی کہ ایک بازاری عورت ہریالی کو غیرت بیگم کے گھر میں قدم رکھنے کا ایک موقع مل جاتا ہے۔ یہی حال ''مراۃ العروس'' کی اکبری بیگم کی خانہ داری کا بھی ہے، اس کے روپے اور پھوہڑ پن کی وجہ سے اس کا سارا سامان چور چُرا کر لے جاتے ہیں۔ عورتیں چونکہ اپنے فرائض سے بے خبر تھیں اور اپنے شوہروں کا دل کیسے جیتا جائے یہ ہنر ان لوگوں کو بالکل بھی نہیں آتا تھا۔ جس وجہ سے اس دور کی عورتیں اپنے شوہروں کی توجہ کی زیادہ مرکوز نہیں تھیں لہٰذا ایسی صورت میں سماج میں طوائف کاری زیادہ پروان چڑھی، طوائفوں کو زیادہ موقع فراہم ہوئے جس کی وجہ سے مرد اخلاقی گراوٹ اور جنسی راہ روی کا شکار ہوئے، بازاری عورتیں دلوں کو بہلانے کا جو ہنر جانتی تھی وہ گھریلو عورتوں میں نہیں تھی۔ ''فسانۂ مبتلا'' کی ہریالی جو ایک طوائف ہے اور وہ مردوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے سبھی داؤ جانتی ہے۔ نذیر احمد اس کا ذکر ناول میں اس طرح سے کرتے ہیں:

> ''لسانی کے علاوہ اس کا سلیقۂ مجلس بھی بہت دلکش تھا۔ وہ نہایت جلد آدمی کے دل کو ٹٹول لیتی تھی۔ اور ہر ایک کے ساتھ اس کے مزاج کی باتیں کرتی یہ عمل تھا جس کے ذریعے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کرتی تھی۔ ورنہ صورت شکل کے اعتبار سے وہ چنداں قدر کی چیز نہ تھی۔'' (فسانۂ مبتلا، صفحہ نمبر ۱۳۸) (۶)

دراصل نذیر احمد کے نزدیک عورتوں کے پامالی حقوق کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنے شرعی احکامات کا کوئی لحاظ نہ رکھا تھا۔ انھوں نے خواہشات نفس کے مطابق شرعی احکام کی تشریح کی جس کی وجہ سے اس دور میں بیواؤں کی حالت بھی انتہائی بدتر تھی۔ نذیر احمد چونکہ ایک مذہب پرست انسان تھے وہ خود دینی ومذہبی قوانین سے بہت اچھی طرح سے واقف تھے۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ مذہب اسلام میں بیواؤں کو بھی ایک اہم مرتبہ حاصل ہے مگر معاشرے نے انھیں اس حق سے پوری طرح سے محروم رکھ کر ان کی زندگی بدتر بنا دیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی مشہور ومعروف تصنیف ''اُمہات الامت'' میں ہندوستان کی بیواؤں کی زبوں حالی کو عرب خواتین سے مقابلہ کرتے ہوئے بیواؤں کی صورتِ حال کا نقشہ کچھ یوں پیش کرتے ہیں:

> ''اپنے مذہب کو بلائے طاق رکھ کر اوروں کی بہت سی رسمیں اختیار کر بیٹھے۔ اے کاش ستی کی رسم بھی اختیار کر لیتے تو بیوہ عورت چتا پر بیٹھ کر چند منٹ میں جل بھُن کا راکھ ہو جاتی۔ مگر اسلام تو ایسی ظالمانہ رسم کو کیوں کر جائز رکھنے لگا تھا۔ رسموں کی رو سے وہ دوسرا نکاح نہیں کر سکتی۔ گیلی لکڑی کی طرح سُلگ سُلگ کر ختم ہوتی ہے، عرب کی عورتوں کے حق میں ایک چھوڑ کر دوہری سہولتیں تھیں۔ ایک ملکی رواج کے مطابق ایکے بعد دیگرے متعدد شوہروں نے نکاح کرنے کی دوسرے اسلامی شریعت کے عدل کی لیکن ہمارے ہندوستان میں پہلی سہولت کا نام نہیں عورت دوسرا نکاح کرے تو عزت آبرو سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ عورت تو عورت مرد کسی بیوہ سے نکاح کرے تو اس کی اولاد کے یہ نسبت طعنے کی مشکل پڑ جائے۔'' (اُمہات ا لامت، صفحہ نمبر ۳۶) (۷)

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نذیر احمد کو رسم ورواج سے پیدا ہونے والی ان تمام دشواریوں کا شدید احساس تھا کہ جن رسموں کہ وجہ سے قوم کی بہو بیٹیاں انتہائی مایوسی کی زندگی گزارتی تھیں۔ اس طرح وہ اپنے ناولوں کے ذریعے پوری سوسائٹی میں ایک خوشگوار اور پُر فضا ماحول پیدا کرنے کے خواہش مند تھے۔ وہ نہ تو مغربی تہذیب کے رنگ میں اپنے ملک کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو رنگا ہوا دیکھنا چاہتے تھے بلکہ وہ ان کے برابری کی بات کرتے تھے۔ جبکہ اصغری کا کردار نذیر احمد کی اسی خواہش کا جیتا جاگتا نمونہ ہے جس میں ایک مثالی عورت کی تمام اوصاف موجود ہیں جو سلیقہ، تعلیم یافتہ، شرم وحیا کی دیوی اور ہر طرح کے ہنر میں ماہر ہیں۔ فہمیدہ کبیر نے ایک جگہ

95

درست لکھا ہے:

''نذیر احمد کے ناولوں میں جس مثالی عورت کا تصور اُبھرتا ہے وہ دراصل مسلمانوں کے متوسط طبقہ سے وابستہ ہے۔انہیں جاگیر دور کی عورت سے شدید ہمدردی ہے جو مردوں کی ملکیت بن کر رہ گئی تھی، جسے اس لئے جاہل رکھا جاتا تھا کہ مردوں سے مساویانہ حقوق کا مطالبہ نہ کر بیٹھے۔وہ معاشی اعتبار سے مردوں کی دست نگر اور کسمپرسی اور بیچارگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی ۔سماجی زندگی میں اسے کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔نذیر احمد جانتے تھے کی موجودہ حالات میں جو انگریزی تسلط اور تہذیب کی بنا پر پیدا ہوئے ہیں ۔عورت کی بہت سی زنجیریں کاٹنی پڑیں گی تاکہ وہ نئے مسائل سے عہد برآ ہو سکے ۔عورت کی اصلاح کے معاملے میں نذیر احمد کی نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا۔''(فہمیدہ کبیر اردو ناول میں عورت کا تصور (مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی، جولائی ۱۹۹۲ء)صفحہ نمبر ۳۵(۸)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں نظریہ تعلیم نسواں پوری طرح واضح ہے۔وہ تعلیمی نسواں کو وقت اور حالات کی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے اس کے حق میں تھے کیونکہ وہ اس بات سے باخبر تھے کہ ہماری تہذیب وسماجی ترقی تعلیمی نسواں کے تصور کے بغیر مکمل نہں ۔انھوں نے تعلیم نسواں کی شروعات اپنے گھر سے کی اور اپنی بچیوں کو پڑھانے کے لیے خود کتابیں تصنیف کیں جن میں 'مرأۃ العروس' اور 'بنات النعش' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اسکے علاوہ دیگر تصانیف جیسے 'توبۃ النصوح' اور 'موعظہ حسنہ' کا نام خاص طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے یہ بھی تعلیمی اور تربیتی اولاد کے موضوع پر مبنی ہیں۔تعلیم نسواں کے تئیں نذیر احمد کے افکار و نظریات کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کی تعلیمی کے علاوہ اپنی اکلوتی بہو کو بھی تعلیم یافتہ اور ہنر مند بنانا چاہتے تھے۔آج بھی ہمارے سماج میں ایسا بہت ہی کم دیکھنے کو ملتا ہے کہ بہو کو تعلیم دینے کی بات کی جاتی ہو۔اس طرح نذیر احمد نے پہلی مرتبہ اردو ادب میں عورت کی اصلاح اور اس کی بہتر صورتِ حال کی طرف عوام کی توجہ مبذول کروائی ہے ۔اگر یہ کہا جائے کہ نذیر احمد تانیثی افکار و خیالات کے زبردست حامی ہیں تو کوئی بجا نہ ہوگا

-

اودھ کا درخشندہ ستارہ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد

محمد نفیس خاں

پی۔ایچ ڈی ریسرچ اسکالر

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی

7860318924

ویسے تو کائنات میں روزانہ لاکھوں لوگ پیدا ہوتے ہیں اور بہت سے اپنی عمر کو تمام کر کے ہمیشہ کے لیے اس فانی دنیا کو الوداع کہتے ہیں۔ان میں بیشتر ایسے افراد ہوتے ہیں جنکی زندگی مقصد سے خالی رہتی ہے اور صرف اپنی عمر کو گزار کر دنیا کو خیرآباد کہہ دیتے ہیں۔اور پھر ان کے بعد اس دنیا میں ان کا نام لینے والا تک کوئی نہیں ہوتا۔مگر کچھ ایسی بھی ہستیاں ہوتی ہیں جو کہ دنیا کو تو چھوڑ جاتی ہیں۔لیکن لوگوں کے دلوں میں اپنی علمی، ادبی اور سماجی خدمات کے ذریعے اپنی یادیں چھوڑ جاتے ہیں، ان جیسی ہی شخصیتوں میں سے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد بھی ایسی ہی ایک شخصیت کا نام ہے۔جو اپنی علمی وادبی اور سماجی خدمات کی بدولت دنیائے ادب میں ہمیشہ یاد کی جاتی رہے گی، ملک زادہ منظور احمد علمی وادبی گھرانے کے وہ چشم و چراغ ہیں جنھوں نے علم و فضل میں اپنے آپ کو بلند کیا۔ان کا خاندان علم و فضل میں شہرت رکھتا تھا، ان کی پیدائش ضلع فیض آباد میں درگاہ کچھوچھہ شریف کے متصل بھدہنٹر میں ۱۷/اکتوبر ۱۹۲۹ء کو سادات خاندان میں ہوئی ملک زادہ منظور احمد اپنے گاؤں کے نام کو ہمیشہ غیر شاعرانہ کہتے اور سمجھتے رہے۔سید مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی طویل سیاحت کے بعد جب یہاں پہنچے تو منظور کے مورث اعلیٰ ملک الائز محمود احمد نے ان کی میزبانی کا شرف حاصل کیا، ملک زادہ نے اپنی خودنوشت ''رقص شرر'' میں اپنے والد اور دادا کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

''میرے دادا ملک عبداللہ نے بسلسلہ ملازمت اپنا کچھ وقت اعظم گڑھ میں گزارا تھا، جب میں بعد میں اعظم گڑھ میں ملازم ہوا تو لوگوں نے ان کی شرافت اور زہد و تقویٰ کی کہانی مجھ کو سنائی اور بڑی عقیدت اور احترام سے ان کا نام لیا۔ملک عبداللہ کے دو بیٹے غلام محی الدین اور ملک محمود احمد گورکھپور میں ملازم تھے۔''

(رقص شرر)

منظور احمد کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی اس کے بعد باقاعدہ تعلیم کا آغاز ۱۹۴۱ء سوئٹس میموریل اسکول میں داخلہ کے بعد شروع ہوا، یہیں سے ہائی اسکول تک تعلیم مسلسل جاری رہی، ۱۹۴۵ء میں ہائی اسکول کے بعد جارج اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور سے انٹر ۱۹۴۶ء میں کیا، اس سے قبل اسی دوران ادیب ماہر کا

بھی امتحان پاس کیا۔کالج ہی کے زمانے میں بیت بازی اور تقریری مقابلہ اور سالانہ تقریبات میں حصہ لیتے تھے، اور دیگر کالجوں کی ٹیمیں بھی شرکت کرتی تھیں، چنانچہ مجھے بیت بازی کی پہلی ٹیم میں شامل کرلیا گیا تھا، کالج میں ہر سال مشاعرہ ہوتا تھا اور گورکھپور کے بیشتر شعراء شریک ہوتے تھے اور یہی عرصہ اسلامیہ کالج میں میری تعلیمی زندگی کا عرصہ تھا۔اس کے بعد ۱۹۴۹ء میں سینٹا پنڈر یوز کالج سے بی۔اے اور پھر یہیں سے ایم۔اے مکمل ہونے کے بعد گنیش ودیارتھی سماج انٹر کالج میں ایک برس تک مدرس رہے۔اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں جارج اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور میں انگریزی کے لیکچرر ہوئے۔اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ آئے اور اسی دوران ۱۹۶۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں گورکھپور یونیورسٹی میں اردو لیکچرر بنائے گئے اور ۱۹۶۶ء مولانا ابوالکلام آزاد فکر وفن پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔اور ۱۹۶۸ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں لیکچرر ہوئے اور ریڈر اس کے بعد پروفیسر کے عہدے پر پہنچ کر ۱۹۸۳ء میں ملازمت سے سب دوش ہوئے۔

ملک زادہ منظور احمد کا ادبی ذوق گورکھپور میں ان کے استاد شمس لآفاق کی خاص توجہ کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔یہیں سے ان کو مطالعے کا شوق پیدا ہوا اور یہیں کی فضا میں رہ کر بیشتر تعلیم وتربیت ہوئی۔یہاں کی مٹی میں کچھ ایسا اثر تھا کہ جو شخص یہاں کے ماحول میں کچھ دن رہ جائے تو اس کی علمی صلاحیت میں ضرور اضافہ ہوگا۔ ملک زادہ کے زندگی کے اوقات گورکھپور میں بھی گزرا اور ان کی علمی صلاحیتوں میں گراں قدر اضافہ ہوا، اور ان کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ ملک زادہ منظور احمد منفرد اہمیت کے حامل تھے انکی ادبی خدمات کے کئی میدان تھے۔یہ ادیب، شاعر، مقرر، نقاد، نثر نگار، صحافی اور ناظم مشاعرہ وغیرہ پر دسترس حاصل تھی۔ان کی تحریروں اور تقریروں میں جو جاذبیت اور دلکشی، بلاغت اور معنویت تھی وہ عصر حاضر کے لوگوں میں مشکل سے نظر آتی ہے۔انھوں نے استاد کی حیثیت سے اردو ادب میں قدم رکھا۔ناقد کی حیثیت سے ادبی شناخت قائم کی اور ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت پائی۔
(رقص شرر)

ملک زادہ منظور احمد ممتاز ادیب ومعلم ہونے کے علاوہ اردو کے مشہور مجاہد تھے۔گورکھپور میں مجنوں گورکھپوری کی ایما پر انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم کی، سرکاری ناانصافیوں کے تدارک اور اردو کو اس کو جائز مقام دلانے کے لیے اردو رابطہ کمیٹی قائم کی۔ ۱۶/اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مولانا آزاد کے مزار پر مشہور ترقی پسند شاعر غلام ربانی تاباں کی قیادت میں بھوک ہڑتال کی اور ان تمام مصیبتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

ملک زادہ منظور احمد کی ادبی زندگی کی ابتدا گورکھپور سے ضرور ہوتی تھی لیکن اعظم گڑھ کے ادبی ماحول نے ان کے فن کو جلا بخشی اور یہیں ان کی شہرتوں کے پر لگے تھے، اور اردو دنیا میں ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے مقبول ہوئے۔ اعظم گڑھ سے ان کا قلبی لگاؤ تھا، یہیں سے پارلیمانی چناؤ میں کھڑے بھی ہوئے۔حقیقت بھی یہی ہے کہ ان کی شہرت کی کرن اعظم گڑھ سے پھوٹی، اور اردو دنیا میں متعارف بھی یہیں سے ہوئے۔یہیں سے پہلی بار یوپی سے باہر دربھنگہ کے مشاعرے میں بحیثیت شاعر، شبلی کالج کی ملازمت کے دوران گئے تھے۔اسی طرح ۱۹۶۲ء میں شنکر شاد دہلی کے انڈوپاک مشاعرے میں ان کو اعظم گڑھ سے ہی مدعو کیا گیا، پھر اس کے بعد انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، عزت اور شہرت کی بلندیاں طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔پہلے مشاعرے میں ناظم کا کردار بہت اہم نہیں ہوتا تھا لیکن ملک زادہ منظور نے مشاعرے میں منفرد اور اچھوتے انداز میں نظامت کے فرائض انجام دیئے، اس کے بعد سے نظامت ایک مستقل فن بن گیا۔اور ناظم مشاعرہ کو مشاعرے میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی۔مشاعرے میں ان کا منفرد لب ولہجہ، پرکشش انداز بیان، الفاظ کی گھن گرج اور بیان پر دسترس کے سبب سامعین پر ایک رعب طاری ہو جاتا اور وہ سب کو اپنا گرویدہ بنا لیتے۔نتیجہ میں اردو کی فضا ہموار ہوئی اور لوگوں کے دلوں میں اردو سے محبت کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا گیا۔ (رقص شرر)

ملک زادہ منظور ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے وہ ایک مقبول اور ہر دلعزیز استاد تھے۔بنیادی طور پر وہ ایک شاعر تھے اور ان کا ایک مختصر شعری مجموعہ ''شہر ستم'' ہے۔لیکن ان کی جو مقبولیت اور سرفرازی مشاعرے کی نظامت سے ملی وہ مثال مقبولیت ہے۔منظور احمد کی تمام نظموں اور غزلوں میں انسانیت کا درد اس طرح پیوست ہے کہ اسے الگ نہیں کیا جا سکتا۔عام طور پر نظموں اور غزلوں میں فرق ہوتا ہے، لیکن یہ فرق اظہار اور بیان دونوں سطحوں پر منظور احمد کے کلام میں نظر نہیں آتا، منظور احمد دلکش اظہار اور خوبصورت علامات کے شاعر ہیں۔اور جہاں حالات اور ان کی ستم رانیوں کا ذکر بہت خوبصورتی کے ساتھ کرتے ہیں۔منظور احمد مزاجاً ترقی پسند شاعر تھے۔انھوں نے ایک طویل زمانہ ایسے تاریخی اور سیاسی نشیب وفراز کا دیکھا تھا۔جس میں کئی قیامتیں ملک پر گزر گئیں۔جس سے ان کی شاعری اور فکر بہت متاثر ہوئی ان کی شاعری، بنیادی طور پر انسان دوستی اور مساوات سے لبریز ہے۔زندگی بھر اپنے رویئے میں وہی رہے جو شاعری میں نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری ان کی نظریات زندگی کا آئینہ ہے اس لیے غزل ہو یا نظم دونوں اصناف میں یہ احساس نمایاں طور پر موجود ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎ (رقص شرر)

عجب درد کا رشتہ ہے ساری دنیا میں
کہیں ہو جلتا مکان اپنا گھر لگے ہے مجھے

وہی قاتل، وہی منصف، عدالت اس کی، وہ شاہد
بہت سے فیصلوں میں، اب طرف داری بھی ہوتی ہے
کچھ غم جاناں، کچھ غم دوراں، دونوں میری ذلت کے نام
ایک غزل منسوب ہے اس سے، ایک غزل حالات کے نام

ملک زادہ منظور کے کلام میں انسانی ہمدردی، محبت کا جذبہ، اپنا پن، مظلوم کو انصاف نہ ملنا، باغی کی طرفداری وغیرہ نظر آتا ہے۔ان کی غزلیہ شاعری کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے سماجی صورتِ حال کا بغور مشاہدہ کیا اور سماج میں پیدا ہونے والے مسائل کو انھوں نے جس طرح محسوس کیا اسے بے کم وکاست شاعری میں ڈھال کر قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔انھوں نے ایسے دور میں آنکھیں کھولیں جس میں ہندوستان کی حیثیت ایک غلام ملک کی تھی اور ہندوستانیوں کے حالات سازگار نہیں تھے جس کا بھرپور احساس ان کی شاعری کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔لیکن انھوں نے کبھی خود کو حالات کے سپرد نہیں کیا بلکہ اس کا مقابلہ کیا، ان کی شاعری میں کلاسکیت کی گونج سنائی دیتی ہے انھوں نے شاعری میں کلاسکیت کے اوصاف کو باقی رکھا۔اور شاعری کو مختلف تلازموں کو نئے انداز میں پیش کیا۔

ملک زادہ منظور احمد کی معرکۃ الآراء نظموں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔غزلوں کی طرح ان کی نظموں میں بھی ان کی ادبی صلاحیتوں کا پرچم لہرایا ہے۔شعری مجموعہ شہر ستم میں عمدہ غزلوں کی طرح معیاری اور سحر انگیز نظمیں بھی ہیں۔اپنی نظموں میں انسانیت کی پوری تاریخ کو سمونے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی شاعری انسان دوستی کے ساتھ ساتھ ان کی انتہائی پرخلوص حب الوطنی کا بھی متاثر کن اظہار ہے۔ملک زادہ منظور

97

نے وطن عزیز کی آزادی کے بعد اپنے اسلاف کے جذبۂ حب الوطنی کی وراثت کو اپنی نظموں کے ذریعہ آگے بڑھانے اور آنے والی نسلوں کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے جڑنے میں صرف ایک معلم حقیقی کا فریضہ انجام نہیں دیا بلکہ ایک بہترین ناصح اور مخلص سرپرست کے طور پر تعمیری جذبہ پیدا کرنے کا ہنر بھی سکھایا ہے ملک زادہ کی ساری نظمیں دل میں اتر جاتی ہے۔ یہ خاص طورر پر وطن کے ذکر کے وقت اپنی تاثیر کی انتہاؤں پر ہوتی ہے۔ ملک زادہ منظور نے اپنی قومی ترانہ میں تہذیب اور انسانیت نوازی کی پوی تاریخ استعارے کی زبان میں بیان کیا ہے۔ اور اپنے عہد میں اردو کی گنگا جمنی تہذیب کو جس دولت سے مالا مال کیا تھا اس کا نعم البدل اردو کو مشکل سے میسر ہو سکے گا۔ ویسے بھی یہ انحطاط کا دور ہے اور اس کا اثر چاروں سمت ہمیں کھلے طور پر نظر بھی آتا ہے۔ منظور احمد کی نظمیں مختلف اور متنوع خصوصیات کی حامل ہیں نظموں کے موضوعات منفرد اور لازوال ہیں۔ پیرائے اظہار میں سادگی اور معصومیت ہے، ان کی نظموں میں بھی ارتقائی کیفیت ہے، ایک موضوع میں کئی موضوعات کو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ان کی نظموں میں غزلوں کے موضوعات خصوصیت کے حامل ہیں۔ نظموں کی تعداد کم ہے لیکن جو بھی ہے وہ قابل قدر اور قابلِ مطالعہ ہے۔ (رقص شرر)

ملک زادہ منظور احمد نے اردو کی بقا اور تحفظ کے لیے اردو کے مسئلے کو جس شد و مد کے ساتھ اٹھایا اور اس کے لیے جو جد و جہد کی تھی موجودہ دور میں ایسا کوئی نظر نہیں کرتا ہے جو حکومت کو اپنے کسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے چیلنج کرے، منظور احمد نے اپنے اسی موقف کو اخبارات، ٹیلی ویژن اور مشاعرے میں بھی اٹھایا اور سڑک سے جیل تک کا سفر کیا، لیکن ان کا ارادہ کبھی متزلزل نہیں ہوا، ان کی ہمت نے ان کو ہمیشہ سر بلند رکھا، اردو کا مسئلہ نامی ان کی کتاب وہ ایک خاص تناظر کی ترجمان ہے لیکن ان کی خودنوشت ''رقص شرر'' سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ اردو کے حقوق اور بقاء کے لیے انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا، آزادی سے پہلے انھوں نے ہندوستانیوں کو انگریزوں سے برسر پیکار ہوئے دیکھا تھا جہاں اپنے اور غیروں کے مابین تصادم تھا لیکن آزادی کے بعد خود انہیں اپنوں کی زیادتی کا شکار ہونا پڑا چاہے وہ ریلوے کی نوکری سے نکالے جانے کا واقعہ ہو یا پھر اردو زبان کا مسئلہ ہو۔ لیکن انھوں نے اردو کے حق کے لیے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کیا، ان کی اس جدو جہد نے انہیں کہیں زیادہ بلندی عطا کی، اسی لیے ملک زادہ منظور احمد کے اسی تعلق سے جب بھی گفتگو ہوگی تو انہیں ایک مجاہد اردو کے طور پر یاد کیا جائے گا۔

(رقص شرر)

شہر سخن ملک زادہ منظور کا تذکرہ اور تاثراتی تنقید کا عمدہ نمونہ ہے، اسی کتاب میں دراصل اس زمانے کے مقبول عام شعراء کا تعارف اور تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ شخصیت اور شعری کمالات کو الفاظ کے قالب میں ڈھالا ہے، اس کتاب میں شعراء کے معائب سے زیادہ ان کے محاسن کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ شہر سخن کو انشائیہ نگاری کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی تھی اس کتاب کے لیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ صرف مضامین کے مجموعہ کے ساتھ ساتھ کئی اصناف سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ منظور احمد نے ابوالکلام آزاد کے الہلال کو بنیاد بنا کر جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ تحقیقی اعتبار سے پورے طور پر معقول اور مناسب ہیں، منظور احمد نے آزاد کی صحافت اور عمومی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ اہمیت کے حامل ہیں۔ منظور احمد نے آزاد کے بعد نظیر اکبر آبادی کے کلام کا بھی مطالعہ کیا اور نظیر کی شاعری کا عنصر اپنے مقدمے میں پیش کیا، نظیر کا مکمل تعارف ان کی غزلوں کے بغیر ادھورا ہے، نظیر کی غزلوں کا اہم پہلو روایتی تصور حسن و عشق ہے۔ یہی چیز دامن دل کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔

(رقص شرر)

نظیر نے اپنی غزلوں میں اردو شاعری کے مروجہ تصور حسن سے انحراف کیا ہے اور موضوع گفتگو کسی شریف عورت کو نہیں بنایا بلکہ ایسی طوائف کو بنایا جس کا وجود لذتیت کے ساتھ ساتھ شہوانی جذبات کی آسودگی فراہم کرتا ہے، نظیر احمد کے فن پر بہت کچھ لکھا گیا، اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا، منظور احمد نے اس کے انتخاب کو اسی سلسلے کا حصہ سمجھنا چاہئے۔ غزلیات نظیر کا منظور احمد نے جائزہ بھی لیا ہے۔ وہ زبان و بیان اور نظریات کے اعتبار سے بلا شبہ اہم ہے۔ منظور احمد نے نظیر کے مقدمے کو شہر ادب نامی کتاب میں شامل کیا ہے۔ اس مقدمے میں منظور احمد نے نظیر کی غزلیہ شاعری کا بھر پور تعارف پیش کیا ہے، اسی بنا پر منظور احمد کا شمار نظیر شناسوں میں ہوتا ہے جو یقینا حق بجا ہے۔ منظور احمد نے صحافت کے میدان میں بھی اپنے تابندہ نقوش چھوڑے ہیں ان کی صحافت کا سلسلہ فیض گورکھپور سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد لکھنؤ کے ''امکان'' نامی رسالہ جاری کیا جو ان کی حیات تک برابر نکلتا رہا۔ اس رسالے کے ذریعہ انھوں نے ادب میں نئے امکانات کی جستجو کا آغاز کیا اور اپنے اس مقصد میں کامیاب و کامران ہوئے، انھوں نے جو اداریئے لکھے وہ سیاست اور ادب دونوں کے مثال و مباحث پر محیط ہے، منظور احمد کی صحافت دراصل اس سماج کا آئینہ ہے جس میں ہم اپنے شب و روز بسر کرتے ہیں۔ (رقص شرر)

ملک زادہ منظور کی شخصی جہات میں ایک روشن جہت تحریک آزادی میں ان کی حصہ داری بھی ہے۔ منظور احمد تقسیم ملک کے شدید مخالف تھے۔ تحریک آزادی کے حوالے سے منظور احمد ابوالکلام آزاد سے متاثر تھے اسی طرح ان کی ذہنی تربیت میں مولانا حسین احمد مدنی کا بھی دخل تھا۔ منظور احمد نے اپنے معاصرین پر بھی گفتگو کی ہے اپنی کتاب شہر سخن میں اس زمانے کے مقبول عام شعراء کا تعارف، خاکے اور ان کی شاعری پر تبصرہ شامل ہے۔ جن شعراء کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی روزمرہ کی زندگی کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ قارئین کے سامنے چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔

ملک زادہ منظور احمد کا اسلوب اپنی مثال آپ ہے، اپنی بات نثر یا نظم کے پیرائے میں اس طرح پروتے ہیں کہ پڑھنے والا ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ یہی ان کی سب سے بڑی کامیابی ہے اور انھوں نے پہلی مرتبہ اپنے ہم عصر غیر معروف شعراء کو بھی شہر سخن میں جگہ دی ہے۔ اور ان کی شاعرانہ عظمت کو متعارف کرا کے اردو ادب کے دامن میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ جب بھی ملک زادہ منظور احمد پر تبصرہ کیا جائے گا تو انہیں ایک مجاہد اردو کے طور پر یاد کیا جائے گا۔

(رقص شرر)

ISSN 2321-1601

RNI UPURD/2016/67444

INTERNATIONAL PEER REVIEWED (REFEREED) JOURNAL

SABAQ E URDU (Monthly)

Infront of Police Chowki,G.T.Road,Gopiganj-221303,Dist.Bhadohi,UP,INDIA

INTERNATIONAL PEER REVIEWED (REFEREED) JOURNAL BOARD

INDIA

1.PROFESSOR Md. Ehsan
Head, Department of Urdu,B. N. Mandal University,North Campus,Madhepura (Bihar)
Mob.- 83407 94295
hod@urdu.bnmu.ac.in
2.PROFESSOR JAHANGIR IQBAL
DEPT. OF PERSIAN,UNIVERSITY OF KASHMIR,SRINAGAR-190006
E.Mail:Jahangiriqbal@uok.edu.in
M.:70062 67565
3.PROFESSOR. Syed Sanaulla
Chairman,Dept. of PG Studies and Research in Urdu
Kuvempu UniversitySahyadri College Campus,Shivamogga-577 203 Karnataka
Mobile: 94482 38327
Email: sana.smga@gmail.com
4. DR QAISER AHMAD
MAULANA AZAD NATION UNIVERSITY,HYEDRABAD(TELENGANA)
qaiserahmad@manuu.edu.in
5.Dr Abdul Haque
Associate Professor/ Head Dept.of Urdu Govt.Degree College Thannamandi J&K(UT)
Email: abdulhaqnaimi786@gmail.com[
Mob:7051075603
6.Dr.Shaivya Tripathi
Associate Professor
Dept.of Urdu Bareilly College, Bareilly
M.:96902 66266
7.Dr.Nilofer Firdaus
Dept.Of Urdu,Aliah University, Kolkata700014
nilofer@aliah.ac.in
M.: 97947 22271
8.Dr Tasneem Fatma
(Assistant Professor Urdu & Critic)Patna
tasneem.fatma1380@gmail.com
M.:8409430281

FOREIGN

1.Prof. Nasir Abbas Naiyer
Institute of Urdu Language and Literature,
University of the Punjab, Lahore
Email: nanayyar@gmail.com
2.Prof. Muhammad Kamran
Professor Institute of Urdu and Director Urdu Development Center,
University of the Punjab, Lahore, Pakistan
Email: drmkamran@gmail.com
3.Prof. Halil Toker
Head Dept. Of Urdu Istanbul University, Istanbul,Turkey
Email: khtoker1@gmail.com
4.Professor Mohammad Golam Rabbani
Department of Urdu, University of Dhaka.
Former Chairman, Department of Urdu, University of Dhaka (2011-2014)
Editor, Dhaka University Journal of Urdu, Dhaka Universi
5.Prof Dr. Gala Elsaid Mostafa Elhefnawi
Dept. of Urdu, Faculty of Arts,
Cairo University, Egypt
Email: ghefnawi@yahoo.com
6..DR.ALI BYAT,DEPT.OF URDU UNIVERSITY OF TEHRAN,bayatali@ut.ac.ir
7. Mukhayu Abdur Rahmanova
Tashkent State University of Oriental studies
Tashkent, Uzbekistan
Email: muhayabdurahman @yahoo.com
8.Nasir Nakagawa
Editor (Urdu Net Japan)
Akayama CH0 4-6-12
Koshighya City-343-0807, Japan
Email: nasir.nakagawa@gmail.com

EDITORIAL BOARD (INDIA)

9.PROFESSOR Md. Ehsan
Dept.of UrduB. N. Mandal UniversityNorth Campus,
P. O.-Singheshwar-852128 Madhepura (Bihar)
M.: 83407 94295
10.PROFESSOR Syed Sanaulla,
Dept. of PG Studies and Research in Urdu
Kuvempu UniversitySahyadri College Campus,
Shivamogga-577 203,Karnataka
M.: 94482 38327
11.Dr. Shaivya Tripathi
Associate Professor
Dept.of Urdu Bareilly College, Bareilly
M.:96902 66266
12.Dr.Md.Ruknuddin
Assistant Professor
Satyawati College,University of Delhi,DELHI
M.: 9891765225
Email: ruknuddin@ www.worldurdurnp.com
13.Sana Fatima
Managing Editor "Tarjeehat"
New Delhi 110025, India
Email:managingeditor@worldurdurnp.com
14.NILOFAR HAFEEZ
DEPT. OF PERSIAN, UNIVERSITY OF ALLAHABAD,PRAYAGRAJ
neelofarhafeez@allduniv.ac.in
M.:75009 84444
15.Dr.Nilofer Firdaus
Dept.Of Urdu,Aliah University, Kolkata700014
nilofer@aliah.ac.in
M.: 97947 22271
16.DR WASI AHMAD AZAM ANSARI
KHWAJA MOINUDDIN CHISHTI LANGUAGE UNIVERSITY,LUCKNOW
wasiazam@kmclu.ac.in
M.:9621272244
17.Dr. Abdul Hai
Dept. of Urdu& Persian,
C. M. College Darbhanga, Bihar 846004
E.Mail: ahaijnu@gmail.com
18.Dr Tasneem Fatma
(Assistant Professor Urdu & Critic),Patna
tasneem.fatma 1380 @gmail.com
M.:8409430281
19.Dr. Ramisha Qamer
Dept. of Urdu, Gulbarga University, Karnataka
E.mail: ramishaqamar@www.worldurdurnp.com

EDITORIAL BOARD (FOREIGN)

8.Dr. Farzaneh Azam Lotfi
Dept. Of Urdu
University of Tehran, Iran
Email: f.azamlotfi@ut.ac.ir
9.Nasir Nakagawa
Editor (Urdu Net Japan)
Akayama CH0 4-6-12
Koshighya City-343-0807, Japan
Email: nasir.nakagawa@gmail.com

Dr. Shagufta Firdous
Director Student Affairs & Assistant Professor
Department of Urdu, G.C Women University, Sialkot
Email: shaguftafirdous2 @gmail.com

10.Rubina Faisal
3615, Rainpark Court,
Mississauga, ON L5M 6X6, Canada
Email: rubinafaisal@ rogers.com
11.Sameera Aziz
Jeddah, Saudi Arabia
Email: sameera.aziz.media@ gmail.com
12.Professor Mohammad Golam Rabbani
Department of Urdu, University of Dhaka.
Former Chairman, Department of Urdu, University of Dhaka (2011-2014)
Editor, Dhaka University Journal of Urdu, Dhaka Universi

EDITOR: DR. MOHD SALEEM
CHIEF EDITOR : DANISH ALLAHABADI

PTO

ISSN 2321-1601

RNI UPURD/2016/67444

INTERNATIONAL PEER REVIEWED (REFEREED) JOURNAL

SABAQ E URDU (Monthly)

Infront of Police Chowki,G.T.Road,Gopiganj-221303,Dist.Bhadohi,UP,INDIA

EDITORIAL BOARD

PROFESSOR KHWAJA MD. EKRAMUDDIN

(patron)

INDIA

1.PROFESSOR NAJMA RAHMANI,
DEPT. OF URDU,DELHI UNIVERSITY,DELHI
E.Mail: nrehmani@urdu.du.ac.in
M.:99534 79211
2.PROFESSOR SHABNAM HAMEED
UNIVERSITY OF ALLAHABAD,PRAYAGRAJ
M.:9839055704
3.PROFESSOR SHAHZAD ANJUM
DEPT.OF URDU,JAMIA MILLIA ISLAMIA,NEW DELHI
M.:88008 63994
4.PROFESSOR EHSANUL HAQ (KAUSAR MAZHARI)
DEPT.OF URDU,JAMIA MILLIA ISLAMIA,NEW DELHI
E.Mail:mhaq@jmi.ac.in
M.:98187 18524
5.PROFESSOR ZEBA MAHMOOD
DEPT.OF URDU,G.S.P.G.COLLEGE,SULTANPUR(UP)
M.:98392 22385
6.PROFESSOR SHAHAB ZAFAR AZMI
PATNA UNIVERSITY,PATNA
E.Mail:hodurd@patnauniversity.ac.in
M.:88639 68168
7.PROFESSOR JAHANGIR IQBAL
DEPT. OF PERSIAN,UNIVERSITY OF KASHMIR,SRINAGAR-190006
E.Mail:Jahangiriqbal@uok.edu.in
M.:70062 67565

FOREIGN

1.Prof. Halil Toker
Head Dept. Of Urdu Istanbul University,
Istanbul,Turkey
Email: khtoker1@gmail.com
2.Prof. Muhammad Kamran
Professor Institute of Urdu and Director Urdu Development Center,
University of the Punjab, Lahore, Pakistan
Email: drmkamran@gmail.com
3.Prof. Nasir Abbas Naiyer
Institute of Urdu Language and Literature,
University of the Punjab, Lahore
Email: nanayyar@gmail.com
4.Prof Dr. Gala Elsaid Mostafa Elhefnawi
Dept. of Urdu, Faculty of Arts,
Cairo University, Egypt
Email: ghefnawi@yahoo.com
5.DR.ALI BYAT,DEPT.OF URDU UNIVERSITY OF TEHRAN,bayatali@ut.ac.ir
6. Mukhayu Abdur Rahmanova
Tashkent State University of Oriental studies
Tashkent, Uzbekistan
Email: muhayabdurahman @yahoo.com
7.Dr.Arif Mahmud Kisana
Berberisvagen 10, 19734 BRO
Sweden
Email: arifkisana@gmail.com

PTO

This document was created with the Win2PDF “Print to PDF” printer available at

https://www.win2pdf.com

This version of Win2PDF 10 is for evaluation and non-commercial use only.
Visit https://www.win2pdf.com/trial/ for a 30 day trial license.

This page will not be added after purchasing Win2PDF.

https://www.win2pdf.com/purchase/